۱۴

شفیق الرحمٰن

میری لائبریری

مزید حماقتیں

'حماقتیں' کے
مصنف کی چند مزید
حماقتیں

نیا ایڈیشن

قیمت ۱۶/۰۰

مزید حماقتیں

میری لائبریری

(۱۴)

میری لائبریری میں دوسری دلخوش کُن کتابیں،

حماقتیں	شفیق الرحمٰن
مزید حماقتیں	″
لہریں	″
پرواز	″
دغاباز	مترجم کمال احمد رضوی
لفنگے کی ڈائری	″
شیشہ و تیشہ	کنہیا لال کپور
سنگ و خشت	″
چنگ و رباب	″
نوکِ نشتر	″
بال و پر	″
نرم گرم	″
گردِ کارواں	″
دلیلِ سحر	″
تل پھل	″
ٹاہلی دے تھلّے (پنجابی)	اشفاق احمد

مرزا ادیب کے بہترین افسانے	مرتب عرش صدیقی
خیالستان، معہ مقدمہ	سجاد حیدر یلدرم
اندیشۂ شہر	احمد جمال پاشا
راجہ صاحب	شوکت تھانوی
گرما گرم (لطیفے)	اشفاق احمد
محفلِ معمہ گوئی (مصوّر)	منظور الحق صدیقی
رنگا رنگ (لطیفے)	مرتبہ: شہناز ہمایوں
پڑھو اور ہنسو	میاں محمد ابو الغنیم
اردو کا بہترین انشائی ادب،	مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی
اہلِ قلم کی شوخیاں،	مرتب: عطش دُرّانی
مشاہیر کے لطیفے اور چٹکلے۔	″
سگ بیتی،	مرتب: ارشد میر
کاغذی شیر (ڈرامے)	علی احمد
ندیم کے بہترین افسانے،	مرتب: مظفر علی سید
زادِ راہ معہ مقدمہ	پریم چند
زمزمۂ محبت	ابوالکلام آزاد

مزید حماقتیں

شفیق الرحمٰن

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

ناشر: بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری، لاہور نمبر ۲
طابع: آل بشیر پرنٹرز، لاہور نمبر ۲

فہرست

دیباچہ ، ۷

تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند ، ۹

یہ ریڈبور روم تھا ، ۵۸

کلیدِ کامیابی حصّہ دوئم ، ۶۶

شیطان ، عینک اور موسم بہار ، ۸۵

ملکی پرندے اور دوسرے جانور ، ۱۲۱

سفرنامہ جہاز بادسندھی کا ، ۱۳۶

دو نظمیں ، ۱۸۲

ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد ، ۱۸۷

زنانہ اردو خط و کتابت ، ۲۳۲

برساتی ، ۲۵۳



دیباچہ

یہ دستور ہے کہ کتاب خواہ کہیں لکھی گئی ہو، مصنّف اگر ایک مرتبہ بھی ولایت گیا ہے، تو دیباچہ ضرور لندن کا لکھا ہوا ہوگا۔ ان دنوں مَیں لندن میں ہوں، اس لیے مجبور ہوں کہ اس روایت کو قائم رکھوں۔

ویسے میں کوئی خاص بات نہیں کہنا چاہتا۔ سوائے اسکے کہ یہ دیباچہ ہے جسے میں نے لندن میں لکھا ہے :۔

اگست ۱۹۵۲ء

شفیق الرحمٰن

۱۶۔ ہال روڈ، سینٹ جانز وُڈ
لندن، این، ڈبلیو۔۸

ہدیۂ تبریک

بنام: بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور

منجانب: دانش کدہ پنجاب

"آپ نے میری لائبریری' کے قیام و استحکام سے اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اچھی کتابیں ارزاں قیمت پر مہیا کر کے یہ خدمت بدستور بجا لاتے رہیں گے۔"

حمید احمد خاں (دستخط)
وائس چانسلر، دانش کدہ پنجاب

منجانب: دانش کدہ پشاور

"عوام اور خصوصاً طلباً کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم قیمت لیکن قابلِ قدر کتابوں کی اشاعت کو ہر دلعزیز اور مقبول بنانے کے لئے جس مستعدی جذبے اور ذوق و شوق کا مظاہرہ آپ کر رہے ہیں اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں۔

"آپ جس راستے پر گامزن ہیں ظاہر ہے کہ بہت سی دشواریاں آپ کے پیش راہ ہوں گی مگر میرا مشورہ ہے کہ آپ دیانتداری اور استقلال سے اپنی راہ پر گامزن رہیں۔ یقیناً بہت جلد یہ مشکلات اور ناہمواریاں آپ کے عزم و استقلال سے مغلوب ہو کے رہ جائیں گی۔

"آپ اردو زبان کے فروغ کے لئے بڑے اخلاص سے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا رہے ہیں۔ اپنی کوششوں کو جاری رکھیں خدا کرے اپنی جہد و کاوش میں آپ عظیم کامرانیوں سے ہمکنار ہوں۔"

محمد علی (دستخط)
وائس چانسلر، دانشکدہ پشاور

تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند

رقم زدہ:۔ اعلیٰ حضرت جناب نادر شاہ شہنشاہ، سابق ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر سابق مرحوم و مغفور وغیرہ وغیرہ۔

پیش لفظ۔ عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا، تو متعدد اشیا کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے، جنھیں ہم نے "وقتاً فوقتاً" لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحتِ ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے، کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مورخین کی لگام بندی فرما چکے تھے۔ تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رُخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیں۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی جاتی ہے، تبھی تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے، دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی، حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منّت سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوادیں اور قتلِ عام؟ قتلِ عام کسی مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہاوتیں گھڑلی ہیں۔ مثلاً شامتِ اعمالِ ما باصورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں، تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رُخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا، تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

والیِ کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والیِ کابل کی گوشمالی کریں، وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اُگل رہا تھا جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پراپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پاکر حملہ آور ہوتے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا، ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانبردار خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے ہیں۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے پر آنے کی کوشش کی، ہم پوستین کو چھوڑتے تھے، لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی۔ بمشکل ہمیں باہر نکالا گیا۔ بڑے پشیمان ہوتے، تہیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں۔ پانی میں کبھی قدم نہ

رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند اُلّو دکھائی دیے۔ یہاں کا اُلّو ایرانی اُلّو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ اُلّوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو لیا۔ شام کو ہماری قیامگاہ کے پاس بسیرا کر لیا اور رات بھر ہاؤ ہو مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا گستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بیحد خفا ہوتے اور فرمانبردار خاں کو پاپوشِ مبارک سے زدوکوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جانثار معروض ہوا کہ فال نیک ہے۔ اُلّو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم اس جواب پر خوش ہوتے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو اُلّو شناس کے لقب سے نوازا اور اس کے ہم جنسوں میں اسکی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحتِ ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی۔ جس نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ نادر شاہی حکم، نادری قہر، نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ والیٔ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع کر دیا۔

شہباز خاں اُلّو شناس ہر روز ملک ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں تجار بھنگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی تو لی، اُلّو شناس بھی چست ہو گیا۔

اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلادی، جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا، نہ کبھی اُنہیں دیکھا تھا، نہ شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں، خیر چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی۔ سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں:

براہِ افغانستان: خیبر ایجنسی۔ پشاور۔ لاہور۔ پانی پت۔

براہِ بلوچستان: سرسہ۔ بھٹنڈہ۔ دلی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کوچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمائدینِ شہر فصیل تک بلکہ درۂ خیبر تک چھوڑنے آتے۔ جانے نہ دیتے تھے والیٔ کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحتِ ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا، لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے۔ یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر ہم اہلِ ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرینِ مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحتِ ہند سے واپس لوٹ آئیں۔ تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہو گا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہِ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے درۂ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔

سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درّے میں پرند، چرند، درندانسان، بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتی۔ خداوند باری تعالےٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجدار نے پشاور سے کچھ درّے آکر سعادت آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا، کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی، اس نے دو سو مُہر طلائی نذر اور ایک مرصّع گھوڑا بطورِ پیش کش گزرانا۔ ہم نے بھی ازراہِ مروّت ایک جُبہ عنایت کرکے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندگانِ درگاہ تو بھاگ گئے۔ ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے، نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے، کچھ دیر بعد ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا۔ کچھ اور چیز تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سید بایزید ابن یدیزدانی آستان بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں۔ جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہِ تلطّف اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بھینچا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے۔ لخلخہ سنگھایا گیا، مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا۔ لے کر رفو چکر ہوا۔ ہم نے اہل کاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا، تو نذریں تو

بھجوادے، مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوجدار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا۔ جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پُرشوکت فیل جسم جانور ہے۔ دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ناک جس کو سُونڈ کہا جاتا ہے۔ زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی۔ ڈرائیور علیحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

لطیفہ سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدّی کی پیش کش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مُرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصّہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں، پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پُرزوں پر لکھ دیتا ہے۔ جنہیں تعویذ کہتے ہیں۔ ان تعویذوں سے بوڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اُولاد کے سر پرستوں کا انتقال ہو سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سُن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پَر کی اُڑائی ہے۔

لیکن جب آدم شناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا، تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گزشتہ زندگی پر بڑا افسوس ناحق ہوا کہ

ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہند آکر ہیرو بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہرا موقع ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا۔ لیکن اُلو شناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے ہی رہتے ہیں، چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی، تو ضرور بضرور ہیرو بن جائیں گے۔ اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

اختر شماری کل رات اختر شماری کی۔ دو سو پچاسی تارے گنے ہوں گے کہ نیند آگئی باقی بشرطِ زندگی کل گنیں گے۔

شترِ غمزے مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شترِ غمزے ملاحظہ فرمائے، محظوظ ہوئے۔ کیونکہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی، اور اس ملک میں عام ہے۔

ایک مفید رسم جہلم کے قریب ایک قلعدار نے ہم پر دھاوا بول دیا اور پھرتی سے قلعے میں محصور ہو گیا، ارادہ ہوا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں، لیکن اُلو شناس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے۔ یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دِلّی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آکر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصدِ لڑائی بظاہر ہرگز نہ تھا۔ اُلو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ تنگ آکر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ یونہی رفع دفع ہو جائے۔

اُتوشناس چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو اُس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ اُتوشناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مہریں دیں، ابھی گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھُل گئے، ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے، تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، لیکن مقصد ایک ہے۔ اسے یہاں رشوت کہتے ہیں۔ کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار یا پانچ سو سے سنور جائیں، تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دیتے دلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ ہم واپس ایران جا کر اس رسم کو ضرور رائج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں۔ باقی کوتوال کو دیں۔ جس نے اپنا حصّہ رکھ کر بقیہ رقم قلعدار کے حوالے کی۔ قلعہ دار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیے۔ واقعی یہ ملک عجوبۂ روزگار ہے!

گوجرانوالے میں قیام

شیخ بُوٹا شجر لوہری ایک ایرانی النسل درویش ہیں، جو بڑے فاضل ریاضت کار، مبارک نفس، متوکل اور گوشہ نشین ہیں۔ گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدّنیا بنا جائے۔ پھر شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا، آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں، پنجاب سے وادیٔ کانگڑا کی طرف ہجرت کر رہے ہیں، کیونکہ وہ علاقہ رنگین ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں، جنہیں سینہ بسینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی،

گویا تجدیدِ عہدِ شباب تھی۔

ہمارا سنجیدہ ہو جانا

گلستانِ بیکانیر سے ایلچی درِ دولت پر حاضر ہوا۔ ملتجی ہوا کہ چلئے مشتاقانِ دید راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے۔ ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں۔ مگر آتو شناس کو حسبِ معمول شبہ ہوا کہ یہ کوئی چال ہے۔ بیکانیر لق و دق صحرا ہے۔ جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اُتر آیا اور ہر چیز سُرخ نظر آنے لگی۔ فوراً ایلچی کو بلوا کر الٹا لٹکوایا۔ جب پتا لگا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا کیا۔ اس حادثے نے ہمارا موڈ خراب کر دیا۔ سوچا کہ اہلِ ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ فرا بنروار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے۔ اس نے یہ فہرست پیش کی۔

۱۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب "رہنمائے حملہ آورانِ ہند" لکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہندی گوّیے ترانوں کو "نادر نا در جیم سنا نا دیم" سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔

۳۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔

۴۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔

۵۔ یوں بھی ان دنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصّہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔

قصد ہوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

شاہدرے میں آمد آمد

شاہدرے کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی۔ نام بھی عبداللطیف گویا مردانہ تھا۔ ہم نے ہیئت کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا۔ بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ گوریلا گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا۔ صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کئی کترا کر گزر جاتی، گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروز پور۔ غلطی کا احساس ہوا، تو لوٹے۔ آلو شناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست دینے کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بسمہ وقت وصول کیا۔ شام کو آلو شناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری تھے۔ کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں

گرنے لگیں، لوگ پنج صدی۔ پونے دو صدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے۔ لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر دادِ عیش دکا مرانی دیتے۔ مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درۂ خیبر سے آتے ہیں۔ انہیں سیدھے دلّی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب۔ راوی عبور کر چکے تھے۔ ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے۔ سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ اہلِ ہند کا دستور ہے۔ حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، ترواڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر اہلِ ہند اس علاقے میں نہ لڑیں۔ تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ یک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو خط اور لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ ایں ایلچی بے معنی غرقِ مے آب اولیٰ۔ کسی طبلچی نے حافظؔ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا۔ تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی باذاق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلّی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا۔ اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا یا شہنشاہ سنا ہے کہ آپ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں، جہاں تک آب و ہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے۔ اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ ہمیں رضا مند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ اُتو شناس نے شبہ کرا دیا کہ اہلِ ہند ہم پر اپنا محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں تحفۃً پیش کی کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلّی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجب ڈھل مل یقین لوگ ہیں۔ اُتو شناس نے اصل وجہ بتائی۔ جب درباری مذکور دلّی دربار میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوا۔ تو کسی نے پوچھا تک نہیں، بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو، ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو۔

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں، تو دلّی دیکھ کر جائیں گے۔ کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی کا رتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقیماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

قطب صاحب کی لاٹھ

نزولِ اقبال دِلّی کے باہر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے۔ لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خان نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بعد وقت اوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ سستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

حملہ آوری اور برادرم محمّد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمّد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا۔ مگر ابھی تک سعادتِ زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا۔ دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ محمّد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے۔ ہم نے پوچھا۔ "کیسا حملہ کیسا؟" ایلچی نے عرض کیا "خداوندِ نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں، اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہوا، تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہو سکا اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ حملہ آور شمال سے آنے والے ـــ" "بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے۔" ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا، وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ہم شہر کے دروازے میں داخل ہوئے، تو عزیزی محمّد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا، گھوڑے سے اتر کر بغلگیر ہوئے، اس کے بعد دو دن تک محمّد شاہ

کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دِلی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگانِ درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ سیوہ سیا حال ہے۔ حمام گئے، الحمدللہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغلِ خورد و نوش و خوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیضیاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہو گا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا۔ اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمّدشاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھاتی تھی۔ اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہو گا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا۔ جو مہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمّد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباس شب خوابی، سلیپر بھیجے، چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستین سمیت بستر جیبوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے توسیدھا سادھا سا قلعہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پاکر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومت ہند نے امتناعِ شراب کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

تختِ طاؤس

یک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو از حد انس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے۔ تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ آپ اسے بخوشی لے جا سکتے ہیں۔"

ایسے خلوص و محبت سے کس کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوتے۔ تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے ہم انکار کر کے اس کا دل نہیں دُکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ دِلّی کو اپنی ذاتِ بے مثال سے محروم کرنے کی آخری تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے، تاکہ اہلِ دلّی کو بتا دیا جائے۔ وہ اس دن کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں۔"

"کیوں گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں۔ کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟" ہم نے غیض و غضب میں فرمایا۔

"جی نہیں۔ آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں" وہ بولا۔

"ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں، جن کے متعلق کوئی استاد ذوق شعر کہیں گے۔" ہم نے فرمایا۔

"یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہریے، بلکہ ایران کا دارالخلافہ دِلّی کو بنوا لیجیے۔ عزیزی بڑی محبت سے ملتمس ہوا۔

"دیکھا جائے گا۔" ہم نے بڑی محبت سے فرمایا۔

وہ گلقند والا قصّہ

بات کچھ بھی نہ تھی مغلئی دستر خواں کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے بمشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ فرمانبردار خان نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

ہنوز دلّی دُور است

اس فقرے کو ہم نے اہلِ دلّی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے، تو سنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دلّی دُور تھی، جب لاہور پہنچے تب بھی دُور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلّی دُور است۔ اچھا بھئی چلو دلّی دور است بس!

محمّد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلّے سے رہتی ہیں کہ کانوں میں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں، یہاں تک کہ اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ ایک زبان بھی نہیں سکتیں۔ (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) ہماری بیگمات بے حد ذہین ہیں، ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پاجامہ ایجاد کیا۔ دوسری نے شلوار

کوساری میں ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا۔

تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے، لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہِ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے۔ رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے۔ لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا۔ اب ملک کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے۔ اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاست ہائے متحدہ بنانے کا ۰۰۰ ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوش گوار ہیں۔ جب مرہٹے بیکار ہوتے ہیں۔ تو سیدھے دلّی آدھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے، تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر ہمیں کیا عزیزی جانے اور اُس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی، لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر، میدانِ جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے۔ ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر

سپاہی کی وردی مختلف ہے، کرنال میں ہم سے لڑنے آئے۔ تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے ــــ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور ہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے۔ جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیاء بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے، تو دو دن سمندِ شوق کو لگام دیجئے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردوں کے مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے۔ بولا اس میں سوائے بادشاہِ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہِ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقل مند تھا، مان گیا۔ ہمارا فرزند علی قلی خان بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے۔ دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا۔ ہمیں گھیر لیا گیا، ہمارے دستخط لیے گئے، ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا، ہم سے

طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آسائش ایران سے جانے کے لیے خریدیں، پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رُو نظر پڑیں کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی قلی! قلی!! کیا دیکھتے ہیں کہ پسرِ ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

"تم قلی ہو۔؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل۔" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے، مگر اس کی حسِ مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم ہیں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی: "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کوئی خاص کام نہیں۔" علی قلی نے جواب دیا۔

"مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے۔" وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

"میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرا لوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ! میرے ابا مجھے گھور رہے تھے۔" علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کمرے میں گئے، تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے، بازپرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون ادا

کرے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا، چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

"نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کرائے گا۔" ہم نے گرج کر کہا۔ "کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر۔"

ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں۔" اس نے ایسے عدم تشدد انہ انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سنی تھیں، چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا۔ حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمابردار خان کو دقت پیش آتی تھی)

عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے انگریزی کلچر سنا ہو گا، وہ البتہ مشہور ہے۔ ہم مُصر ہوتے تو کہنے لگا آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجیے۔ ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرۂ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہو گا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو ایک مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا۔ بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا۔ چلو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکام شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اُلّو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔

محمد شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے۔ البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جارہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس کے کمرے میں گئے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا: "آبا جان معاف فرمائیے۔ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے۔"

ہمیں سخت غصہ آیا یہ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی۔ یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جارہا ہے۔

"ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ جب سے دلی آیا ہے۔ ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے۔ کیا ہے تیرے منہ میں؟"

"پان کھا رہا ہوں۔ کسی نے دیا تھا۔" وہ بولا۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہی حرس والی لڑکی تو نہیں۔؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے۔" ہم نے فرمایا۔

"ابا جان اس کی تھوڑی پر جو خوشنما تل ہے۔ وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آجکل کے نوجوان خوشنما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں۔"

"ابا جان محبت بڑی چیز ہے۔" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"تو سپاہی ہے۔ تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبّت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں گھوڑے جب پیار کریں، تو ساریوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے"

ابا جان بات دراصل یہ ہے کہ مجھے" اس سے

"خبر نہ تھی کہ گستاخی کرتا ہے جانتا نہیں کہ وہ نادر شاہ ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر کی اولادِ ناخلف ہے"۔

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا، شمشیر شاہ"۔

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے سمجھا؟

"سمجھ گیا۔ ابا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے۔ سرکس کے لیے"!

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے۔

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

مصاحب حضوری حقہ بردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے حسبِ توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہلِ ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کیا کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت پر اہلِ ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی۔

۱۔ درۂ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے، وہاں سے دلّی تک دس دس میل

کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں۔ تاکہ حملہ آوروں کو کسی دقّت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس قطعے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے۔ غار ہائے الورا، الورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلّی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے۔ تاکہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے۔ تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں۔ اور تاریخِ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں۔ بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں۔ مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

محبّت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت

کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جاتے، تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں۔ لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے، وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتاتے، حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے۔ تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں، کیا یاد کرے گا۔ لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوتے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایان ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔ اس روز نہ جانے کیونکر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والدِ بزرگوار شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی "شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں، ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے، بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں۔" علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تمہارے کنبے کے متعلق امی پوچھ رہی تھیں، تم مغل ہو؟"

"مغل وغیرہ کا پتہ نہیں، ویسے ہم ابنِ شمشیر ابنِ شمشیر ہوتے ہیں۔" علی قلی بولا۔

بہرحال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں

گے۔"

"چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں۔" علی قلی نے بھولپن سے کہا۔

"رہ گیا چلن، شادی کے بعد ایران چلو گی، تو وہاں دیکھ لینا۔"

"ایران جانا تو ذرا مشکل ہے، کیونکہ امی جان مجھے بیحد چاہتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آجایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ اباجان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں۔"

"تجویز تو یہ بھی اچھی ہے۔" وہ ناخلف بولا۔ "لیکن اگر میں ایران چلا گیا، تو تم اُداس رہا کرو گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔"

علی قلی بگڑنے لگا۔ "تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے گئی تھیں۔؟"

"وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں، ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے، تمہارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے، شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم بقیہ گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے، بیچارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ نرا زن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خان فیلسوف سے ذکر کیا۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہی، یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں۔ سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے، علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے۔ اور شام کو اس کے سانس

میں سے رنگیں کی بُو ہوتی ہے۔ جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوتی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروب آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہے، خصوصاً چند گھونٹ بادہ رنگیں چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویشِ کامل شیخ بوٹا شجر پوری کا نسخہ نکالا جو اُنہوں نے محبت اُتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پہ آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اُسے دکھائی گئی۔ سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصل شکل بغیر میک اَپ کے دیکھی، تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ دِلّی کا رُخ ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں، ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ بوٹا شجر پوری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے دو بادشاہ گر سیّد برادران (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پہ "اصلی شہنشاہی بادشاہ گرانِ مملکتِ ہند" لکھا تھا۔ اوقاتِ ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انہیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انہیں بلا کا چست و چالاک و چار سو بیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ محمد شاہ سے کہا

کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں۔ وہ ملتمس ہُوا کہ ان کے ہی دم سے تو دلّی میں رونق ہے۔ للہ انہیں چھوڑ جائیے۔ گداگر البتہ حاضر ہیں۔"

"وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں۔" ہم نے فرمایا۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور وغل سنائی دیا۔ دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا جلوس آ رہا ہے۔ آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے، یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا، معانقہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خان کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اُون تراشتا، آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے ملک اور قوم کی خدمت کر کے اس رتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر بکریوں کی اُون تراشنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہو گیا۔ ایک روز شومیٔ قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحبِ پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا۔ (جو خاک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی، گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی، چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور میں اتفاقاً سٹیج

پر اپنے نہیں کھڑے پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا۔ جو کہ نہایت تسلی بخش تھا۔ رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتش بازی سے استقبال کیا۔ شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا، تو بالکل جی نہ لگتا تھا۔ اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب پہنچا۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے لاکھ درجے بہتر تھا، چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشہ ہوتا۔ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا تھا۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا ہے۔ کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی۔

خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بُری نہیں ہے۔ زمانہ ساز خاں معروض ہوا کہ "برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیں۔" ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے۔ لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے۔ ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصّہ لینا

ان دنوں ایک الیکشن زوروں پر تھی۔ اُلو شناس معروض

ہوا کہ ہم دِلّی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں ، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار تھا۔ کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسبِ معمول نہایت مایوس کُن خبریں سنائیں۔ جب ہم نے اس کو بُرا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور ہم الیکشن میں ضرور کامیاب ہونگے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زرِ کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا۔ تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیحدہ کیا، چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا۔ دو کمال درجہ ضدی نکلے، ایک کو زدوکوب کرایا، تو مانا۔ دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی، حقّہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی۔ لوگوں کو تحفے اور زرِ نقد دیا۔ رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا، تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہر دلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے۔ لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو ازحد پشیمان ہوتے، افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذراسی خوشں وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحبِ دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے، سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں ۔ اور محظوظ

ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب

دِلّی میں سیٹل ہونے کا ارادہ

اُلّو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے دُربار اور رہائش کے لیے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا۔ لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں۔ آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجئے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی، وہ بولا ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد وسط ایشیا سے آتے تھے۔ ہم نے بہترا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں، جنہیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا۔ یوں تو حضرتِ آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آتے تھے۔

ہمیں سخت غُصّہ آیا، لیکن فوراً اُتر گیا، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصّہ ہی نہیں آتا۔ لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ اُلّو شناس بھاگا بھاگا آیا۔ بولا۔ محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات اِدھر اُدھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے، ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپا لی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہِ مروّت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہِ نور ہیرا برآمد ہوا۔

اُتوشناس اور محمد شاہ کے وزرا کی ناچاقی

ہندی وزرا سے شکر رنجی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزرا کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ اُتوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم چکا دی گئی۔ لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے۔ بولا اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوائی جائے۔ ہم مان گئے، ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے۔ ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابنِ شمشیر لکھا ہو گا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے، دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں، اس نے شکستہ حروف میں محض "ایم۔ایس رنگیلا" لکھا۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آمرا۔ معروض ہوا کہ محاسبِ اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کیا جائے۔ ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا، محکمۂ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیے، پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے۔ اس دفتری کارروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہو گئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

"ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟" ہم نے پوچھا۔

"وزیرستان سے"۔ وہ بولا۔

"اور یہ وزیرآباد کیا ہے؟" "یہ یونہی ہے۔"

ایک باکمال بزرگ

قطب الدین خان جاگیردار کے ہاں شادی پر گئے۔ دولہا کی عجب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے بُرا بھلا کہتی رہیں۔ پھر زدوکوب کرنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا، سوچا کہ آن بن ہو گئی ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے ..... دولہا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے" تاکہ پوری کروا دی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں، کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا، تو ذرا قریب آ گئے، جب دولہا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر "پھنس گیا!" کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے۔ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہونے لگا۔ ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اڑا دی تھی کہ یا تو خدانخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا۔ لیکن ہم خواتین سے دُور ہی رہتے، برخوردار علی قلی کو بھی دور دور رکھتے، ہم شادی برائے

شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دورانِ گفتگو ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اُف۔ اُوئی، اللہ، توبہ، ہائے، نگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس بہو کے قضیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔

ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اُٹھتے۔ بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے، چنانچہ جب کسی خاتون نے بھرا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوستے دیے کہ اگر ہم نہ آتے، تو کوئی اور آجاتا۔ پھر فائل منگا کر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھاتے جو ہندی اُمرا نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی۔"

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔

جنوبی ہند سے وفد

ہم بہادر ضرور ہیں، جنگ کا بھی شوق ہے۔ لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انہیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو کے رہتے ہیں۔ جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ شیل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے۔ اس لیے معذوری ظاہر کی۔ انہوں نے التجا کی کہ شبیۂ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے، تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اترواتے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ

کر سونگھتے ہیں ۔ ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے ۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے ۔ یہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا ۔ دراصل ہمیں

تمباکو، شراب، جبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے ، خاتونِ موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا ۔ اور ہمیں گانے بجانے سے شغف تو چلا تھا ۔ دربار میں اس نے "نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی" والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑنے لگیں ۔ شروع شروع میں ادھر خیال اسکی جانب رہا لیکن جہاں توشناس کے سمجھانے پہ سنبھل گئے

اس نئے زیادہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چلیں تو کرتی ہیں الا دوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے ، خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو ۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں ، لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا ۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے ۔ اور باقی چیزیں آتی جاتی ہیں ۔

ایک روز ہم چڑ گئے ، اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے :

ساٹھویں سال میں قدم آیا زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی ہے جوانی کی غمزہ و ناز و دلستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے، مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے۔ دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے، لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمابردار خاں سے اپنی شکل وصورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخ پابوس کن جملے کہے۔ طیش میں آکر اُسے دُرّے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی دُرّانی ہے، چنانچہ اُسے معاف کیا اور اُلوشناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار دست بستہ معروض ہوا کہ روئے پُرنور پر وہ ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھتیں لہٰذا شکل وصورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے۔ لہٰذا خاتونِ موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے، مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بیوقوف بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرّار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دُور دور رہنے لگے۔ خاتونِ مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہوگئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کرکے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

جامعۂ فرقانی

آج صبح مُلّا فرقان الدّین برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے۔ آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔ جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلباء کو خلیفے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے، تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے۔ کورس پورا کر لے تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں، مثلاً ابوالبرکات، ابوالفضائل، ابوالفضیلت عموماً سرکاری حکاموں جامعہ کے معلّمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمدؐ شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات بنے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے۔ جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی، اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کرتے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی (کیونکہ اس ملک میں شکل و صورت نہیں ہوتی، صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے۔ کہ شادی میں لڑکے دُلہن کے علاوہ ایک کثیر رقم کی بھی توقع رکھتے ہیں، یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں۔ تاکہ وہ خوب دادِ عیش دے سکیں؟

ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے۔ تبھی اس ملک میں بیچاری لڑکیوں کی آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خوامخواہ تقریر

جامعہ میں ہماری تقریر کرنی پڑی۔ حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے مُلّا فرقان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یُوں کرایا۔

"حضرات کیسا روزِ سعید ہماری زندگی میں آیا ہے۔ کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذاتِ والاصفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں، آپ نے جس سلسلے میں دلی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے۔ وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سُنا ہے کہ جناب خاں صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علمیت شبیہ مبارک سے ظاہر ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے واقف ہیں۔ شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل ـــ خیر جانے دیجئے۔ ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے۔ کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں۔ اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے بھی ملاقات مقصود تھی۔ جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال۔ معاف کیجئے۔ اچھا تو حضرات۔ مولانا نادرشاہ صاحب!

ہم کو اس بدتمیز مُلّا پر سخت غُصّہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہا ہے تو کبھی مولانا، ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔

ہم تالیوں کے شور میں اُٹھے اور فرمایا "پیارے اطفال، معتبین حضرات و پرنسپل مُلا ایف ڈی۔ آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقع روز روز کہاں میسّر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ اوّل تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں حالی پر تعجب ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں آپ ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی ململ ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا، تو کاریگر خود بھی انگوٹھی سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے، یہ آپ کی غذا کا قصور ہے۔ یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے، جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا رہے ہیں۔ زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستان میں کتبے تک غلط ہیں۔ ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا: مثلاً!

شیخ خدا بخش مرحوم

سنہ سولہ سو دس میں پیدا ہوئے۔

سولہ سو ستر میں ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ غلط ہے اس کی جگہ یوں ہونا چاہیئے۔

شیخ خدا بخش مرحوم

سنہ سولہ سو دس میں پیدا ہوئے۔

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔
ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے۔

حضرات و اطفال ہم ایران سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے، خیال تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔ کابل میں آئے تو سوچا انہیں زدوکوب کریں گے۔ خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق، وضعدار، نجیب و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور یار لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔

اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گزری ہے۔ لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ آپ کی روایات پر۔ آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں، آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا۔ کئی سو سال پہلے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے شکست کروانا ہے اور تو اور آپ نے خاندانِ غلامان سے بھی شکست کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں۔ (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اُس پار سنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے۔ اور تخلص کرتا ہے۔ یہ آب و ہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے۔ شعر و شاعری کے لیے نہایت ساز گار ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سنا، وہ لوگ خوب سر دھنتے اور

وجد میں آ کر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں۔ گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں۔ ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا۔ ہماری طرف عجیب وغریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیض وغضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ پکا راگ گاتا ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے۔ غالباً رات کو آپ زیادہ نشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح مسرور اٹھے۔ لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا اور رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے۔"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی مُلّا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی، ہم دیر تک بولتے رہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا۔ اچانک چند بدتمیز طلبا کی جماہیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات اور جوابات

مُلا فرقان نے اُٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا، حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا: "نادر شاہ سے سوال پوچھے جائیں گے۔ تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ "کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟" پوچھا گیا۔

"ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں" ہم نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مسکرا کر کہا "ہم خود شہنشاہ ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں۔ خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں" ایک برخوردار بولے۔

"ہاں" ہم نے فرمایا۔ "جسمانی ساخت تو ایک جیسے ہیں لیکن اُوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے۔"

"صاف صاف بتایئے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب۔"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مفکر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیئے) جواب دیا۔ "ہم شہریار خان افشنس کی بائیں جانب ہیں اور مُلا فرقان کی دائیں جانب۔"

"کیا آپ ایران سے آئے ہیں؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے۔ "ہاں ہاں برخوردار۔ اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو؟"

"شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعۂ معاش کیا تھا۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمّل دکھایا تھا۔ لیکن اس سوال نے ہمیں سیخ پا کر دیا۔ ہماری آنکھوں میں خون اُترنا شروع ہوا۔ میز پر ہمارا مکّہ اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ منہ کا جھاگ مُلّا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہڑبونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

نوازنا مُلّا فرقان اللہ کو

ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو، یہ سب اسی مُلّا کی شرارت ہے۔ پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی کٹی تقریر کروانا سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتہ چلا کہ مُلّائی کا ڈھونگ ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی بھیج کر پتا کرایا۔ تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خورد و نوش پر نصف سے زائد اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ مُلّا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفرِ کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا۔ ویسا بھرے گا۔

اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی، دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔

ذرا سی تنقید بھی برداشت، ان لوگوں سے نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی ہے، گزشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں۔ چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا، بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اسکی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خاں اتو شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا۔ فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں۔ جنہیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا، ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پاکر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے، تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکیں۔ مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انہیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے بعد چھیڑا گیا، ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے، ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر شلجم وغیرہ پھینکے گئے، ایسی کئی وارداتوں کی اطلاع ہمیں ملی، ہم اسپِ مزدور یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا، سوار ہو کر شہر میں گئے۔ تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کرا دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں۔ یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے "نادر شاہ مردہ باد" کے نعرے سنائی دیے۔ اسی وقت غیظ و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار

کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کر دو"۔ یہ تھا وہ قتلِ عام۔ ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی، ہم قمیص اُتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام

چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا۔ ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زدوکوب کیا تھا۔ اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے۔ کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی۔

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا۔ چنانچہ ہم مسکرا کر دوسرا مصرع۔
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی۔ سنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انہوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہے تھے۔ گرمی زیادہ تھی۔ ہمارا دل پسیج اٹھا بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چمپت ہوئے۔ خیر اب تلوار کو میان میں ڈالنے کی کوشش کی، تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی۔ ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرا دی کہ پہلا قتلِ عام غلط ہوا ہے۔ بلکہ ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ تلوار تو میان سے ذرا نکلی نہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا۔ جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ خاص کرائیں، جو امراء کے لیے ہو۔

پھر سوچا اہلِ دلی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ تیمور کا قتلِ عام تین دن تین رات تک ہوتا رہا تھا۔ بھلا ہمیں کب یہ خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے اور آزاد نظم سنائی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تنگ چکے تھے مسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطف انہیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا۔ وہ فوراً بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے انشاءاللہ۔ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے نکلے تھے۔ مچھلیاں تھیں کہ جلالِ شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ اچانک ہم نے اپنے اوپر کمبل کا بار محسوس فرمایا۔ سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے۔ چنانچہ خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا۔ ہمارا دم گھٹنے لگا۔ گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے۔ ہڑبڑا کر اٹھے دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انہوں نے واقعی اجل کو لبیک کہہ کر سعادتِ دارین پائی۔ نیا ملک ہے۔ خبردار رہنا چاہیے۔

واپسی کا قصہ

ایکا ایکی جیسے ہی دو ہزار پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور شاہزادہ رضا کی آنکھوں میں بھی۔ ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے پورے لباس پاجامے اور بنیان وغیرہ کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ پوستین ہماری ہی تھی۔ اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود نہ

پہن سکے، پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دلّی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے، ہم موٹے ہو گئے ہیں، رات کو خراٹے لیتے ہیں، صبح کی چاء اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اٹھتے، قیلولے کی عادتِ قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے۔ ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے، اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سندریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے، تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں، کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سب مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ لیا تھا۔ جن کے آباؤ اجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر در قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے، تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا. چنانچہ شیل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

خدا کے فضل سے زادِ راہ

ہمارا دلّی سے تشریف لے جانے کا حال کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں، ہم نے از راہِ مروت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ لال قلعہ اب خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے، حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپِ مزدور پر سوار ہو کر در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین

چرا رہے ہیں گھوڑے سے نیچے آرہے ہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھا لیا ہے اسے تعزیری طور پر اہلِ ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کرکے تانگے میں جتوایا جائے۔

کابل میں والیٔ کابل سے نجات

والیٔ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لاتے ہیں وہ دیتے جائیں، ورنہ مروت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے۔ ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہوسکتے، البتہ کچھ پوستینیں، ڈبے یا گلقند درکار ہو۔ تو وہ دے سکتے ہیں۔ والیٔ کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہونق آدمی ہے، دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہترا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لو لگانی چاہیے۔ دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ بوٹا شجر پوری کی مثال پیش کی کہ دنیاداری سے مستغنی ہوکر تارک الدنیا بنے ہوتے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہوجاتے۔ ہنس کر کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بھی بن کر بھی دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں۔ اب وہ ہند گیا تو کرکری ہوگی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر ازراہِ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باسی، دو سو مقامی جھنڈے اور ڈبے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص بھوکھڑ سے رہائی پائی۔

ختم شد

تتمّہ

ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا دیر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سُوئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانامرگ پر بیحد قلق ہے۔ کیونکہ اس میں مشیت ایزدی ہرگز نہ تھی۔ اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے، تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا، خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ع عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھئے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور۔ ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اُڑ رہی ہیں۔

- شفیق الرحمٰن : موجودہ دور میں شگفتہ اور
صحت مند ادب کا بانی ہے۔

——— ادبِ لطیف

- شفیق الرحمٰن : کے افسانے پڑھ کر شوخ
رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سرخا سرخ
نارنجی، یاقوتی اور زعفرانی۔

——— کرشن چندر

سارے نئے ادب میں بس لے دے کے ایک
شفیق الرحمٰن صاحب ہیں جنھوں نے تفریحی ادب
کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لا ابالی
پن، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ بس انہی کا حصہ
ہے۔

——— محمد حسن عسکری

- شفیق الرحمٰن کی کہانیوں میں
تکلف اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں
ان کے رومانی اور شگفتہ
افسانوں میں بہت سادگی اور
روانی ہے۔

حجاب امتیاز علی تاج

یہ ریڈیو روم تھا

"کہاں سے آنا ہوا۔؟

"سرزمینِ پاک سکاٹ لینڈ سے آرہا ہوں جہاں کے باشندوں کی دریا دلی کے قصے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔"

"بذریعہ ریل آیا۔ ارادہ جہاز سے آنے کا تھا لیکن جہاز نکل چکا تھا۔ دراصل یہ آمد نہیں آورد تھی۔"

"ویسے روم کس سلسلے میں آنا ہوا ؟"

"مثنوی مولینا روم سے متاثر ہوا۔ اُدھر داناؤں سے سن رکھا تھا کہ سب سڑکیں روم پہنچتی ہیں، چنانچہ ایک سڑک اختیار کی اور اپنے تئیں روم میں پایا۔ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔"

"کب تک قیام ہوگا ؟"

" ارادہ تو دو چار روز ٹھہرنے کا تھا، لیکن اگر زیادہ تنگ کیا گیا، تو شاید آج شام ہی کو ہجرت کر جاؤں"۔

" روم میں کیا کچھ کیا؟"

" وہی کیا جو رومن کرتے ہیں، لیکن بُرا ہوا اطالوی زبان کا، میں اطالئے آحکا لیکن زبان اب تک نہیں آئی۔ کچھ کام رومنوں کے اصرار پر کرنے پڑے"۔

" مثلاً"

" مثلاً ایک پارکر ۵۱ ایک ہزار لیرے میں خریدنا پڑا۔ حالانکہ آج ۶۲۵ ہے۔

" یہ تو بہت سستا ملا، ہزار لیرے یعنی تقریباً گیارہ شلنگ"

" مگر وہ قلم صرف دکھاوے کا ہے، لکھنے لکھانے سے منکر ہے"۔

" کچھ خرید و فروخت کی ۔۔؟"

" خرید تو کی، لیکن شکر ہے کہ ابھی تک فروخت کی نوبت نہیں پہنچی"۔

" آپ کو کرنسی کی سمجھ آگئی؟ ایک پونڈ کے سترہ سو لیرے ہوتے ہیں"۔

" مجھے تو یہ پتہ ہے کہ چند ہی منٹوں میں نوٹوں کے لیرے لیرے ہو جاتے ہیں"۔

" روم میں آپ نے کیا کچھ دیکھا؟"

" وہی دیکھا جو گائیڈ نے دکھایا، گائیڈ جو کچھ دکھائے دیکھنا اور پسند کرنا پڑتا ہے، یوں بھی ہوا کہ گائیڈ دہنی طرف کے گن گا رہا ہے، لوگ بائیں طرف دیکھ رہے ہیں اور میں سامنے دیکھ رہا ہوں نہ جانے ابھی اور کیا کچھ دیکھنا ہے۔"

" آپ کو آرٹ کا شوق تو ہوگا؟"

" تھا، لیکن یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوگی کہ مائیکل اینجلو اور ڈاوینچی کا انتقال ہو چکا ہے"۔

"یہ کیوں۔ ؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ساری اٹلی میں صرف یہی دو حضرات رہتے تھے۔ ہر جگہ، ہر چیز ملک کا ہر حصہ انہی نے ترتیب دیا۔ فلارنس سارے کا سارا انہوں نے بنایا ہے۔ روم کا تہائی حصہ میلان کا نصف حصہ۔ بقیہ شہر ان کے شاگردوں نے بنائے ہیں۔ جن شہروں میں یہ نہیں پہنچ سکے انہیں بھی تعمیر کرنے کا قصد رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی۔"

"کلیسائے پطرس دیکھا ۔۔؟"

"پطرس صاحب آج کل روم میں ہیں کیا ؟"

"جی نہیں۔ سینٹ پیٹر کا گرجا ۔۔"

"اچھا وہ ۔۔ تو انگریزی میں بتایئے نا ۔۔ وہ تو آج صبح دیکھا تھا۔ بڑی اونچی عمارت ہے، وہیں کسی زمانے میں مذہبی دیوانوں نے گنبد سے چھلانگ لگا کر خودکشی کا فیشن شروع کیا تھا۔ میرے خیال میں پہلے ان عقیدت مندوں نے بخشش کی دعائیں مانگی ہوں گی، جب خاطر خواہ جواب نہ ملا، تو سوچا ہوگا کہ اب انتظار فضول ہے،

وہ اونچے اونچے جنگلے بھی دیکھے جو اس رسم کو روکنے کے لیے اوپر لگائے گئے ہیں۔ اب اگر کوئی ضرورت مند خودکشی کرنا چاہے تو پہلے جیسی آسانی نہیں رہی۔ یہ کیسی دنیا ہے کہ انسان اطمینان سے خودکشی بھی نہیں کر سکتا۔ اتنے اونچے جنگلے نہیں ہونے چاہئیں، زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ نوٹس لگا دیتے کہ یہاں خودکشی کرنا منع ہے۔"

"ہوں ۔۔ تو اور کہاں کہاں کی سیر کی ۔۔؟"

"چڑیا گھر دیکھا جہاں چڑیا کے علاوہ دیگر پرندے تھے۔ پرندوں کے علاوہ جانور بھی تھے اور یہ سب بڑے غور سے انسانوں کو دیکھ رہے تھے۔ واٹیکن کے میوزیم میں ورجل اور دانتے کے مسودات دیکھے

جنہیں کاتب نقل کرکے حفاظت سے واپس رکھ گیا تھا۔ وہاں کولمبس کا نقشہ بھی تھا جس میں یورپ تو ٹھیک طرح بنایا ہے۔ لیکن باقی دنیا کا حدود اربعہ کچھ عجب سا ہے۔ در اصل کولمبس کا عقیدہ تھا کہ جب تک انسان ایک ایک ملک کو خود دریافت نہ کرے نقشہ بنانا فضول ہے۔"

"مائیکل اینجلو کا تراشا ہوا حضرت موسیٰ کا مجسمہ ؟"

"خوب مجسمہ ہے! گائیڈ کا وہ فقرہ نہیں بھولتا کہ اینجلو نے مجسمہ مکمل کرکے ہتھوڑی سے گھٹنے پر ضرب لگائی — مجسمے کے گھٹنے پر — اور منہ ہ لگایا کہ بولتے کیوں نہیں تم ہی تو مکمل ترین موسیٰ ہو۔"

"پھر کیا ہوا ؟"

"ہونا کیا تھا۔ ان کی اس حرکت سے پتھر پر خواہ مخواہ نشان پڑ گیا۔"

"سیزروں کے روم کی سیر کی ۔؟"

"جی ہاں پرانا روم دیکھا۔ وہ مقام جہاں سیزر کو قتل کیا گیا جہاں مارک انٹنی نے اپنی شہرہ آفاق تقریر کی جسے سیکسپیئر نے سن کر وہیں حرف بحرف نقل کر لیا۔ کولوزیم جو کولوسل ہے۔ جہاں انسان اور حیوان آپس میں لڑا کرتے تھے۔ یہ لڑائی بڑی ہی ہوتی ہے۔ سنا ہے وہاں ایک قیدی نے شیر کے کان میں کچھ کہہ کر اپنی جان بچالی تھی۔"

"اس نے کیا کہا تھا ؟"

"یہی کہ اگر آپ نے مجھے کھا لیا، تو ڈنر کے بعد مجمع کے سامنے آپ کو تقریر کرنی پڑے گی۔"

"مارکس آریلیئس کا مجسمہ تو ضرور دیکھا ہو گا۔"

"جی ہاں! آپ نے تاثراتِ مارکس آریلیئس پڑھی ؟ نہایت لاجواب کتاب ہے۔ سنا ہے کہ آپ بڑے متقی، پرہیز گار، خداترس، فلاسفر رومن بادشاہ تھے جب فرصت ملتی چند عیسائیوں کو شیروں کے سامنے پھینکوا کر کتاب شروع کر دیتے۔ جب تحریریں بے جان اور پھیکی معلوم ہونے لگتیں، تو چند اور عیسائیوں

کو چند اور شیروں کے سامنے پھینکوا کر جلدی سے پھر لکھنا شروع کر دیتے ۔۔۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ کو لوزیم کے سامنے نیرو کے محل کے کھنڈرات ہیں. گائیڈ نے بڑے وثوق سے بتایا کہ روم کو دیا سلائی دکھا کر وہ بھلا آدمی وائیلن بجا رہا تھا۔ گائیڈ کے لہجے سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود موقع پر موجود تھا حالانکہ وائیلن کا اس زمانے میں نام و نشان تک نہ تھا۔"

"نہیں صاحب یہ بات تو ضرب المثل ہے، کیسے غلط ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر ممکن ہے کہ بنسری بجا رہا ہو یا نفیری، مگر وائیلن ہرگز نہیں بجا سکتا۔"

"آپ نے بر نینی کا وہ چشمہ دیکھا جہاں لوگ پانی میں سکّے پھینک کر دعا مانگتے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"آپ نے کیا مانگا ؟"

"میں نے پانی میں سکّہ پھینک کر کہا کہ کاش کہ میں یہاں پہلے آیا ہوتا۔"

"یہاں کی آب و ہوا کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟"

"آب تو یہاں بوتلوں میں ملتا ہے جو سوڈے واٹر سے کسی طرح کم نہیں، ہوا میں سکون اور ٹھہراؤ ہے چنانچہ چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی، پر عمل پیرا ہونا سخت مشکل ہے۔"

"اور غذا۔۔۔ ؟"

"غذا میں غذائیت ضرورت سے زیادہ ہے اور باشندے ماشاءاللہ خوش خوراک ہیں۔"

"روم تک سفر کیسا رہا۔ بہت کچھ دیکھا ہوگا۔"

"راستے میں نظارے ایسے سہانے تھے کہ کچھ اور دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ PISA کے جھکے ہوئے مینار کو دیکھ کر افسوس تو ہوا مگر اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ کششِ ثقل کے متعلق جو شبہات تھے وہ اور قوی ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مینار اب گرا، اب گرا، دن بھر میں وہاں رہا لیکن مینار نہیں گرا۔۔۔"

: ماہرین نے اس پر کتابیں لکھی ہیں"۔

" ماہرین تو ہمیشہ تنگڑ میں بات پیدا کرتے ہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کے معمار ناتجربہ کار تھے کسی نے دل لگا کر کام نہیں کیا۔ ٹھیکیدار نے پتھر اور مسالہ بھی گھٹیا کوالٹی کا لگایا، ورنہ دلّی میں قطب صاحب کی لاٹھ اس سے کہیں بلند ہے اور بالکل جوں کی توں ہے۔ کشش ثقل بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی"۔

" اٹلی آنے سے پہلے آپ نے کہاں کہاں کی سیر کی؟"

" سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی۔ NICE میں پھولوں کی جنگ میں شمولیت کی۔ لوگوں نے پھول مار مار کر ایک دوسرے کا بھرکس نکال دیا۔ یہ حالت ہوئی کہ اگلے دن سڑکوں پر چلنا محال تھا۔؟"

" اور مانٹی کارلو ــــ؟"

" پیشتر اس کے آپ وہاں کے قمار خانے کے متعلق پوچھیں میں یہ بتا دوں کہ میں وہاں صرف عبرت حاصل کرنے گیا تھا"۔

" پیرس کیسا لگا؟"

" پتہ نہیں پیرس کے مضافات میں مجھے گوجرانوالہ اور خان پور کیوں یاد آئے۔ لوگ تہمد نما چیزیں باندھے موڑھوں پر بیٹھے حقہ سا پی رہے تھے۔ لیکن پیرس بہت مہنگا ہے، ایک تو وہاں بخشیش بہت مانگتے ہیں۔ بات بات پر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور تب تک ٹکٹکی باندھے مسکراتے رہتے ہیں۔ جب تک آپ کم از کم دو تین سو فرانک نہ دے دیں، ورنہ تعاقب کرتے ہیں۔ صحیح معنوں میں تعاقب کرنا ایک فرانسیسی ہی جانتا ہے۔ راستہ پوچھو تب بخشیش، کسی چیز کی تعریف کرو تب بخشیش، یہاں تک کہ صبح بخیر یا شب بخیر کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے"۔

" فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں سے آپ کو کون سا ملک پسند آیا"؟

" ان تینوں میں سے مجھے یہیں پسند ہے"۔

" وہاں کیا ہے ــــ؟"

"سپین ہی وہ ملک ہے جہاں کمر یاد نہیں آتا۔ جہاں دوپہر کے کھانے کو اَل مُرسنا کہتے ہیں — جو غالباً اَل مَرغا سے نکلا ہے۔ سلاد کو اَل سلادَ، کیراج کو اَل گیراجو اور بھینس کو اَل بفیلو — جہاں اَل فانسو نام کے بادشاہ گزرے ہیں۔ جہاں مغربی کھانوں کے ساتھ پلاؤ بھی کھایا جاتا ہے۔ بازاروں میں حلوہ کھلم کھلا بکتا ہے۔ جہاں لوگ قیلولہ کرتے ہیں۔ گھروں میں زنانہ مردانہ علیحدہ علیحدہ ہے۔ جہاں کی موسیقی مشرقی ہے جہاں خانہ بدوش گٹار کی دُھن پر والہانہ رقص کرتے ہیں۔ جہاں بال اور آنکھیں سیاہ اور دل سفید ہیں اگرچہ رنگت گندمی ہے اور شہروں کے نام جانے پہچانے سے ہیں۔ ریاَنہ، الکنیز، قرطبہ، طلیطلہ، القنطرہ، غرناطہ، ظفرہ، اشبیلیہ۔ جہاں رات گئے لوگ ہار پہن کر پیچیدہ گلیوں میں سیر کرتے ہیں اور محبوب کے کوچے میں بلند آواز سے اشعار بھی پڑھ ڈالتے ہیں اور ؎

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

ہے ہے یہ آپ نے کیا یاد دلا دیا، کاش کہ ہم روم میں سپین کی باتیں نہ کریں۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"ابھی تو باہر نکل کر ایک سگریٹ پیئوں گا۔"

"میرا مطلب ہے روم سے کہاں جایئے گا؟"

"کیٹس اور شیلے کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے بعد یہ دریافت کر کے کہ روم کتنے دنوں میں بنا تھا نیپلز ایک اطالوی دوست سے ملنے جاؤں گا۔ وہ جنگ کے دوران میں قیدی تھا اور میرا مریض تھا۔ مریض اور طبیب رہ چکنے کے باوجود ہمارے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔"

"آپ کو کئی دلچسپ ہم سفر بھی تو ملے ہوں گے۔"

"جی ہاں جنیوا میں دو اطالوی لڑکیاں ملیں دو فرانسیسی جن کا تعاقب کر رہے تھے، مانٹی کارلو

میں دو فرانسیسی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی جو دو اطالوی لڑکوں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اب میں کچھ ایسے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو ایک دوسرے کا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔ اگر اجازت ہو تو ایک سوال پوچھوں۔"

"ارشاد۔"

"ابھی اور کتنی دیر ہے؟"

"تقریباً دو منٹ۔"

"میرے خیال میں اب ایک فلمی گانا ہو جائے۔ کوئی نیا ریکارڈ ہے آپ کے پاس؟"

"جی ہاں ۔۔۔ تیری لونگ دا پیا لشکارا، پچھلے مہینے آیا ہے۔"

"تو پھر بسم اللہ ۔۔۔ شائقین کو زیادہ مت ترسایئے۔"

"بہت اچھا۔ خدا حافظ۔"

"فی امان اللہ۔"

کلیدِ کامیابی

(حصّہ دوم)

ہم لوگ خوش قسمت ہیں کیونکہ ایک حیرت انگیز دور سے گزر رہے ہیں آج تک انسان کو ترقی کرنے کے اتنے موقعے میسر نہیں ہوئے۔ پرانے زمانے میں ہر ایک کو ہر چیز خود سیکھنی پڑتی تھی۔ آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد پر خواہ مخواہ تلا ہوا ہے۔ دوسروں کو شاہراہ کامیابی پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار کتابیں موجود ہیں، اگر آپ کی مالی حالت مخدوش ہے، تو فوراً لاکھوں کماؤ خرید لیجیے۔ اگر مقدمہ بازی میں مشغول ہیں، تو رہنمائے قانون لے آئیے۔ اگر بیمار ہیں، تو گھر کا طبیب پڑھنے سے شفا یقینی ہے۔ اسی طرح کامیاب زندگی، کامیاب مرغی خانہ، ریڈیو کی کتاب، کلیدِ کامیابی، دکلیدِ مویشیاں اور دوسری لاتعداد کتابیں بنی نوع انسان کی جو خدمت کر رہی ہیں اس سے ہم واقف ہیں۔

مصنف ان کتابوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ ازراہِ تشکر، کلیدِ کامیابی حصہ دوم لکھنے کا ارادہ

کیا تاکہ وہ چند نکتے جو اس افادی ادب میں پہلے شامل نہ ہو سکے۔ اب شریک کر لیے جائیں۔

عظمت کا راز

تاریخ دیکھیے دنیا کے عظیم ترین انسان غمگین رہتے تھے۔ کارلائل کا ہاضمہ خراب رہتا تھا۔ سیزر کو مرگی کے دورے پڑتے تھے، روس کا مشہور آئی وان نیم پاگل تھا۔ خودکشی کی کوشش کرنا کلائیو کا محبوب مشغلہ تھا، کانٹ کو یہ غم لے بیٹھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ یورپ کی کلاسیکی موسیقی بیمار اور بیزار فن کاروں کی مرہونِ منت ہے۔ دنیا کا عظیم ادب مغموم موڈ کی تخلیق ہے اور اکثر جیلوں میں لکھا گیا ہے۔ لہٰذا غمگین ہوئے بغیر کوئی عظیم کام کرنا ناممکن ہے غم ہی عظمت کا راز ہے — یا غم تیرا آسرا۔

تو پھر آج ہی سے رنجیدہ رہنا شروع کر دیجیے۔ بہت تھوڑے ملک ایسے ہیں جہاں غمگین ہونے کے اتنے موقعے میسر ہیں جتنے ہمارے ہاں۔ ابھی چند اشعار پڑھیے۔ ہماری شاعری ماشاءاللہ حزن و الم سے بھرپور ہے۔ سوچیے زندگی پیاز کی طرح ہے اسے چھیلتے رہیے اندر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا، رشتہ داروں اور ان کے طعنوں کو یاد کیجیے۔ پڑوسی عنقریب آپ کے متعلق نئی افواہیں اڑانے والے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ سے قرض لیا ہے ایک پائی بھی ادا نہیں کی (ویسے جو قرض آپ نے لیا ہے وہ بھی ادا نہیں ہوا) — زندگی کتنی مختصر ہے — مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ — شام کی گاڑی سے کوئی بیس رشتہ دار بغیر اطلاع دیے آ جائیں گے ان کے لیے بستروں کا انتظام کرنا ہوگا۔ یہ چشتی صاحب اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں — پچھلے ہفتے قطب الدین صاحب نے کھانے پر سارے شہر کو مدعو کیا۔ سوائے آپ کے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ غمگین ہیں۔ آہیں بھریے، ماتھے پر شکنیں پیدا کیجیے، ہر ایک سے لڑیے عنقریب آپ اس احساسِ برتری سے آشنا ہوں گے جو سدا بیزار رہنے والوں کا ہی حصہ ہے، وہ احساس جو انسان کو نطشے کا فوق الانسان بناتا ہے۔ اب آپ شاید کوئی عظیم کام کرنے والے ہیں۔

عظیم کام کر چکنے کے بعد اگر موڈ بدلنا مقصود ہو تو فوراً بازار سے مسرور رہو، مسکراتے رہیئے، یا ایسی ہی کوئی کتاب لے کر پڑھیے اور خوش ہو جایئے۔

اپنے آپ کو پہچانو

حکما کا اصرار ہے کہ اپنے آپ کو پہچانو، لیکن تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اپنے آپ کو کبھی مت پہچانو، ورنہ سخت مایوسی ہوگی، بلکہ ہو سکے تو دوسروں کو بھی مت پہچانو۔ ایمرسن فرماتے ہیں کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی بنتا ہے۔ کچھ بننا کس قدر آسان ہے۔ کچھ سوچنا شروع کر دو اور بن جاؤ۔ اگر نہ بن سکو، تو ایمرسن صاحب سے پوچھو۔

خواب اور عمل

اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنایئے۔ یہ جامہ جتنا جلد پہنایا گیا اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ان لوگوں سے بھی مشورہ کیجیے جو اس قسم کے جامے اکثر پہناتے رہتے ہیں۔

حافظہ تیز کرنا

اگر آپ کو باتیں بھول جاتی ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا حافظہ کمزور ہے۔ فقط آپ کو باتیں یاد نہیں رہتیں۔ علاج بہت آسان ہے۔ آئندہ ساری باتیں یاد رکھنے کی کوشش ہی مت کیجیے۔ اگر آپ دیکھیں گے کہ کچھ باتیں آپ کو ضرور یاد رہیں گی۔

بہت سے لوگ بار بار کہا کرتے ہیں — ہائے یہ میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا۔ اس سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہمیشہ پہلے سے سوچ کر رکھیے اور یا پھر ایسے لوگوں سے دور رہیے۔ دانش مندوں نے مشاہدہ تیز کرنے کے طریقے بتائے ہیں کہ پہلے پھرتی سے کچھ دیکھیے پھر فہرست بنایئے کہ ابھی آپ نے کیا کیا دیکھا ہے۔ اس طرح حافظے کی ٹریننگ ہو جائے گی اور آپ حافظ بنتے جائیں گے۔ لہٰذا اگر اور کوئی کام نہ ہو تو آج سے جیب میں کاغذ اور پنسل رکھیے۔ چیزوں کی فہرست اور فہرست کو چیزوں سے ملایا کیجیے۔

بڑی فرحت حاصل ہوگی۔

شوپنہار سیر پر جاتے وقت اپنی چھڑی سے درختوں کو چھوا کرتا تھا۔ ایک روز اسے یاد آیا کہ پُل کے پاس جو لمبا سا درخت تھا اسے نہیں چھوا۔ وہ مردِ عاقل ایک میل واپس گیا اور جب تک درخت نہ چھو لیا اسے سکونِ قلب حاصل نہ ہوا۔

شوپنہار کے نقشِ قدم پر چلیے۔ اس سے آپ کا مشاہدہ اس قدر تیز ہوگا کہ سب حیران رہ جائیں گے۔

خوف سے مقابلہ دل ہی دل میں خوف سے جنگ کرنا بے سُود ہے، کیونکہ ڈرنے کی ٹریننگ ہمیں بچپن سے ملتی ہے اور شروع سے ہمیں بھوت، چڑیل، ہاؤ اور دیگر چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے، تو تاریکی میں جایئے ہی نہیں۔ اگر اندھیرا ہو جائے تو جلدی سے ڈر کر روشنی کی طرف چلے آیئے۔ آہستہ آہستہ آپ کو عادت پڑ جائے گی اور خوف کھانا پرانی بات ہو جائے گی۔

تنہائی سے خوف آتا ہو تو لوگوں سے ملتے رہا کیجیے۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک چیز سے ڈریئے ورنہ یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس وقت آپ دراصل کس چیز سے خوف زدہ ہیں۔

وقت کی پابندی تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اگر آپ وقت پر پہنچ جائیں، تو ہمیشہ دوسروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اکثر دیر سے آتے ہیں، چنانچہ خود بھی ذرا دیر سے جایئے، اگر آپ وقت پر پہنچے، تو دوسرے سمجھیں گے کہ آپ کی گھڑی آگے ہے۔

وہم کا علاج اگر آپ کو یونہی وہم ہو گیا ہے کہ آپ تندرست ہیں، تو کسی طبیب سے ملیے۔ یہ وہم فوراً دور ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ کسی وہمی بیماری میں مبتلا ہیں تو ہر روز اپنے آپ سے کہیے ـــــ میری صحت اچھی ہو رہی ہے ـــــ میں تندرست ہو رہا ہوں۔

احساسِ کمتری ہو تو مندرجہ ذیل فقرے کہے جائیں:

میں قابل ہوں۔ مجھ میں کوئی خامی نہیں جو کچھ میں نے اپنے متعلق سُنا سب جھوٹ ہے۔ میں بہت بڑا آدمی ہوں۔ (یہ فقرے زور زور سے کہے جائیں تاکہ پڑوسی بھی سن لیں۔)

بے خوابی سے نجات اگر نیند نہ آتی ہو تو سونے کی کوشش مت کیجئے، بلکہ بڑے انہماک سے فلاسفی کی کسی موٹی سی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیجئے، فوراً نیند آجائے گی۔ مجرب نسخہ ہے (ریاضی کی کتاب کا مطالعہ بھی مفید ہے)

ہمیشہ جوان رہنے کا راز اوّل تو یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ جوان رہنا کوئی بہت بڑی بات ہے اس عمر کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں ملاحظہ ہو وہ شعر ؎ خیر سے موسم شباب کٹا، چلو اچھا ہوا عذاب کٹا۔ تاہم اگر آپ نے ہمیشہ جوان رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو بس خواہ مخواہ یقین کر لیجئے کہ آپ سدا جوان رہیں گے۔ آپ کے ہم عمر بیشک بوڑھے ہو جائیں، لیکن آپ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ جوانوں کی سی حرکتیں کیجئے۔ جوانوں میں اٹھیے بیٹھیے، اپنے ہم عمر بوڑھوں پر پھبتیاں کسیئے خضاب کا استعمال جاری رکھیئے اور حکیموں کے اشتہاروں کا بغور مطالعہ کیجئے۔

دلیر بننے کا طریقہ دوسرے تیسرے روز چڑیا گھر جا کر شیر اور دیگر جانوروں سے آنکھیں ملایئے (لیکن پنجرے کے زیادہ قریب مت جایئے) بندوق خرید کر انگیٹھی پر رکھ لیجئے اور لوگوں کو سنایئے کہ کس طرح آپ نے پچھلے مہینے ایک چیتا یا ریچھ (یا دونوں) مارے تھے۔ بار بار سنا کر آپ خود یقین کرنے لگیں گے کہ واقعی آپ نے کچھ مارا تھا۔

ویسے خان بہادر بننے سے بھی کافی فرق پڑ جاتا ہے۔

بے روزگاری سے بچیئے اگر آپ بے روزگار ہیں، تو فوراً امپلائمنٹ ایکسچینج میں درخواست دے کر کسی کھاتے پیتے رشتہ دار کے ہاں انتظار

کیجئے اور یہ یاد رکھیئے کہ انتظار زندگی کا بہترین حصہ ہے۔

ایک خانگی مشورہ

اگر آپ بیوی ہیں، آپ کا خاوند تھکا ماندہ دفتر سے آتا ہے۔ آپ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی ہیں اور اچھی اچھی باتیں سناتی ہیں تو شام کو وہ ضرور کہیں اِدھر اُدھر چلا جائے گا، لیکن اگر آتے ہی آپ اسے بے بھاؤ کی سُنا دیں۔ بات بات پر لڑیں اور پریشان کن تذکرے چھیڑ دیں، تو وہ منانے کی کوشش کرے گا اور شام گھر میں گزارے گا۔ اگر کہیں باہر گیا تو ساتھ لے جائے گا۔ (مگر یہ عمل بار بار نہ دوہرایا جائے، ورنہ کہیں شوہر موصوف واپس گھر کا رُخ ہی نہ کرے)

ایک کہانی

یا تو لوگ تقدیر کو کوستے ہیں یا تدبیر کو۔
یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔

مشہور ہے کہ پہاڑوں میں پارس پتھر ہوتا ہے جو چیز اسے چھو جائے سونا بن جاتی ہے۔

ایک شخص نے چھ مہینے کی چھٹی بغیر تنخواہ کے لی اور قسمت آزمائی کرنے نیپال پہنچا۔ کرائے کے جانوروں کے پاؤں میں زنجیریں باندھیں کہ شاید کوئی زنجیر پارس پتھر سے چھو جائے۔ دن بھر انہیں جنگلوں میں لیے لیے پھرتا۔ دن گزرتے گئے اور کچھ نہ بنا۔ چھٹی ختم ہوئی، جانور اور زنجیریں لوٹا کر قسمت کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ جوتا اتارتے وقت معلوم ہوا کہ میخیں سونے کی بن چکی ہیں۔ سنار کے پاس گیا اس نے میخیں تول کر قیمت بتائی —— یہ پورے چھ مہینے کی تنخواہ تھی۔

اس سے نتائج خود نکالیے، لیکن تقدیر اور تدبیر پر لعنت ملامت نہ کیجئے اور قسمت آزمائی کے لیے پہاڑوں کی طرف مت جایئے۔

گفتگو کا آرٹ

جو کچھ کہنے کا ارادہ ہو ضرور کہیئے۔ دورانِ گفتگو میں خاموش رہنے کی صرف ایک وجہ ہونی چاہیئے، وہ یہ کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے

جتنی دیر جی چاہے . . . باتیں کیجیے اگر کسی اور نے بولنا شروع کر دیا، تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور کوئی دوسرا آپ کو بور کرنے لگے گا۔ (بور وہ شخص ہے جو اس وقت بولتا چلا جائے جب آپ بولنا چاہتے ہوں)

چنانچہ جب بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکیں تو ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیجیے کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی یا قطع کلامی معاف کہہ کر پھر سے شروع کر دیجیے۔ اگر کوئی دوسرا اپنی طویل گفتگو ختم نہیں کر رہا، تو بے تکے جمائیاں لیجیے۔ کھانسیے۔ بار بار گھڑی دیکھیے . . . . ابھی آیا۔ کہہ کر باہر چلے جائیے یا وہیں سو جائیے۔

یہ غلط ہے کہ آپ بحث نہیں جیت سکتے۔ اگر آپ ہار گئے تو مخالف کو آپ کی ذہانت پر شبہ ہو جائے گا۔ مجلسی تکلفات بہتر ہیں یا اپنی ذہانت پر شبہ؟

البتہ لڑیئے مت اس سے بحث میں خلل آ سکتا ہے۔

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے کبھی مت مانیے، لوگ ٹوکیں تو الٹے سیدھے دلائل بلند آواز میں پیش کر کے انہیں خاموش کرا دیجیے، ورنہ وہ خواہ مخواہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ دورانِ گفتگو میں لفظ "آپ" کا استعمال دو یا تین مرتبہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اصل چیز "میں" ہے۔ اگر آپ نے اپنے متعلق نہ کہا تو دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے۔

تعریفی جملوں کے استعمال سے پرہیز کیجیے، کبھی کسی کی تعریف مت کیجیے، ورنہ سننے والے کو شبہ ہو جائے گا کہ آپ اسے کسی کام کے لیے کہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کچھ پوچھنا مطلوب ہو جسے وہ چھپا رہا ہو، تو بار بار اس کی بات کاٹ کر اسے چڑا دیجیے۔ وکیل اسی طرح مقدمے جیتتے ہیں۔

دوسروں کو متاثر کرنا

اگر آپ ہر شخص سے اچھی طرح پیش آئے ہاتھ دبا کر مصافحہ کیا، قریب بیٹھے اور گرم جوشی سے باتیں کیں، تو نتائج نہایت پریشان کن ہوں گے، وہ خواہ مخواہ متاثر ہو جائے گا اور نہ صرف دوبارہ ملنا چاہے گا، بلکہ دوسروں سے تعارف کرا دے گا۔ یہ تیسروں سے ملائیں گے چنانچہ اتنے ملاقاتی اور واقف کار اکٹھے ہو جائیں گے کہ آپ چھپتے پھریں گے۔ ممکن ہے کہ لوگ متاثر ہو کر آپ کو بھی متاثر کرنا چاہیں، وہ بلاضرورت بغل گیر ہوں گے ہاتھ دبائیں گے اور قریب بیٹھنے کی کوشش کریں گے۔

لہٰذا کسی کو متاثر کرنے کی کوشش مت کیجیے۔ بالفرض اگر آپ کسی کو متاثر کر رہے ہوں، تو خیال رکھیے کہ آپ اور اس شخص کے درمیان کم از کم تین گز کا فاصلہ ہو ورنہ وہ متاثر ہوتے ہی آپ سے بغل گیر ہونے کی کوشش کرے گا۔ (ہو سکتا ہے کہ کہیں آپ بھی اس سے متاثر نہ ہو جائیں) زندگی پہلے ہی کافی پیچیدہ ہے۔ کبھی مت کہیے کہ — آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، بلکہ اس سے پوچھیے کہ کہیں وہ تو آپ سے مل کر خوش نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ بات ہے، تو خبردار رہیے۔

رشتہ داروں سے تعلقات

دور کے رشتہ دار سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ جتنے دور ہوں، اتنا ہی بہتر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دور کے رشتہ دار سہانے۔

تربیتِ اطفال

بچوں سے کبھی کبھی نرمی سے پیش آئیے۔

بچے سوال پوچھیں تو جواب دیجیے، مگر اس انداز میں کہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں۔ اگر زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجیے جب بڑے ہو گے سب پتہ چل جائے گا۔

بچوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیے، شاید وہ بزرگوں کا ادب کرنے لگیں۔

بچوں کو دلچسپ کتابیں مت پڑھنے دیجیے۔ کورس کی کتابیں کافی ہیں۔

اگر بچے بے وقوف ہیں تو پرواہ نہ کیجئے بڑے ہوکر یا تو جینیس بنیں گے یا اپنے آپ کو جینیس سمجھنے لگیں گے بچے کو سب کے سامنے کبھی مت ڈانٹیئے، اس کے تحت الشعور پر بُرا اثر پڑے گا۔ ایک طرف لے جاکر اس کی خوب تواضع کیجئے۔

بچوں کو پالتے وقت احتیاط کیجئے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں۔ ورنہ وہ بہت موٹے ہوجائیں گے اور والدین اور پبلک کے لیے خطرے کا باعث ہوں گے۔

اگر بچے ضد کرتے ہیں تو آپ بھی ضد کرنی شروع کر دیجئے، وہ شرمندہ ہوجائیں گے۔

ماہرین کا اصرار ہے کہ موزوں تربیت کے لیے بچوں کا تجزیہ نفسی کرانا ضروری ہے، لیکن اس سے پہلے والدین اور ماہرین کا تجزیہ نفسی کرالینا زیادہ مناسب ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ کنبے میں صرف دو تین بچے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا بچے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہئیں تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔

اسی طرح آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہیئے۔

مردوں کے لیے دُبلا ہونے کا طریقہ ملاحظہ ہو، عظمت کا راز۔

خواتین کے لیے دُبلا ہونے کی ترکیب آج سے مندرجہ ذیل پرہیزی غذا شروع کر دیجئے۔

ناشتے پر ـــــ ایک اُبلا ہوا انڈا، بغیر دودھ اور شکر کی چائے۔

دوپہر کو ـــــ اُبلی ہوئی سبزی، بغیر شوربے کا تھوڑا سا گوشت، ایک چپاتی۔

سہ پہر ـــــ ایک بسکٹ، بغیر دودھ اور شکر کی چائے۔

رات کو —— اُبلا ہوا گوشت، سبزی، ڈیڑھ چپاتی، پھل، بغیر دودھ اور شکر کی کافی۔ (اس پرہیزی غذا کے علاوہ ساتھ ساتھ باورچی خانے میں نمک چکھنے کے سلسلے میں پلاؤ، مرغن سالن اور پراٹھے، البتہ چکھتے وقت حلوہ، کھیر، فرنی۔ یہ بلی تو نہیں تھی کہ بہانے بالائی، دودھ اور مکھن۔ دکھاتو سہی تو کیا کھا رہا ہے، کے بہانے بچوں کے چاکلیٹ اور مٹھائیاں)

بعض اوقات اس پرہیزی غذا کا اثر نہیں ہوتا، تعجب ہے؟

مردوں کے لیے موٹا ہونے کا نسخہ بھینس رکھنا، دفتر کی ملازمت، دوپہر کے کھانے کے بعد دہی کی لسی اور قیلولہ۔ سارے کھیل چھوڑ کر صرف شطرنج اور تاش کھیلیے اور اگر آؤٹ ڈور گیم ہی کھیلنا ہو تو بیڈمنٹن کھیلیے، بس۔

خواتین کے موٹا ہونے کی ترکیب کسی ترکیب کی ضرورت نہیں، اس سلسلے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

تسخیرِ حُب تعجب ہے کہ ایسے اہم موضوع پر اس قدر کم لکھا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ماہرین تسخیرِ حُب سب کچھ صیغۂ راز میں رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھی اس قسم کے اشتہار چھپتے ہیں۔

محبت کے ماروں کو مژدہ!

محبوب ایک ہفتے کے اندر اندر قدموں میں نہ لوٹنے لگے تو دام واپس!

اس کے علاوہ امتحان میں کامیابی، اولاد کی طرف سے خوشی، خطرناک بیماریوں سے شفا، مقدمہ جیتنا، تلاش معاش، افسر کو خوش کرنے کے وعدے بھی ہوتے ہیں۔ اشتہار میں ایک مونچھوں والے یا داڑھی والے چہرے کی تصویر، کئی سندیں اور سرٹیفکیٹ ہوتے، لیکن اس سلسلے میں نہ کتابوں میں کچھ موجود ہے نہ رسائل میں۔ ادھر ہمارے ملک میں تسخیرِ حُب کی قدم قدم پر ضرورت محسوس ہوتی ہے، ہر شخص اس چشمۂ

حیواں کی تلاش میں ہے، اگرچہ مصنف کی معلومات اس موضوع پر نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم اس نے جگ بیتی سے چند مفید باتیں اخذ کی ہیں۔

سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ چاہنے والا مرد یا عورت اور ادھر محبوب کا تعلق کس جنس سے ہے۔ لہٰذا سہولت کے لیے ان ہدایات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

یعنی ۱۔ اگر محبوب عورت ہو۔

۲۔ اگر محبوب مرد ہو (اور صنفِ نازک کے کسی فرد کو اس میں دلچسپی ہو)

۳۔ اگر محبوب شادی شدہ ہو (فریفتہ ہونے والا مرد ہو یا عورت)

۱۔ اگر محبوب عورت ہو

محبوب چنتے وقت یہ احتیاط لازم ہے کہ رشتہ داروں پر ہرگز عاشق نہ ہوں اس کے بعد اردگرد اور پڑوس میں رہنے والوں سے بھی حتی الوسع احتراز کریں۔ (یہ تجرباتی فارمولے ہیں اور طالبِ حُسب کو وجہ پوچھے بغیر ان پر اندھادھند عمل کرنا چاہیئے۔)

محبوب سے ملاقات کے لیے جاتے وقت پوشاک سادہ ہو (رومال پر خوشبو نہ چھڑکیے۔ کہیں محبوب یا آپ کو زکام نہ ہو جائے) خوراک سادہ ہو (پیاز اور لہسن کے استعمال سے پرہیز کیجیے) مونچھوں کو ہرگز تاؤ نہ دیجیے، ورنہ محبوب خوف زدہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی فی زمانہ بنی سنوری مونچھوں کا اثر طبعِ نازک پر کوئی خاص اچھا نہیں پڑتا (اس کا فرمائشی مونچھوں پر اطلاق نہیں ہوتا) اگر محبوب کو آپ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تو استقبال یوں ہوگا۔ تشریف آوری کا شکریہ۔ بڑی تکلیف کی آپ نے بھائی جان ابھی آتے ہی ہوں گے۔ آپ بیٹھیے، میں دادا جان کو ابھی بھیجتی ہوں"۔ لیکن اگر محبوب کو محبت ہے تو وہ بھاگا بھاگا آئے گا اور آپ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہے گا ــــ ہلو جی! (یا اسی قسم کا کوئی اور مہمل جملہ استعمال کرے گا۔)

محبوب کو یکسانیت سے بور مت کیجیے، ہر اتوار کو ملتے ہوں تو تیسری مرتبہ منگل کو ملنے جایئے اگلی مرتبہ جمعے کو، بلکہ ایک ٹائم ٹیبل بنا لیجیے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ عورتوں کو سنجیدہ مرد اس لیے پسند آتے ہیں کہ انہیں یونہی وہم سا ہو جاتا ہے کہ ایسے مردوں کی باتیں سن رہے ہیں۔ لہٰذا تسخیرِ محبوب کرتے وقت "گفتگو کا فن" میں جو کچھ لکھا ہے اسے محبوب کے لیے نظر انداز کر دیجیے۔ نہ صرف محبوب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہیے، بلکہ اسے یقین دلا دیجیے کہ دنیا میں فقط آپ ہی ایسے شخص ہیں جن کے لیے محبوب کی ہر الٹی سیدھی بات ایک مستقل وجۂ مسرت ہے۔

محبوب سے زیادہ بحث مت کیجیے، اگر کوئی بحث چھڑ جائے تو جیتنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ محبوب کی رائے سے متفق ہو جایئے اور ذرا جلدی کیجیے۔ کہیں محبوب دوبارہ اپنی رائے نہ بدل لے۔

اگر محبوب آپ کی ہر بات پر مسکرا دے اور لگاتار ہنستا رہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نفیس دانتوں کی نمائش کر رہا ہے۔ ایسے موقعے پر محبوب سے پوچھیے کہ وہ کون سی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہے۔

اگر محبوب اپنی تعریفیں سن کر ناک بھوں چڑھائے اور ہٹیے بھی ــــ وغیرہ کہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ مزید تعریف چاہتا ہے۔

محبوب کے میک اپ پر بھول کر بھی نکتہ چینی نہ کیجیے، شاید وہ چہرہ اس لیے سرخ کرتا ہو کہ یہ پتہ نہ چل سکے کب شرما گیا (فقط اس صورت میں اعتراض کیجیے جب کہ محبوب کا رنگ خدانخواستہ قدرتی ہو، اگرچہ گرم خطوں میں ایسے محبوب بافراط پائے جاتے ہیں۔)

ویسے ہر قسم کی تنقید سے پرہیز کیجیے۔ جو لوگ زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ محبوب ان سے زیادہ بیزار ہو جاتا ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد محبت میں ان کی حیثیت وہی ہو جاتی ہے جو ٹینس میں مارکر کی۔

دو باتوں سے محبوب از حد مسرور ہوگا، ایک تو یہ کہ کوئی اُس سے کہہ دے کہ اس کی شکل کسی ایکٹرس سے ملتی ہے دوسرے یہ کہ اس کی جو رقیب ہے، وہ تو یونہی انٹلکچوئل سی ہے۔

محبوب کی بہن (اگر بہن کی عمر پندرہ اور پینتالیس کے درمیان ہو) کے سامنے محبوب کی کبھی تعریفیں مت کیجیے ورنہ نتائج بڑے حیرت انگیز نکلیں گے اور اگر محبوب کے عیب معلوم کرنے ہوں تو اس کی سہیلیوں کے سامنے اسے اچھا کہہ کر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے۔ کبھی چھپ کر محبوب کو کسی سے لڑتے ہوئے ضرور دیکھیے یا محبوب کو کسی سے لڑوا دیجیے۔ بہت سی لرزہ خیز چیزوں کا انکشاف ہوگا۔

اگر محبوب کئی مرتبہ جتائے کہ آپ آج کل نوعمر لڑکے نظر آ رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔

یاد رکھیے کہ محبوب کی نگاہوں میں ایک چالیس برس کا نوجوان ایک تیس سالہ بوڑھے سے کہیں بہتر ہے (اور ایسے بوڑھے ان دنوں کافی تعداد میں ہر جگہ ملتے ہیں)

محبوب کی سالگرہ یاد رکھیے، لیکن اس کی عمر بھول جائیے۔

بعض اوقات محبوب کو آپ کے احسانات یاد نہیں رہتے، لیکن وہ فرمائشیں کبھی نہیں بھولتیں۔ جنہیں آپ پورا نہ کر سکے۔

اوائل محبت میں محبوب سے یہ پوچھنا کہ کیا اسے آپ سے محبت ہے — ایسا ہی ہے جیسے کسی ناول کا آخری باب پہلے پڑھ لینا۔

تنگدستی محبت کی دشمن ہے۔ ایک قیمتی تحفہ منٹوں میں وہ کچھ کر سکتا ہے جو شاعر مہینوں میں نہیں کہہ سکتے۔

اگر محبوب کسی اور پر عاشق ہے تو سب کوششیں رائیگاں جائیں گی، ایسی حالت میں برابر برابر چھڑوا دینے والے مقولے پر عمل کیجیے، اور ریٹائر ہو جانا بہتر ہوگا اور اگر محبوب کسی اور کی جانب ملتفت

بھی نہیں، لیکن آپ کے سب حربے بے کار نظر آنے لگیں تو یہ نہ سمجھئے کہ محبوب سنگدل یا ناقابل تسخیر ہے وہ فقط تجربہ کار ہے۔ احتیاطاً یہ ضرور معلوم کر لیجئے محبوب نے اپنے سابقہ چاہنے والوں سے کیا سلوک کیا تھا، وہی سلوک دوہرایا بھی جا سکتا ہے اور غالباً دوہرایا جائے گا۔

یہ ہمیشہ یاد رکھیے کہ جیسے جیسے محبوب کی عمر بڑھتی جائے گی، وہ بالکل امی کی طرح ہوتی چلی جائے گی۔

۲۔ اگر محبوب مرد ہو

محبوب میں سب سے پہلی چیز یہ نوٹ کیجئے کہ آیا وہ آپ کو نوٹ کر رہا ہے یا نہیں۔

محبوب سے نہ کبھی مذہب پر بحث کیجئے نہ روس پر، بلکہ اس سے یہ بھی مت پوچھیے کہ وہ کماتا کیا ہے۔

محبوب کے سامنے کبھی کسی عورت کی برائی مت کیجئے، اس سے وہ بیحد متاثر ہوگا۔

محبوب سے یہ ہرگز مت پوچھیے کہ اس نے مصنوعی دانت کب لگوائے ہیں۔

یہ یاد رکھیے کہ ایک حسین عورت کی سب عورتیں دشمن ہیں اور آن کا سمجھونہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا محتاط رہیئے۔

محبوب کی تعریف کرتے وقت وضاحت سے کام لیجئے، یہ نہیں کہ آپ خوب ہیں، آپ وجیہہ ہیں لاکھوں میں ایک ہیں، بلکہ آپ کا ماتھا کشادہ ہے، بال گھنگھریالے ہیں، شانے ماشاءاللہ مردوں جیسے ہیں

جو مرد اپنی مونچھوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ خود پسند ہوتے ہیں، لیکن جو شیو کرتے ہیں وہ بھی کم خود پسند نہیں ہوتے۔

اگر محبوب کلب سے پی کر آیا ہو تو کبھی مت جتلایئے، صرف یہ کہہ کر منہ بنا لیجئے کہ آج آپ نے جنجر پی ہے، اس سے وہ اس قدر خوش ہوگا کہ بیان سے باہر ہے۔

محبوب کے ساتھ کہیں بھاگ جانے کے خیال کو کبھی دل میں نہ لایئے۔ کسی کے ساتھ بھاگنا بے حد فضول

حرکت ہے۔

اگر محبوب گنجا ہو تو نہ اس کی بلند پیشانی کا ذکر کیجیے نہ اس کے سر کی طرف دیکھیے۔

مرد اپنی محبت کا واسطہ دے کر پرانی محبتوں کے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ انہیں کچھ نہ بتایئے ورنہ پچھتانا پڑے گا۔

آپ کی باتیں خواہ کتنی ہی بے جا کیوں نہ ہوں تب تک بے جا ہیں جب تک آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ لہٰذا پیشتر اس کے کہ محبوب کو پتہ چل سکے کہ کیا ہو رہا ہے آپ رو دیجیے۔ اپنی رقیبوں سے خبردار رہیے۔ محبوب جن عورتوں کے متعلق باتیں کرتا رہے۔ ان کی پرواہ نہ کیجیے۔ لیکن جب وہ کسی عورت کے ذکر سے جان بوجھ کر گریز کرے تو سمجھ جایئے کہ دال میں کالا ہے۔

یہ تو ناممکن ہے کہ آپ اپنے دل کا راز کسی اور کو نہیں بتائیں گی، لیکن بتاتے وقت فقط یہ مت کہیے۔ "تمہیں قسم ہے جو کسی اور سے کہا"۔ اس سے سننے والی کو فوراً شبہ ہوگا اور وہ اسی وقت سب سے کہہ دے گی۔

محبوب آپ کی تازہ ترین تصویریں مانگے گا۔۔۔ رسماً، اخلاقاً یا محبت سے لیکن جب وہ آپ کی بچپن کی تصویر مانگے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بہت دور کی سوچ رہا ہے اور اب کچھ ہو کر رہے گا۔

شروع شروع میں محبوب کو آپ کے چچے، ماموں، بھائی وغیرہ اچھے نہ لگتے ہوں، تو کچھ دیر انتظار کیجیے۔ آہستہ آہستہ وہ خود سیدھا ہو جائے گا۔

عقل مند محبوب کو قابو میں رکھنا زیادہ مشکل نہیں، لیکن اگر محبوب بیوقوف ہو تو ذہین سے ذہین عورت کے لیے بھی اسے ہاتھ میں رکھنا محال ہوگا۔

۳۔ اگر محبوب شادی شدہ ہو

(یہ موضوع بیحد ضروری ہے، کیونکہ آج کل شادی شدہ محبوب سے عشق کرنا نہ صرف عام ہو گیا

بلکہ فیشن میں شامل ہے۔ روز بروز اس کی اہمیت ہر خاص و عام پر واضح ہوتی جارہی ہے۔)

چونکہ شادی شدہ محبوب مقابلتاً تجربہ کار ہوتا ہے۔ اس لیے بڑے احتیاط کی ضرورت ہے ان ہدایات پر بڑی سنجیدگی سے عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر شبہ ہو جائے کہ کسی ہدایت کو محبوب سے پہلے سے جانتا ہے، تو اسے وہیں ترک کر دیجئے۔ (ہدایت کو) اور دوسری پر عمل کیجیے۔

شادی شدہ محبوب کو مسخر کرنے کے لیے سب سے اہم چیز نہ حسن ہے نہ قابلیت ——— بلکہ پراپیگنڈا ہے۔ لہٰذا تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد اپنے متعلق کوئی خبر اڑا دیجئے۔ کہ آپ کا ارادہ ولایت جانے کا ہے۔ کبھی کلاسیکل ڈانس سیکھنے کے منصوبے باندھیئے تو کبھی اردو میں ایم۔ اے کرنے کی خبر مشہور کر دیجئے۔

پہلے محبوب منتخب کیجیے پھر اسے چند فالتو خواتین و حضرات کے ساتھ مدعو کیجیے ——— پک نک۔ ادبی محفل۔ برج یا کسی اور بہانے سے۔ آہستہ آہستہ دوسروں کو نکالتے جائیے حتیٰ کہ صرف آپ اور محبوب باقی رہ جائیں۔ (اس طرح محبوب کو شبہ نہیں ہوگا۔ شبہ ہوا بھی تو دیر میں ہوگا۔)

محبوب سے اس کی نقل و حرکت کے بارے میں سوالات مت پوچھیئے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر الٹی ہمدردی جتائیے۔ اسے وہم ہو جائے گا کہ صرف آپ ہی نے اسے سمجھا ہے۔

بہتر تو یہ ہوگا کہ ایک وقت میں کئی جگہ کوشش کیجیے۔ اگر کامیابی دس فی صد بھی ہوئی تب بھی ناتسلی بخش نہیں۔

کچھ ایسا انتظام کیجیے کہ محبوب ہر وقت آپ کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا رہے۔ مثلاً کھوئی کھوئی نگاہوں سے خلا میں تکا کیجیے۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد ٹھنڈے سانس لیجیے۔ وہ بار بار پوچھے گا۔ کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟

اپنے یا محبوب کے شریکِ حیات کا ذکر بالکل نہ آنے دیجئے۔ یوں ظاہر کیجیے جیسے اس دنیا میں نہ آپ

کا کوئی ہے نہ اس کا۔

اگر محبوب بے رخی برتتا ہو تو اس کا خوب تعاقب کیجئے ۔۔۔ بار بار فون کیجئے ۔۔۔ ملنے جائیے ۔۔۔ سندیسے بھیجئے ۔۔۔ خط لکھئے ۔۔۔ کسی دن وہ اتنا تنگ آئے گا کہ آپ پر عاشق ہو جائے گا۔ الماریوں میں چند اوٹ پٹانگ ضخیم کتابیں، دیواروں پر ماڈرن آرٹ کی بے تکی تصویریں اور کمرے میں ستار یا ڈائمن ضرور رکھئے۔ خواہ آپ کو ان سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ محبوب یہ سمجھے گا کہ آپ کی طبیعت فن کارانہ ہے۔

تقریبوں اور پارٹیوں میں ذرا دیر سے جائیے تاکہ لوگ پوچھیں کہ یہ کون ہے؟ بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ چنئے جہاں مناسب روشنی اور موزوں لوگ ہوں۔

اگر شریکِ حیات ساتھ ہو تو سب کے سامنے اسے کبھی "ڈارلنگ" مت کہئے، بلکہ پبلک میں اس کا نوٹس ہی نہ لیجئے۔

اپنے بچے کو کبھی ساتھ مت لے جائیے۔ ایک بچے کی موجودگی سارے حسن و جمال کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے۔ محبوب کے بچوں کو بھی لفٹ نہ دیجئے۔

ذرا سے جھوٹ عجب دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے کہ بچپن میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھا جاتا ہے شادی سے پہلے اسے ایک خوبی تصور کیا جاتا ہے، محبت میں اسے ایک آرٹ کا درجہ حاصل ہے اور شادی کے بعد جھوٹ کی پختہ عادت پڑ جاتی ہے۔

عینک کبھی مت لگائیے خواہ ایک فٹ سامنے نہ دکھائی دیتا ہو، مگر ذرا سنبھل سنبھل کر چلئے راستے میں گڑھے بھی ہوتے ہیں۔

دعوتوں پر یا تو کھانا کھا کر جائیے یا واپس آکر کھائیے۔ کم خوراک ہونا بلند مذاقی کی نشانی ہے۔

افواہوں میں خاص دلچسپی لیجئے۔ اگر محبوب کو سنانے کے لیے نئی نئی افواہیں آپ کے پاس ہوئیں تو وہ باقاعدگی سے سننے آئے گا۔

اگر لوگ آپ کے یا محبوب کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو ذرا خیال نہ کیجیے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں میں برائیاں نہیں ہوتیں ان میں خوبیاں بھی بہت کم ہوتی ہیں۔ تبھی سارے دلچسپ لوگ بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

محبت ختم کرتے وقت ہرگز مت لڑیئے۔ خدا جانے کل کلاں کہیں سابق محبوب ہی سے واسطہ نہ پڑ جائے۔

آخر میں مصنف سفارش کرے گا کہ کبھی کبھی اپنے رفیقِ حیات سے بھی تھوڑی سی محبت کر لیا کیجیے۔ اس کا بھی تو آپ پر حق ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور مفکر نے کہا ہے کہ اپنے رفیقِ حیات سے محبت کرنا محبت نہ کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

چند جنرل ہدایات

محبوب سے تبھی ملیے جب اس کی صحت اچھی ہو (اور آپ کی بھی) دانت یا سر کے ذرا سے درد سے دنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ حسین اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے سادہ شکل والے۔ آخر الذکر چھپے رستم ہوتے ہیں، یہ ہمدردی جتاتے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ احسانوں سے زیر بار کر دیتے ہیں۔ نشانہ درست کر کے پھر وار کرتے ہیں، لیکن حسین اپنے آپ ہی میں گم رہتے ہیں، انہیں آئینہ دیکھنے اور کپڑے سلوانے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ذہین انسان بڑی مشکلوں سے عاشق ہوتے ہیں —— ان کے خیال میں محبت تخیل کی فتح ہے —— ذہانت پر۔

محبوب ایک دوسرے سے اس لیے بور نہیں ہوتے کہ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے متعلق باتیں کرتے رہتے ہیں

(محبت کی شادی کے ذکر سے قصداً گریز کیا گیا ہے کیونکہ یہ جُدا موضوع ہے، لیکن علماء کا قول ہے کہ جہاں محبت اندھی ہے وہاں شادی ماہرِ امراضِ چشم ہے)

نوٹ :۔ اگر اس مضمون سے ایک کا بھی بھلا ہو گیا تو مصنف سمجھے گا کہ اس کی ساری محنت بالکل رائیگاں گئی۔

شیطان عینک اور موسمِ بہار

بہار آگئی۔ ولائتی سینٹ مہکے، کمپنی باغ میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں، پژمردہ چہروں پر یک لخت سے تازگی آگئی۔ مسرت و شادمانی کی لہر سول لائنز کے گوشے گوشے میں دوڑ گئی۔ سڑکوں پر پیراشوٹ کے کپڑے کے رنگین ملبوس دکھائی دینے لگے۔

جب قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ انگڑائی لے کر اٹھی تو شیطان کی عینک کھو گئی۔

شیطان کی عینک ایسی ویسی عینک نہیں جسے ہر عینک ساز مہیا کر سکے۔ ان کی عینک کے شیشوں کے افقی رخ میں بھی کئی نمبر ہیں اور عمودی رخ میں بھی۔ چنانچہ کچھ شمال شمال مشرق اور جنوب مغرب جنوب کی قسم کے شیشے ہیں۔

ایسی پیچیدہ عینک کا جلد ملنا محال تھا۔ لہٰذا شیطان بغیر عینک کے دکھائی دیئے جانے لگے۔

جج صاحب نے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب متعجب ہوئے سوائے شیطان کے۔ شیطان

کا خیال تھا کہ لوگ بڑی تیزی سے ولایت جا رہے ہیں۔ ان دنوں تو یہ رفتار اتنی تیز ہو چکی ہے کہ کسی کے ولایت جانے پر ذرا حیرت نہیں، حیرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ فلاں شخص اب تک ولایت کیوں نہیں گیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ ہر شخص اللہ کو پیارا ہونے سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ ولایت ضرور ہو آئے گا۔

ویسے جج صاحب کے جانے نہ جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ فکر تھا تو رضیہ کا۔ اگر وہ ساتھ چلی گئی، تو بہت برا ہوگا۔ شیطان کا تو بہت ہی برا حال تھا، کیونکہ وہ رضیہ پر دوبارہ فریفتہ ہوئے تھے۔ ہوا یوں کہ وہ تقریباً دو سال تک رضیہ سے نہ مل سکے۔ جب وہ باہر سے آتے، تو جج صاحب کا کنبہ کہیں چلا جاتا، جب کنبہ آتا تو شیطان کہیں اِدھر اُدھر ہوتے۔ پورے دو سال کے بعد وہ چاؤ پر رضیہ سے ملے۔ میں نے دونوں کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ جج صاحب کے ساتھ ولایت جا رہی ہے۔ بڑی رسمی قسم کی گفتگو ہوئی۔ شیطان نے پوچھا۔ آپ کے مشغلے کیا ہیں؟ آپ کے محبوب ایکٹر اور پسندیدہ مصنفین کون کون سے ہیں، روس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، آپ شام کو کیا کیا کرتی ہیں۔ بی۔ اے میں آپ کے مضامین کیا تھے، آپ کو شلوار پسند ہے یا غرارہ۔ ماآلڈس ہکسلے اور جیمز جوائس کی کون کون سی کتابیں آپ نے نہیں پڑھیں ____؟

اگلے دن شیطان نے بیان دیا کہ جمعے کی سہ پہر کو چار بج کر پچپن منٹ سے وہ رضیہ پر نئے سرے سے دوبارہ عاشق ہو گئے ہیں۔

ان کی حالت اس قدر مخدوش ہو چکی تھی کہ میں سچ مچ ان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ میں دستبردار کیوں ہوا؟ شاید یہ قربانی کا جذبہ تھا، جذبۂ ترحم تھا یا وہ لافانی فوق البشر آسمانی جذبہ جو انسان کے دل میں کبھی کبھی آتا ہے جو روح کو لامتناہی وسعتوں میں لے جاتا ہے جو انسان کو فرشتوں میں لا کھڑا کرتا ہے، جذبہ جو۔ وغیرہ وغیرہ۔

دستبردار ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی ــــ مجھے یقین تھا کہ چاہے شیطان کچھ کر لیں رضیہ ان کی جانب کبھی ملتفت نہ ہوگی، بنے گا کچھ بھی نہیں۔

شیطان تو عاشق ہو گئے، لیکن رضیہ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ ویسے رضیہ کا رویہ ہم سب کے متعلق عجب مولویانہ سا تھا۔ اسے کسی سے محبت ہوتی تھی نہ نفرت۔

شیطان نے مجھے فون کیا اور چار پر ایک کیفے میں بلایا۔ پوچھا کہ اور کون ہوگا، یونہی ایک آدھ دوست وغیرہ وغیرہ۔ میں کیفے کے دروازے میں داخل ہوا تو یک بیک بلیوں کی چیخیں، کتوں کے رونے کی آوازیں، مرغیوں کی فریادیں ملی جلی سنائی دیں، معلوم ہوا کہ آرکیسٹرا کوئی انگریزی دھن بجا رہا ہے۔ شیطان کو ڈھونڈنا مصیبت ہو گئی۔ جدھر دیکھتا ہوں اجنبی چہرے نظر آتے ہیں۔ آخر انہوں نے خود آواز دی۔ عینک کے بغیر وہ واقعی اجنبی سے معلوم ہو رہے تھے۔ دراصل عینک ان کے چہرے کا جزو بن چکی تھی، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں نے ان کو عینک کے بغیر بھی دیکھا ہو۔ شاید ایامِ طفلی میں بھی وہ عینک لگاتے ہوں گے۔

پوچھا کہ باقی اصحاب کہاں ہیں، انہوں نے اشارے سے بتایا، ایک تو میں ہوں اور یہ تین وغیرہ وغیرہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تین بالکل ایک جیسی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ بالکل ایک جیسی شبیہیں تھیں پہلے تو خیال ہوا کہ کہیں ایک چہرے کا عکس مختلف آئینوں میں تو نہیں پڑ رہا۔ شیطان نے متعارف کرایا ــــ یہ کریمہ ہیں ــــ یہ رحیمہ ہیں ــــ اور سفینہ۔

میرے لیے وہ تینوں بالکل ایک سی تھیں۔ سب سے پہلے نظر عینکوں پر جاتی جو ایک سی تھیں، عینکوں کے عقب میں جو تھوڑے بہت خدوخال دکھائی دیتے، وہ بھی ایک جیسے تھے۔ باوجود انتہائی کوشش کے میں ان میں تمیز نہ کر سکا۔ بار بار ایک ہی لڑکی کے سامنے کیک سرکاتا رہا اور اپنی طرف سے یہی سمجھتا رہا کہ مٹھائی تینوں کو پیش کی تھی۔ ایک لڑکی کو مس زہرہ بھی کہہ گیا جس پر شیطان نے دوبارہ ان کے نام لیے۔ مجھے صرف کریمہ یاد رہا۔ شاید کریمہ یہ بخشائے، بہرحال ما کی وجہ سے کریمہ تینوں میں کم معمولی تھی۔ ویسے وہ حسین ہوتے

ہوتے بال بال بچ گئی تھی۔

آخر میں نے ہمت کی اور تینوں کو مس کریمہ اور سفینہ وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا اور بتایا کہ مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شیطان نے لفظِ مس کئی دفعہ دہرایا اور بولے ـــــ جانتے ہو دنیا میں عورت یا تو ـــــ ہوتی ہے ـــــ اور یا پھر مس۔

چاء کے بعد شیطان انہیں چھوڑنے چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا ان کے نام یاد کرتا رہا۔ دفعتاً کوئی شخص زور زور سے نمکین پانی کے غرارے کرنے لگا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا ریڈیو پر پکا گانا ہو رہا تھا۔ شیطان نے واپس آکر کہا "اب تمہارے ذمے تین لڑکیاں ادھار ہیں"۔ انہوں نے میری رائے طلب کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ عینک لڑکیوں سے آج تک میرا واسطہ نہیں پڑا اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر اس صورت میں جب کہ شیطان کی ایک عینک کزن کسی کالج میں استانی ہیں۔ البتہ ایک شعر میں نے کہیں سے سنا تھا۔

اگرچہ عینکوں سے فرق کچھ اتنا نہیں پڑتا
معنک لڑکیوں پر لوگ عاشق کم ہی ہوتے ہیں

لیکن ان کا خیال تھا کہ عینک لڑکی کا زیور ہے۔ عینک کو معنوی حسن کا درجہ دیا گیا ہے۔ کئی چہرے تو عینک کے بغیر اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ چہرے نہیں تھے۔ دراصل وہ چہرے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مختلف کالجوں میں پڑھتی ہیں، مہینے میں پندرہ دن ہوسٹلوں میں رہتی ہیں اور پندرہ دن گھر۔ ان سے واقفیت بھی خوب ہوئی۔ موسم بہار کی آمد پر ابھی شیطان کی عینک کو گم ہوئے چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ انہوں نے سینما میں اپنی ان کزن کو دیکھا جو استانی ہیں۔ وہ ایک گوشے میں بالکل اکیلی بیٹھی تھیں۔ یہ ان کے پیچھے جا بیٹھے پہلے گلا صاف کیا، گنگنا رہے۔ پھر ایک ترقی پسند سا شعر پڑھا، مگر وہ خاموش۔

رہیں۔ انہوں نے عینک کے شیشے صاف کرنے کا مشورہ دیا کہ میلے ہو رہے ہیں۔ وہ چپ رہیں۔ یہ شکایتیں کرنے لگے کہ ہفتے ہو جاتے ہیں اور تم نہیں ملتیں۔ ہم بلاتے ہیں تو انکار ہو جاتا ہے۔ خود اکیلی سینما آجاتی ہو۔ پہلی تاریخیں ہیں۔ تمہیں تنخواہ مل ہوگی۔ دیکھیں تمہارا بٹوہ۔

جب شیطان نے بٹوے پر ہاتھ ڈالا تو چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ آس پاس کے لوگ دیکھنے لگے آخر فتح شیطان کی رہی اور انہوں نے بٹوہ چھین لیا۔ اب جو قریب سے انہیں دیکھتے ہیں، تو وہ کوئی اور تھیں۔ بڑے شرمندہ ہوئے جو معافی مانگنی شروع کی تو انہیں فلم بھی نہ دیکھنے دی۔ پکچر ختم ہوئی تو انہیں گھر چھوڑنے گئے اور دوستی ہو گئی۔ یہ تھی کریہ جس کی بائیں آنکھ پر شیطان بری طرح فریفتہ ہو گئے تھے کیونکہ وہ اکثر شیطان کی دائیں طرف بیٹھتی اور وہاں سے بائیں آنکھ مقابلتاً قریب ہوتی۔

ایک روز شیطان کافی ہاؤس میں تھے کہ دروازہ کھلا، کریہ آئی اور شیطان کے سامنے سے ہوتی ہوتی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ انہیں بہت برا لگا۔ یہ اٹھے اور اسی طرح تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے سامنے جا بیٹھے۔ کچھ اندھیرا سا تھا انہوں نے خفگی کا اظہار کیا اور کہا کہ لڑکیوں کو آداب بالکل نہیں آتے۔ اگر باتیں کرنا نہیں چاہتی تھیں تو کم از کم ہیلو ہی کہہ دیتیں۔ اسی طرح تو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جب اچھی طرح خفا ہو چکے تو معلوم ہوا کہ یہ کریہ نہیں تھی کوئی اور معنک لڑکی تھی۔ شیطان نے بڑی خوشامدیں کیں۔ بات بات پر ہی ہی کرتے رہے۔ بالائی اور کافی منگائی — یہ رحیمہ تھی۔

تیسری لڑکی سفینہ خود کنارے آ لگی اور ایک دن کریہ اور رحیمہ کے ہمراہ چڑیا گھر میں مل گئی۔

"تو سارا قصور تمہاری گمشدہ عینک کا ہے" — میں نے پوچھا۔

"اور موسمِ بہار کا بھی" — وہ بولے۔

میں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو تب تک ملتوی کر دیں جب تک ان کی نئی عینک نہیں آجاتی۔

"عینکیں تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ موسمِ بہار بہت دیر سے آتا ہے"۔ وہ آہِ سرد کھینچ کر بولے" اور پھر رضیہ نے بھی تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں"۔

ہم نے بل منگایا۔ شیطان نے حسبِ معمول بل کا بغور مطالعہ کیا۔ دوبارہ میزان کیا اور ساڑھے تین آنے کی غلطی نکالی۔ بیرہ بل درست کرا کے لایا۔ ہم نے چار آنے طشتری میں چھوڑ دیئے۔ بیرے نے بہت برا منہ بنایا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہوگا کہ شیطان نے آواز دے کر واپس بلا لیا۔ اور چار آنے طشتری سے اٹھا کر جیب میں ڈال لیے۔

ہم باہر نکلے، موٹر سائیکل سنبھالی اور جج صاحب کی کوٹھی کا رخ کیا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ جس طرح ملازمت میں اینٹی ڈیٹ ملتی ہے۔ اسی طرح انہیں بھی وہ کئی سال مل جانے چاہئیں جو انہوں نے رضیہ کے عشق میں پہلے گزارے تھے۔ ان کا عشق تب سے گنا جائے جب وہ پہلی مرتبہ رضیہ پر عاشق ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے کافی سینئر ہو جاتے تھے۔

پھاٹک پر ہمیں ننھا ملا جو غلیل لیے کھڑا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکومت آپا شکار کھیلنے گئی ہیں جج صاحب کے ساتھ — یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ حکومت آپا کی جدائی میرے لیے ہمیشہ مسرت آمیز ہوتی ہے۔

شیطان بولے " کاش، مجھے پہلے پتہ چل جاتا۔ جہاں وہ گئی ہیں وہاں کے جانوروں کو مطلع کر دیتا"۔

ہم نے رضیہ کے متعلق دریافت کیا — "یقین کیجیے بھائی جان، میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ آخر رضو آپا میں ایسی کیا چیز ہے جو آپ دونوں کو پسند ہے۔ کم از کم مجھے تو وہ بے حد معمولی دکھائی دیتی ہیں"۔

"جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے، تو تمہارا معیار یقیناً بدل جائے گا"۔

"مگر میں نے تو عمر بھر ایسی لڑکی نہیں دیکھی جس نے مجھے متوجہ کیا ہو"۔

شیطان ننھے میاں کو دیکھ کر دانت پیستے اور قسم کھاتے کہ اگر وہ کبھی اسمبلی کے ممبر بن گئے تو ایک

قانون نافذ کرائیں گے جس کی رو سے عشاق کو اجازت ہو گی کہ اگر محبوب کا کوئی ایسا چھوٹا بھائی ہو تو اسے جان بحق تسلیم کرا دیں۔

شیطان ان دنوں کچھ حساس سے ہو گئے تھے، بہار آتے ہی وہ حساس ہو جاتے ہیں۔

بیگم ملیں۔ "سناؤ بچو کیسے ہو ـــــ تمہاری موٹر سائیکل کیسی ہے؟"

"جی خدا کے فضل سے اچھی ہے اور آپ کی خیریت کی طالب ہے۔"

"بھائی جان آپ کی موٹر سائیکل کی طاقت کتنی ہے؟"

"ڈھائی ہارس پاور۔"

"یعنی دو گھوڑے اور ایک بچھیرا۔ لیکن جس روز میں اس پر سوار ہوا تو ساڑھے تین ہارس پاور کی ہو جائے گی۔ امی جان ہارس پاور کا ترجمہ کیجیے۔"

"مجھے کیا پتہ کہ یہ کم بخت پاورساؤس کیا بلا ہے۔"

"قوتِ اسپ ـــ" ننھا سینہ پھلا کر بولا۔

"یہ دن بدن شرارتی ہوتا جا رہا ہے۔ آج یہ کہیں سے ایک چھوٹا سا بچے کا بکرا پکڑ لایا جو ادھم مچایا ہے تو خدا کی پناہ ـــ"

بیگم نے ذرا دوسری طرف دیکھا اور شیطان غائب تھے۔

"امی جان۔ ایف۔ اے خان صاحب کی موٹر آئی ہے۔"

یہ ایف اے خان شاید کوئی فقیر احمد یا فدا احمد وغیرہ تھے۔ ان پر ننھے میاں خاص طور پر مہربان تھے۔ ہر ملاقات پر سلام کے بعد سوال ہوتا۔ "چچا جان آپ برسوں سے ایف اے خان کیوں ہیں۔ لوگ ایم اے ہو گئے ہیں۔ آپ بی اے خان تک نہیں ہوئے۔"

"مسز خان بھی آئی ہوں گی۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ اتنی دیر تم ننھے کو پڑھاؤ، اس کا سبق بھی سننا،

یہیں بیٹھے رہو۔ باہر مچھلیاں اور مکھ بہت ہیں۔"

سب سے پہلے ننھے میاں نے اپنی تازہ ترین تھیوریاں پیش کیں کہ دراصل آسمان ایک سیاہ خول ہے جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں، اس خول کے پیچھے نہایت تیز روشنی رہتی ہے ہم ان سوراخوں کو ستارے سمجھتے ہیں۔ یہ ہوائی جہاز والے اگر زیادہ اونچے چلے گئے، تو خول سے ایسے ٹکرائیں گے کہ دھم سے آواز آئے گی اور سب کا انتقال ہو جائے گا اور یہ کہ کششِ ثقل کے بالکل الٹ ایک اور کشش ہے جو انسان کو آسمان کی طرف کھینچتی ہے۔ اس کا نسخہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا جس روز دریافت کر لیا گیا۔ سفر میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ لوگ شہروں سے آسمان کی طرف اڑ جایا کریں گے۔ نیچے زمین گردش کرتی رہے گی۔ اور وہ شہر دور چلا جائے گا۔ جب نیا شہر آنے والا ہوگا۔ تو مخالف گیئر لگا کر کششِ ثقل کے ذریعے نیچے اتر آیا کریں گے۔"

اس کے بعد وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ انسان اپنا توازن کس طرح قائم رکھتا ہے۔ اگر پونے چھ فٹ لمبے لٹھ کو زمین پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ فوراً گر پڑتا ہے، لیکن انسان کھڑا رہتا ہے اور نہیں گرتا۔ انہیں یہ بات بھی حیرت میں ڈالتی تھی کہ پانی پت کی لڑائیاں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے بغیر کیونکر فتح کی گئیں۔

بڑی مصیبتوں سے میں نے ننھے میاں سے پیچھا چھڑایا۔ دبے پاؤں باغیچے میں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ نہایت سہانا سماں ہے۔ معطر جھونکے چل رہے ہیں، تارے جگمگا رہے ہیں، چاند ابھی نکلا تو نہیں لیکن ارادہ کر رہا ہے۔ فوارے کے سامنے رضیہ اور شیطان یوں پوز کیے کھڑے ہیں جیسے تصویر اتروا رہے ہوں۔

شیطان نے ایک آہ لمبی کھینچی، اتنی لمبی کہ میں حیران رہ گیا۔ بڑے غمگین لہجے میں بولے۔ "ٹوٹنے چمک چمک کے ستارے امید کے —— اک خواب تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوتا رہا۔"

"اک خواب تھا کہ تا بہ سحر دیکھتے رہے۔" رضیہ نے لقمہ دیا اور دونوں روش پر چلنے لگے، وہ میرے قریب سے گزرے۔ یہ شیطان تو اتنے قریب تھے کہ میں چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر گدگدی کر سکتا تھا۔

"جی ہاں بالکل وہی۔ اُف یہ ستارے کتنے اداس ہیں — رات بھر سنسان فضاؤں میں اکیلے ٹمٹماتے رہتے ہیں. میری زندگی بھی ستارے کی طرح اداس اور تنہا ہے۔"

جس جگہ میں چھپا ہوا بیٹھا تھا وہ ایسی تھی کہ اگر ذرا بھی ہلتا تو نظر آجاتا۔ اس لیے میں ان کا تعاقب نہیں کر سکا۔ اب وہ دونوں واپس آرہے تھے رضیہ کہہ رہی تھی۔ "اوّل تو آپ ان سب کو ستارے نہیں کہہ سکتے، ستارے وہ ہیں جو سیاروں کی طرح گردش نہیں کرتے. مثلاً سورج ستارہ ہے. ہر ستارے کے گرد کئی سیارے گھومتے ہیں۔ اجرام فلکی اتنی حسین چیزیں ہرگز نہیں جتنی آپ سمجھتے ہیں ان میں سے اکثر اجاڑ اور بے نور ہیں۔" دونوں دور نکل گئے۔

اس مرتبہ جو لوٹے تو شیطان بڑے پُر درد انداز میں کہہ رہے تھے "خدایا یہ کیا اسرار ہے کہ جس سے محبت کرنے لگو اس کا دل پتھر کی سل بن جاتا ہے۔ بالکل بے حس۔ اس پر اتنا سا بھی اثر تو نہیں ہوتا۔"

جب واپس آئے تو رضیہ کہہ رہی تھی۔ "آپ نے یہ کیا فورڈ فورڈ لگا رکھی ہے۔ فورڈ کا بیوک سے کوئی مقابلہ نہیں۔ فورڈ تو ان کاروں میں سے ہے جنہیں آج خریدا تو دو سال کے بعد کھینچنے کے لیے بیلوں کی جوڑی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

کچھ دیر کے بعد وہ میرے قریب سے پھر گزرے۔ اس مرتبہ شیطان نے رضیہ کی کلائی تھام رکھی تھی۔ اس کی ننھی سی گھڑی کو بالکل آنکھ سے لگا رکھا تھا اور کہہ رہے تھے — "زمین اپنے محور کے گرد تقریباً آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اس لیے اب تک (AERONA UTID) سے اس کا کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔ اب JET PRULSION سے انقلاب آجائے گا اور ہوائی جہاز ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا کریں گے لہٰذا زمین سے آگے نکل جایا کریں گے۔ ہمارے موجودہ وقت کا نظام بے کار ہو جائے گا اور تمہاری یہ پیاری سی گھڑی بھی بالکل بے کار ہو جائے گی۔" اتنے میں جھاڑی میں کسی نے زور سے چھینک ماری۔ پھر ننھے میاں سرپٹ بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے۔

میں اور شیطان موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے ۔ ہوا تیز تھی اور وہ پیچھے بیٹھے تھے اس لیے چلّا چلّا کر میرے کان میں باتیں کر رہے تھے ۔ ننھے میاں کے متعلق بے حد لطیف جذبات کا اظہار ہو رہا تھا ۔

" اس مردود بچّے کو رشوت دینی پڑے گی ۔"

" لیکن اس میں اس کا کیا قصور ـــــ عشق مُشک اور چھینک چھپائے نہیں چھپتے ـــــ یہ بتاؤ کہ آج باتیں کیسی ہوئیں ۔"

" ایک ماڈرن لڑکی کے ساتھ اس سے زیادہ رومانی گفتگو نا ممکن تھی ۔ بس سمجھ لو کہ حالات بڑے امید افزا ہیں ۔"

" اور وہ کریمہ ، نرینہ ، مہینہ ـــ ؟"

" تم نام غلط مت لیا کرو ـــ !"

میں چند دنوں کے لیے باہر چلا گیا واپسی پر مجھے بتایا گیا کہ شیطان دن میں آٹھ دس مرتبہ فون کرتے تھے ۔ جو غریب فون پر بولتا اس پر بے حد خفا ہوتے جیسے وہ جان بوجھ کر میری نقل و حرکت چھپا رہا ہو ۔ معلوم ہوا کہ محض میری وجہ سے ان کی پارٹی ملتوی ہو گئی جس میں وہ تینوں لڑکیاں مدعو ہیں ۔ پوچھا کہ کس تقریب میں ہو رہی ہے ۔ بولے ابھی تو سوچا نہیں ۔ شیطان انہیں اتنی دفعہ مدعو کر چکے تھے کہ تمام معقول بہانے ختم ہو گئے تھے ۔ آخر فیصلہ ہوا کہ جنوبی امریکہ یا شمالی افریقہ کی ایک چھوٹی سی ریاست کو جو خود مختارانہ حقوق ملے ہیں اس خوشی میں ہم ایک شاندار پارٹی دیں ۔

شیطان کی ایسی پارٹیوں سے میں بہت گھبراتا ہوں ایک تو وہ اتنا بڑا ہجوم اکٹھا کر لیتے ہیں کہ کسی جلسے کا شبہ ہوتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ خود آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ دیر سے پہنچتا ہوں ، دور بیٹھتا ہوں ، دوسرے لوگوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں ، پہلے چلا آتا ہوں ، ہر ممکن طریقے سے یہ جتا دیتا ہوں کہ پارٹی سے میرا کوئی تعلق نہیں ۔

چنانچہ میں دیر لگا کر پہنچا۔ شیطان سڑک پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کسی خاص مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کا چہرہ جوں کا توں رہا۔ آنکھیں جس سمت میں تک رہی تھیں۔ اسی سمت میں تکتی رہیں۔ میں سمجھا کہ خفا ہو گئے ہیں۔ قریب گیا۔ پھر بھی وہ اسی طرح ہوا میں دیکھتے رہے۔ میں نے اشارے کیے، ہاتھ ہلائے، سر ہلایا ــــ لیکن کچھ نہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دفعتاً علیل ہو گئے ہوں۔ پھر مجھے ان کی عینک یاد آگئی جس کے بغیر وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ اچھل پڑے۔

جب ہم جلدی جلدی سڑک عبور کر رہے تھے تو شیطان سر کے بل ایک سائیکل میں جا گھسے اتفاق سے سائیکل چل رہی تھی اور اس پر ایک شخص سوار تھا۔ اس نے ایک کلابازی کھائی اور دراز ہونے کے لیے ایسی جگہ چُنی، جہاں پانی ہی پانی تھا۔

شیطان نے بڑے انکسار سے ــــ آئی ایم سوری، کہا اور آگے چل دیے۔ میں نے انہیں روکا۔

"اسے اٹھائیں؟"

"ضرورت تو نہیں۔ میں نے سوری کہہ دیا ہے۔"

"ذرا سہارا دے دیں۔"

"لیکن کہہ تو دیا سوری۔"

"مگر وہ خود نہیں اٹھ سکتا۔"

"تو میں کیا کروں میں نے سوری کہہ دیا ہے۔ اسے اور کیا چاہیئے؟"

ہم کیفے میں داخل ہوئے، باہر پلاٹ میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ لوگوں میں سے گزرتے ہوئے شیطان نے ایک کتے کی دم پر پاؤں رکھ دیا۔ کتے نے ایک عظیم الشان نعرہ لگایا۔ شیطان مڑے، کتے کی طرف جھک کر سوری کہہ دیا۔

میں نے تینوں کو سلام کیا۔ مجھے ان کے نام ابھی تک یاد نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے کوشش شروع کر دی۔ ایک بور ژوا قسم کا کتا کرسی پر آ بیٹھا اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو سونگھنے لگا۔ شیطان نے غالباً اسے ادنیٰ بازاری کتا سمجھ کر زور سے ڈانٹا اور پتھر اٹھانے کی نیت سے ایک ہاتھ زمین کی طرف لے گئے۔ کتا ڈرا بالکل نہیں، اس نے شیطان کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ساتھ کی میز سے آواز آئی۔

"جیکی واپس چلے جاؤ۔"

لڑکیوں نے شیطان کی اس حرکت پر اظہارِ افسوس کیا کہ اتنے اچھے خاندانی کتے کو خفا کر دیا۔ شیطان بولے ـــــ "بات یہ ہے کہ آج تک کوئی کتا میری زندگی میں داخل نہیں ہوا۔"

جب لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں، شور مچا رہی تھیں اور آرکیسٹرا جاز کی گت بجا رہا تھا تو شیطان نے چپکے سے مجھ سے عہد کرایا کہ میں کبھی انہیں عینک کے سلسلے میں نہیں ٹوکوں گا۔ ان کی کمزوری کو صیغۂ راز میں رکھوں گا۔

گفتگو کے موضوع صرف دو تھے۔ پہلا موضوع شادی تھا اور دوسرا موضوع بھی شادی تھا۔ شیطان کریمہ کے ساتھ لگے ہوئے اس کی بائیں آنکھ کو بڑی للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی ـــ "میں تو ایسے شخص سے شادی کروں گی کہ جو دولت مند ہو، صاف گو اور دلبر ہو، صاحبِ عزت و صاحبِ دماغ ہو۔ نمایاں شخصیت کا مالک ہو ـــــ مشہور و معروف ہو۔"

"تم نے دیر لگا دی ـــــ" شیطان بولے۔ "مسٹر چرچل اس شخص کو کبھی کی بیاہا چکی ہیں۔"

"میرا انتخاب آخری ہوگا۔" جیسے انہوں نے شیطان کی بات ہی نہیں سنی۔ "اور جسے میں نے پسند کیا۔ اس کے ساتھ جہنم میں رہنے کو بھی تیار ہوں گی۔"

"تم نے اپنی اور اس خوش نصیب کی منزل خوب چنی ہے۔"

شیطان کچھ اور قریب ہو گئے۔ اتنے کہ جب وہ باتیں کرتے تو کریمہ کی عینک کے شیشے دھندلے ہو جاتے اور اسے بار بار صاف کرنے پڑتے۔

شیطان نے کچھ اور قریب ہو کر بجلی کے ایک بہت بڑے قمقمے کی طرف اشارہ کیا جسے وہ غالباً چاند سمجھے تھے، ہیں نے جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر چاند کی طرف کر دیا جو درختوں سے طلوع ہو رہا تھا۔ انہوں نے چاند کی تعریف کی، نظارے کو سراہا اور کریمہ سے رائے طلب کی۔

"چاند اچھا ہے، تارے بھی بُرے نہیں ہیں، پیسٹری اچھی ہے صرف اس میں مکھن زیادہ ہے۔" جواب ملا۔

شیطان نے بیرے کو بلایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا "یہ آرکیسٹرا والوں کو دے دو، ایسے حسین ماحول میں کوئی اچھا سا والز سننے کو جی چاہتا ہے۔"

"اور آتے وقت کچھ گرم گرم سموسے لیتے آنا۔" ایک لڑکی بولی۔

آرکیسٹرا والے شاید شیطان کے رقعے کے منتظر ہی تھے۔ ابھی بیرہ وہاں تک پہنچا نہ تھا کہ والز شروع ہو گیا۔ شیطان کریمہ کے کچھ اور قریب آ گئے۔

"کیا خیال ہے۔۔۔؟" انہوں نے آگے جھک کر آرکیسٹرا والوں کی طرف اشارہ کیا اور کریمہ کی عینک کے شیشے دھندلے کر دیئے۔

"ذرا نمک زیادہ ہے آپ بھی چکھئے۔۔۔" اس نے طشتری سامنے کر دی۔

ذرا سی دیر میں دوسرا والز بج رہا تھا اور شیطان سفینہ سے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے خاندان کے قصیدے سنا رہی تھی کہ ان کے خاندان میں کوئی ستر فی صدی خان بہادر تھے، بیس فی صدی نوابزادے اور باقی صاحبزادے، بچے یورپین گورنسوں کے ساتھ عمر بھر رہتے تھے۔ لڑکیاں کانونٹ میں پڑھتی تھیں، تعلیم ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی شادی کسی امپیریل سروس والے سے ہو جاتی جو انہیں سیدھا انگلینڈ لے جاتا تھا،

اس کے بعد کیا ہوتا اس کا ذکر اس نے نہیں کیا۔

اس نے شیطان کے آباؤ اجداد میں بھی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے ٹال مٹول کر دی۔ جب اصرار بڑھا تو بولے، جی ہمارا شجرہ نسب صدیوں پہلے لنگوروں سے جا ملتا ہے۔ غالباً ڈارون کی تھیوری ہیں تو آپ کا بھی اعتقاد ہو گا۔ لہٰذا آپ کے بزرگ اور ہمارے بزرگ اکٹھے ہی رہا کرتے تھے۔"

تیسرا دور شروع ہوا اور شیطان رجیمہ کے ساتھ آ بیٹھے۔ کربرا اور سفینہ باتیں آپس میں کر رہی تھیں اور منہ میری طرف کر رکھا تھا۔

میں نے مغز کے کباب ان کی طرف بڑھا کر کہا ــــ "لیجئے دماغ کھائیے"۔

ایک کباب پر تھوڑا سا شوربہ ڈال کر دوسری کی طرف بڑھا دیا۔

وہ کچھ جھجکیں، میں مصر رہا ــــ "کھائیے بھی مغز ــــ آپ تکلف کرتی ہیں"۔

اب ریکارڈ بج رہے تھے کہ روسو نہایت دلکش نغمہ الاپ رہا تھا۔ رجیمہ اور شیطان نہایت ذہین قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔

" اب مجھے ہی لیجئے۔ مجھ پر ایسے دورے اکثر پڑتے ہیں اور میں اس قدر پریشان ہو جاتا ہوں کہ جب سوتا ہوں تو جاگتا رہتا ہوں، بس ایک وہم مجھ پر سوار ہو جاتا ہے کہ میں اتنا عظیم انسان نہیں ہوں، جتنا کہ ہوں"

" کروسو کو بھی احساسِ کمتری تھا، وہ بالکل چھوٹا سا ٹھگنا ہوا آدمی تھا۔ تبھی اس کے گانے میں اتنا سوز ہے، یا تو اس کا گلا اتنا سریلا تھا یا اسے زکام کی شکایت رہتی ہو گی۔ غالباً وہ انگریزی کے بیجے گانے گاتا تھا"

اب سناٹرا کا ریکارڈ بج رہا تھا۔

" یونہی منحنی سا فاقہ زدہ انسان ہے یہ سناٹرا"

" اور مقصود صاحب ــــ ؟" میں نے مقصود گھوڑے کے متعلق پوچھا۔ وہ بھی کبھی کبھی گایا کرتا تھا۔

" آدمی تو فضول سے ہیں، لیکن ان کے پاس کار نہایت عمدہ ہے"۔ سفینہ بولی۔

شیطان کے کان کھڑے ہوئے۔ ان دنوں مقصود گھوڑے سے ان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔

"آپ کے وہ دوست آپ کے ساتھ کبھی نہیں آئے؟" کریمہ نے پوچھا۔

"یہ چاکلیٹ کی پیسٹری نہیں چکھی آپ نے؟" شیطان نے جواب دیا۔

"ان کی کار واقعی نہایت خوب صورت ہے۔ وہ ہمیشہ ہوتے بھی اکیلے ہیں۔"

"بیرہ!" شیطان چلائے ——— "تم کچھ سموسے کھاؤ گی ——؟"

"کافی کھا چکی ہوں۔ چلیے آپ کے لیے کھاؤں گی۔"

"دیر ہوگئی —— کیا وقت ہوگا؟" کریمہ نے پوچھا۔

"دس بجنے میں بیس منٹ ہیں" میں نے بتایا۔

"تو چلیں۔"

"نہیں —— تمہاری گھڑی آگے ہے" شیطان بولے "صرف نو بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔"

جب ہم کیفے سے باہر نکلے، تو شیطان کہیں غائب ہو گئے دیکھا تو ایک اور تانگے میں بیٹھے ہیں چونکہ میں عہد کر چکا تھا کہ ان کی بینائی کا ذکر نہیں کروں گا اس لیے خاموش تھا۔

مقصود گھوڑا اپنی کار میں مجھ سے ملنے آیا اور لڑکیوں سے متعارف ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ شیطان سے پوچھو۔ شیطان بڑے خفا ہوئے کہ خبردار جو کسی نے میری لڑکیوں کی طرف دیکھا بھی ہے تو۔ شاید وہ مقصود گھوڑے کی کار سے گھبراتے تھے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے اور تم اپنا فرض کیوں نہیں چکاتے —— لاؤ کہاں ہیں تین لڑکیاں، کہیں سے تین لڑکیاں ڈھونڈ کر لاؤ۔

ادھر جیسے حادثوں کی بارش شروع ہوگئی اور حادثے موسلا دھار برسنے لگے۔

شام کو کلب گیا دیکھتا ہوں کہ چند فلاسفر قسم کے متفنگ حضرات شیطان کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ ایسی گرما گرم بحث ہو رہی ہے کہ کمرے کا درجۂ حرارت کافی بڑھ گیا ہے۔ ایک صاحب جنہوں نے اپنے آپ کو کامریڈ مشہور

کر رکھا تھا۔ اور شاید کامریڈ تخلص بھی کرتے تھے۔ شیطان کے چہرے میں اپنی عینک ٹھونسے ایک اور کامریڈ کی باتیں کر رہے ہیں جو کسی دوسرے برِاعظم سے تعلق رکھتے تھے۔

"وہ موٹے ہیں اس لیے وسیع خیالات کے انسان ہیں"۔ شیطان بولے۔

"وہ نہایت تجربہ کار انسان ہیں"۔ کامریڈ بولے۔

"اور تجربہ کیا ہے۔ غلطیوں کا دوسرا نام۔ میں تو انہیں اوّل نمبر کا قنوطی انسان سمجھتا ہوں، حالانکہ انہیں انسان سمجھنا بھی زیادتی ہے"۔

"وہ کروڑوں مردوں کے پیش رو ہیں"۔

"یہی تو مصیبت ہے کہ وہ مردوں کا پیش رو ہے اور عورتوں کا پیرو—"

"عورتوں کا پیرو نہیں، عورتوں کے پیرو کہیئے"۔ وہ چلائے۔

"عورتوں کا پیرو—— کا پیرو—— کا پیرو——" شیطان نے میز پر مکا مارا۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور تھر تھر کانپنے لگے۔

"میرے ساتھ ذرا باہر چلو"۔ شیطان ان کی گردن پکڑ کر چیخے۔

ہم انہیں باہر لے آئے۔ روشن سڑکوں سے دور ایک تاریک گوشے میں اس ڈوئل کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ شیطان نے ان کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ کیا تم نے پہن رکھا ہے، اپنی طوطے جیسی ناک پر اسے اتار دو۔ ورنہ میں تمہیں پیٹنے سے انکار کرتا ہوں"۔ انہوں نے عینک زمین پر دے ماری۔

اب لڑائی شروع ہوئی۔ ہم نے ان دونوں کو دور دور لے جا کر چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ غالباً کامریڈ صاحب کی بینائی بھی شیطان کی طرح بیحد کمزور تھی پہلے انہوں نے آستینیں چڑھائیں اور پھر ہوا میں مکے لہراتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ کامریڈ نے دفعتاً ایک نعرہ بلند کیا اور ایک درخت کے تنے کو پیٹ ڈالا۔

مخو
"کدھر دفع ہو گئے ـــــ؟" انہوں نے اپنا سہلاتے ہوئے کہا۔

"اور تم کہاں ہو؟" شیطان بالکل ان کے قریب سے گزرے۔

پھر دیکھتے دیکھتے شیطان تڑپے اور ایک سمت میں بھاگے۔ ہوا میں ایک مکہ جو گھمایا تو اتفاق سے نہ کامریڈ کی کمر میں لگا انہوں نے پیچھے مڑکر اِدھر اُدھر دیکھا اور طیش میں چلائے "یہ مکہ مجھے کس نے مارا ہے؟ تماشائی ایک طرف رہیں، اگر میں نے کسی تماشائی کو شرارت کرتے دیکھ پایا تو برا سلوک کروں گا۔"

ہم میں سے باری باری ہر ایک ان کے قریب سے گزرتا۔ ان دونوں کی توجہ ہماری طرف زیادہ تھی ہر پانچ منٹ کے بعد وہ چلا چلا کر ایک دوسرے سے پوچھتے "تم کہاں ہو" اس کے بعد کبڈی سی شروع ہوجاتی۔ ایک مرتبہ تو وہ مختلف سمتوں میں اتنی دور چلے گئے کہ ہم پکڑ کر واپس لائے۔

غرضیکہ آدھ گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ساری لڑائی میں صرف یک مکا کارآمد ثابت ہوا ـــــ جو شیطان کا تھا اور کامریڈ صاحب کی کمر میں اتفاقاً جا لگا۔

اس کے بعد دیر تک دیا سلائیاں جلا جلا کر کامریڈ صاحب اور شیطان کی عینکیں ڈھونڈتے رہے۔

شیطان بدنام ہوتے جارہے تھے، لوگ شکایتیں کرتے کہ مغرور ہوگیا ہے پہچانتا نہیں، سامنے سے نکل جاتا ہے۔ دیکھ لیتا ہے اور سلام تک نہیں کرتا۔ سلام کا جواب نہیں دیتا۔

گھر میں پردے پر بحث ہو رہی تھی۔ شیطان کا خیال تھا کہ پردہ سرد ملکوں کے لیے نہایت مفید چیز ہے۔ نزلے زکام وغیرہ کے بچاؤ کا نہایت اچھا ذریعہ ہے لیکن گرم ملکوں کے لیے اتنا مفید نہیں۔ گرم ملکوں میں صرف سردیوں میں پردہ کرنا چاہیئے۔ گرمیوں میں ململ کے لباس میں بھی اتنا برا حال ہوجاتا ہے برقع پہن کر نہ جانے کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ جو لوگ پردے کے زیادہ حامی ہیں اور بہت شور مچاتے رہتے ہیں۔ ان سب کو جولائی اگست میں برقعہ پہنا دیا جائے اور ستمبر میں رائے پوچھی جائے۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ شیطان کے خالو آ گئے، وہ کچھ مہینوں سے باہر گئے ہوئے تھے اور کرسی پر جا

بیٹھے۔شیطان نے ان کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولے ـــــ "معاف کیجیے حضرت میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔"

"ضرور دیکھا ہوگا۔"

"آپ کا چہرہ کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔"

"سچ مچ ؟"

"لیجئے سگریٹ پیجئے ـــــ معاف فرمایئے میں چہرے یاد رکھ سکتا ہوں۔نام یاد نہیں رکھ سکتا" شیطان نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور خالو کی طرف سے منہ پھیر لیا۔شیطان کے خالو جو خفا ہوئے ہیں تو بس۔

پھر ایک اور تماشا ہوا۔شام کو شیطان سفینہ کو لینے اس کے گھر گئے اور غلطی سے پڑوس کے کسی ویسے ہی مکان میں جا گھسے۔نمبر تو انہیں نظر ہی نہیں آتے تھے بس اندازاً مکانوں میں چلے جایا کرتے۔ پھاٹک، میدان، برآمدہ۔عبور کرتے ہوئے اندر پہنچے۔ابھی حدود اربعے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے کہ آواز آئی: "کون ہے ؟" اس کے بعد کھسر پھسر ہوئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔شیطان نے اپنی طرف سے سفینہ کی امی کے کمرے کا رُخ کیا جو مقابلتاً محفوظ جگہ تھی۔کمرے کی تصویریں دیکھ کر انہیں شبہ سا ہوا کہ شاید کسی اور کے گھر چلے آئے ہیں۔ایک خوبصورت سی لڑکی کی تصویر دیکھ ہی رہے تھے کہ چنگھاڑ سنائی دی: "اچھا تو تم ہو۔" ایک عمر رسیدہ بزرگ ہاتھ میں لٹھ نما چھڑی لیے داخل ہوئے۔

"تو تم ہی وہ لڑکے ہو جس نے ہم سب کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو ـــــ ؟"

"باہر جانا چاہتا ہوں۔" شیطان ہکّے بکّے رہ گئے۔ انہوں نے بزرگ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم ہر ایک سے کہتے پھرتے ہو کہ تم لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہو۔آج تمہاری یہ ضد بھی پوری ہو جائے گی ـــــ ابے او فضلو! اس مقصود ن کو یہاں۔"

جیسا نام تھا ویسی ہی ایک لڑکی کمرے میں آگئی۔

"لو یہ ہے وہ۔ اب اسے دیکھ لو۔ نیچے کیا دیکھ رہے ہو۔ اس کی طرف دیکھو۔"

شیطان دیکھنے لگے۔

"دیکھ چکے کیا؟"

"اچھا تم جاؤ۔" شیطان چلے گئے۔

نہیں تم نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا ہے اور یہ بتاؤ کہ تم اپنے عزیزوں کی طرف سے پیغام کیوں نہیں بھجواتے۔ یوں بدنام کیوں کرتے پھرتے ہو، اس طرح چوروں کی طرح گھر میں گھسنا شریف آدمیوں کا کام ہے کیا؟

جی آپ کی بینائی کمزور تو نہیں ؟ یا کہیں عینک تو نہیں کھوئی گئی۔"

"اِدھر اُدھر کی باتیں مت کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

"جناب میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں، میں شریف آدمی ہرگز نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو شرابی، کبابی اور جواری ہوتے ہیں۔"

اور ایسے سرپٹ بھاگے کہ دس پندرہ منٹ تک کمروں کے اندر ہی دوڑتے رہے۔ بڑی مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ ملا۔

مجھے سب کچھ سنایا تو میں نے پوچھا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ شیطان نے کہا کہ انگریزی دوائیوں اور دمٹو کی بوتلوں میں الکحل کی ذرا سی مقدار ہوتی ہے۔ کباب ہم خوب کھاتے ہیں اور برج بھی کھیلتے ہیں جو سراسر جُوا ہے۔ لہٰذا ہم سب شرابی، کبابی اور جواری ہیں۔

میں نے بہت مجبور کیا کہ خدا کے لیے کہیں سے عینک لگوا لو اور شریفوں کی زندگی بسر کرنے لگو، وہ ہر بار یہی کہتے کہ تم مجھے بُرا بھلا کہہ لو، ڈانٹ لو، لیکن بس عینک کا ذکر مت کیا کرو، میرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے آخر بڑی بحث کے بعد وہ مانے اور ایک عینک ساز کو نمبر دے آئے۔ اگلے ہفتے ہم عینک لینے گئے۔ دکان میں مجسّمے رکھے تھے جن کے چہروں پر عینکیں لگی ہوئی تھیں۔ شیطان سیدھے ایک بڑے سارے مجسّمے کی طرف گئے۔

اور مسکرا کر بولے "آداب عرض، میری عینک تیار ہو گئی یا نہیں ۔" میں نے جلدی سے ان کا منہ دوکاندار کی طرف کیا جو بالکل دوسری طرف تھا۔

عینک لگا کر وہ ضد کرنے لگے کہ موٹر سائیکل چلائیں گے۔ مجھے پیچھے بیٹھنا پڑا۔ ہم کچھ دور ہی نکلے ہوں گے کہ وہ چلائے۔ ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ موٹر سائیکل جھومی اور بڑے زوروں سے جھاڑیوں میں جا گھسی ہم دونوں دور دور گرے۔ شیطان کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "قبلہ معاف کیجئے۔ میں نے ہارن نہیں دیا تھا۔ ویسے آپ کو فٹ پاتھ پر چلنا چاہیئے تھا۔"

میں نے انہیں ڈانٹا کہ مجھ سے یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو۔ جس سے ٹکرائے ہو۔ اس سے کہو ہم نے اس شخص کو بہت ڈھونڈا جس سے ٹکر لگی تھی، مگر سڑک خالی پڑی تھی۔ غالباً شیطان کسی غیر مادی چیز سے ٹکرا گئے تھے جو دیکھتا ہوں تو ان کی عینک چہرے پر نہیں ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ جیب میں رکھی تھی۔

ساڑھے چار بجے میں چائے پینے جج صاحب کے ہاں پہنچا تو وہاں چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکومتِ آپا موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہی ہیں جج صاحب اکیلے بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ جج صاحب فائلیں دیکھنے میں منہمک رہے اور میں انہیں منہمک رہتے دیکھنے میں منہمک رہا۔ دفعتاً وہ چونکے ۔۔۔ "چائے پیو برخوردار ۔"

اور کچھ نئی فائلیں اٹھا کر پڑھنے لگے۔

کچھ دیر بعد پھر چونکے ۔۔۔ "چائے پیو ۔۔ پیتے کیوں نہیں ؟"

میں نے بڑی ساری چائے دانی کو زور سے اٹھایا۔ وہ یک لخت اوپر چلی گئی معلوم ہوا کہ خالی ہے۔ کھولا تو اندر صرف چائے کی پتیاں تھیں۔

"آخر تم چائے کیوں نہیں پیتے ۔۔؟" انہوں نے خفا ہو کر کہا۔

"جی چائے دانی خالی ہے ۔"

"اچھا۔۔۔؟" انہوں نے میز پر رکھے ہوئے برتنوں کا جائزہ لیا۔ "تو اس میں دودھ ہوگا، دودھ پیو۔"

میں نے جھانک کر دیکھا۔ دودھ بھی نہیں تھا۔ "جی دودھ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر۔۔۔" انہوں نے شکردانی کی طرف اشارہ کیا۔ "تھوڑی سی چینی چکھو۔"

فائلیں ختم کرکے وہ بڑے ملائم لہجے میں نوکروں پر خفا ہوکر مجھے کلب لے گئے۔ وہاں شکار کی باتیں ہونے لگیں۔ جج صاحب کے متعلق کلب میں مشہور تھا کہ اگر کوئی ان سے صرف اتنا کہہ دے کہ پچھلے مہینے جب میں فلاں تالاب کے پاس سے گزرا تو وہاں ایک مرغابی بیٹھی تھی تو وہ فوراً بندوق لے کر اس تالاب پر جا پہنچیں گے اور اس وقت تک منتظر رہیں گے جب تک وہ مرغابی یا کوئی اور مرغابی واپس نہیں آتی۔ ان کے دوست ان کی نئی بندوق کی تعریفیں کر رہے تھے کہ اس بندوق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سلوموشن میں فائر کرتی ہے اور گولی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پہلے بندوق چلنے کی آواز آتی ہے پھر نشانہ خطا ہونے کی آواز۔ کیونکہ اتنی دیر میں جانور یا پرندہ چوکنا ہو جاتا ہے اور پینترا بدل کر وار صاف بچا جاتا ہے۔

واپسی میں ان کی کار خراب ہوگئی۔ مجھے کہا گیا کہ میں ہینڈل لگاؤں۔ کافی محنت کے بعد موٹر سٹارٹ ہوئی۔ ابھی میں ہینڈل ہاتھ میں لیے یہی سوچ رہا تھا کہ یہ بار بار پھسلتا کیوں تھا کہ فرسے آواز آئی اور کار سامنے سے غائب تھی۔ سڑک کافی ویران تھی اس لیے دور تک میں ہینڈل ہاتھ میں لیے پیدل چلا گھر پہنچ کر جج صاحب نے جرح شروع کر دی۔ "تم کہاں رہ گئے تھے؟ لڑکوں میں یہ اچھل کود کی عادت بہت بری ہے۔ چلتی موٹر سے ہرگز نہیں اترنا چاہیے اور یہ ہینڈل تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے؟"

کوٹھی کے دوسری طرف جاکر دیکھا تو شیطان اور ننھے میاں کو محوِ گفتگو پایا۔

"ننھے آج تمہاری رشو آپا کیسی لگ رہی تھیں؟" شیطان نے پوچھا۔

"جیسی لڑکیاں لگا کرتی ہیں۔ فقط آج ان کی قمیض نہایت اچھی تھی۔"

"ننھے تمہارے لیے اس اتوار کو کیا لاؤں ــ؟"

شیطان ہر اتوار ننھے کو رشوت دیتے۔ جو چیز دیتے اسے اگلے اتوار تک چپکے سے چرا لیتے اور پھر الٹا ننھے کو ڈانٹتے کہ کہاں گئی۔

"بتاؤ تمہیں کیا چیز پسند ہے؟"

ننھا سوچ کر بولا ــ "مجھے پیکارڈ کا نیا ماڈل بہت پسند ہے۔"

بیگم آ رہی تھیں۔ ننھے نے جلدی سے کتاب کھول لی۔

"اوہ بیٹا پڑھ رہا ہے۔" بیگم بولیں۔ "روفی میاں تم اس سے کچھ سوال بھی تو پوچھا کرو۔"

جب بیگم آتیں ہمیں خواہ مخواہ ننھے کا امتحان لینا پڑتا۔

ہم نے اسے ترجمہ کرنے کو دیا۔ سٹیفن لی کاک کی کتاب سے ننھے نے نہایت سلیس ترجمہ کیا۔ یہاں تک کہ آخیر میں مصنف کے نام کا بھی ترجمہ کر ڈالا اور لکھا سٹیفن لی مرغ ــ؛

"بیٹے بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟" بیگم نے بڑے فخر سے پوچھا۔

"جی میں پہلے تو ایم اے کروں گا اس کے بعد پہلی جماعت میں پھر داخل ہو کر دوبارہ ایم اے تک پڑھوں گا۔ یعنی ڈبل ایم اے کروں گا۔ اس کے بعد وکالت پڑھ کر خفیہ مشق کیا کروں گا۔"

"خفیہ مشق ــ؟"

"ذاتی مشق" ننھے میاں نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتی ہے۔؟"

"پرائیویٹ پریکٹس! ــ ترجمہ کیا ہے" ننھے میاں بولے۔

"کچھ مستورات آ رہی ہیں" ملازم نے بتایا۔

"بھائی جان مستورات کا واحد کیا ہوتا ہے؟"

"مستور"

"واہ — یہ بھی کبھی سنا ہے کہ ایک مستور آرہی ہے"

خواتین آئیں جنہیں میں نے تو پہچان لیا، لیکن شیطان یونہی ہوائیں تکتے رہے۔

"یہ کون لوگ ہیں"؟ انہوں نے بڑی بے اعتنائی سے پوچھا۔

"پہچانتے نہیں؟ تمہارے خالو کی لڑکیاں ہیں —" بیگم بولیں۔

بیگم جب کبھی شیطان کے خالو کی چھ لڑکیوں کو لے کر نکلتیں، تو شیطان کہا کرتے — "وہ آرہی ہیں بیگم معہ چھ بکھیڑوں کے"! بیگم چاہتی تھیں کہ رات کا کھانا ہم وہیں کھائیں — "آج تمہارے لیے حلوؤں کا انڈا پکا ہے۔

سامنے باورچی خانے میں ایک بلی بڑے مزے سے دودھ پی رہی تھی اور شیطان کے خالو کی سب سے چھوٹی لڑکی پاس کھڑی اپنے رنگین ناخن دیکھ رہی تھی۔ بیگم چلائیں" اے بتّی! ذرا پیچھے مڑکر دیکھنا۔ وہ ننھی دودھ پی رہی ہے"

وہ سب چلے گئے تو شیطان نے بتایا کہ ہفتہ ہوا کسی شخص نے خواب میں ان کی ہتک کی، انہیں بُرا بھلا کہا اور بڑے زور سے ان کے مُکّا بھی مارا۔ وہ ہر رات یہ نیت کر کے سوتے ہیں کہ اگر وہ شخص انہیں خواب میں مل گیا تو مار مار کر اس کا ستیاناس کر دیں گے۔

"بھائی جان کیا بڑے زور سے مُکّا مارا تھا اس نے"؟ ننھے نے پوچھا۔

"ہاں بہت زور سے"

"اتنے زور سے کیا — "؟ ننھے میاں نے ایک مُکّا شیطان کی کمر میں رسید کیا۔ شیطان کچھ دیر اپنے ہونٹ چباتے رہے۔ پھر ننھے کے قریب جا کر بولے: "اتنے زور سے نہیں، اتنے زور سے"۔ اور ننھے میاں نے ایک زبردست نعرہ بلند کیا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی موقع پر پہنچتا۔ شیطان نے زور زور سے ننھے کو ڈانٹنا شروع

کیا" اور چڑھو اونچے درختوں پر پاؤں نہ پھسلے گا تو اور کیا ہوگا؟ اچھا ہوا کہ گر پڑے۔ بیگم دوڑی دوڑی آئیں۔ ننھے کی ایک نہ سنی گئی اور اسے خوب دھمکایا چمکایا گیا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ شیطان کا جوش و خروش جیسا ان تینوں لڑکیوں کے لیے تھا ویسا ہی رضیہ کے بیٹے تھا یا یوں کہ جیسا جوش و خروش رضیہ کے لیے تھا۔ ویسا ہی ان تینوں لڑکیوں کے لیے ہر روز ان کے ارادے بدلتے رہتے۔" رضیہ مغرور ہے اور پروا نہیں کرتی۔ اس لیے کریمہ سے شادی بہتر رہے گی خصوصاً جب اس کی باہیں آنکھ اتنی پیاری ہے۔ رحیمہ کے قہقہے نہایت سریلے ہیں اور ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ یقیناً بہتر بیوی ثابت ہوگی — پرانی محبت پھر پرانی محبت ہے، جو جذبات رضیہ کے لیے ہیں وہ کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتے۔ سفینہ کی بہنیں کتنی خوب صورت ہیں۔ سفینہ سے شادی کرنا کس قدر مفید ہوگا۔"

ہر روز وہ غلط جگہوں پر چلے جاتے۔ غلط لوگوں سے اُلجھ جاتے۔ صحیح لوگوں کے قریب سے گزر جاتے سائیکل کے حادثے نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہوتے، لیکن انہوں نے عینک نہ لگوانی تھی نہ لگوائی۔

اُدھر وہ لڑکیاں شیطان کی اس کمزوری سے واقف تھیں، وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ یہ جان بوجھ کر خاموش رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ شیطان کے ساتھ آ جاتیں۔ بقیہ شامیں اور لڑکوں کے ساتھ گزارتیں۔ جب کبھی کوئی خاص تقریب ہوتی تو وہ بن سنور کر ان حضرت کے ساتھ نکلتیں جن کے پاس کار تھی۔ ان کے جاننے والوں میں سے ایک صاحب گویّے تھے جو ریڈیو پر پکے راگ گاتے تھے، ان کا رنگ بھی پکا تھا۔ سنا تھا کہ ان کی آنکھیں نیلی تھیں، چونکہ وہ ہر وقت آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رکھتے۔ اس لیے ہم ان کی نیلی آنکھوں سے مستفیض نہ ہو سکے۔ ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بھی تھے جو ہمیشہ تانگہ ساتھ لایا کرتے اور بار بار جتاتے کہ وہ خود بیمہ شدہ ہیں، تانگہ بیمہ شدہ ہے، یہاں تک گھوڑا بھی بیمہ شدہ ہے۔ افواہ تھی کہ ان کے بال گھنگھریالے ہیں، لیکن صد حیف کہ جب کبھی ہم نے انہیں دیکھا قدرے گنجا پایا۔ ایک صاحب طالب علم تھے جو سفینہ کے ہم جماعت تھے وہ کرائے کی سائیکل پر آیا کرتے تھے اور بار بار گھڑی دیکھتے رہتے۔

بعض اوقات سینما دیکھتے ہوئے ایک لڑکی شیطان سے اجازت مانگ کر پچھلے درجے میں اس کی خالہ بیٹھی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ اس لیے وہ ان کے پاس جا بیٹھتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتا۔ یہ چیز بار بار دوہرائی جاتی۔ چائے پیتے وقت تو کیفے میں ضرور کسی نہ کسی کی امی یا ممانی آجاتیں۔ شیطان بڑی خندہ پیشانی سے انہیں رخصت کرتے اور ان کی امی جان یا خالہ جان کی خدمت میں آداب بھی بھجواتے جس کی رسید اگلے روز ملتی۔

ان جاننے والوں کو وہ یا تو سہیلیاں کہہ کر یاد کرتیں اور یا کزن کہہ کر ہمیں اکثر بتایا جاتا کہ آپ ہمیں گھر چھوڑ کر نکلے ہی ہوں گے کہ ہماری ایک کار والی سہیلی آگئی یا یہ کہ ہم فلاں باغ میں گئے وہاں ایک سہیلی نے نہایت درد بھرا گانا سنایا۔ فلاں سہیلی کو ہم نے سائیکل پر بھیجا کہ فلاں دکان سے چاکلیٹ لائے۔ سفینہ کے کزن ہر تیسرے روز تانگہ لے آتے ہیں۔

کبھی کبھی شیطان کو یونہی شبہ ہو جاتا۔ "کل آپ کسی لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہی تھیں"۔

" نہیں تو ــــ وہ لڑکا تو نہیں تھا۔ وہ تو میرے چچا تھے۔ آپ نے ان کی فرنچ کٹ داڑھی نہیں دیکھی کیا "۔

شیطان جنہیں شاید لڑکے کے گلے کا سکارف دکھائی دیا تھا مسکراتے اور کہتے: " اوہ کیسی غلط فہمی ہونے لگی تھی "۔ پھر کسی اور سے پوچھتے: " پرسوں شام کو آپ ایک لڑکے کے ساتھ کار میں جا رہی تھیں ــــ ؟"

" لڑکے کے ساتھ "؟ وہ بڑے تعجب کے ساتھ کہتی: " لڑکا کہاں تھا۔ لڑکی تھی میری چچا زاد بہن۔ بڑی آپا۔ وہ دوپٹہ کبھی سر پر نہیں رکھتیں اور ان کے بال بھی تراشیدہ ہیں "۔

" میں بھی کیا ہوں ــــ ؟" شیطان ایک ادا کے ساتھ کہتے: " اور پھر ان دنوں لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق کیسے معلوم ہوتا ہے۔ ایک سے چست رنگین لباس، ایک وضع کے بنے ہوئے بال، ویسی ہی خوشبو کی لپٹیں، یہاں تک کہ ناموں سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ رفعت، شوکت، حشمت اور طلعت میں لڑکے

کون سے ہیں اور لڑکیاں کون سی "۔

جج صاحب کے ہاں بھی ان لڑکیوں کا ذکر آجاتا۔ ایک دفعہ بیگم نے پوچھا کہ "تمہارے ساتھ وہ تین لڑکیاں کون ہوا کرتی ہیں ؟"

"جی وہ میری سہیلیاں ہیں "، شیطان نے جواب دیا۔

جج صاحب نے بھی پوچھا: "سنا ہے کہ تم آج کل کچھ لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو"۔

"جی ہاں ! ابھی تک تو صرف تین لڑکیاں ہیں۔ شاید کچھ دنوں تک آدھ کا اضافہ ہو جائے "۔

"جب میں یورپ میں تھا تو میں لڑکیوں کو ساتھ لے جایا کرتا تھا لیکن ایک وقت میں صرف ایک لڑکی ہوتی تھی۔ تمہاری طرح ریوڑ لے کر نہیں نکلتا تھا"

پھر کچھ دیر سوچ کر بولے: "یہ بتاؤ کہ تم اس ملک میں لڑکیوں سے دوستی کیونکر کر لیتے ہو ؟"

شیطان بولے: "جناب یہ گر میں ہر ایک کو نہیں بتا سکتا۔ یہ استادی شاگردی کا معاملہ ہے "۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آہم۔ وہ ذرا ___ تمہاری گھڑی میں کیا بجا ہے "؟ وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

حکومت آپا نے پہلے تو لڑکیوں کو دیکھا۔ پھر شیطان کی طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولیں: "جیسی روح ویسے فرشتے "۔

رضیہ کو علم تھا لیکن اس نے کبھی ذکر تک نہیں کیا۔

کبھی رضیہ شیطان سے اچھی طرح باتیں کر لیتی تو وہ کئی دنوں تک یہ شعر بار بار پڑھتے ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر اتوار کو تینوں لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ یہ شعر سنایا جاتا ؎

انجامِ محبت ہے ہر حال میں رسوائی
کچھ اس کا سبب پیسے، کچھ اس کا سبب باتیں

ایک دن شیطان کو نہایت شدید رومانی دورہ اٹھا اور انہوں نے عجب الٹی سیدھی حرکتیں کیں پہلے تو جج صاحب کے سامنے اکبر کا شعر پڑھ دیا ؎

ہیں ہوا رخصت ان سے اے اکبرؔ
وصل کے بعد تھینک یُو کہہ کر

ابھی وہ اچھی طرح خفا بھی نہ ہوئے تھے کہ بیگم کے سامنے بہک گئے۔ بیگم تیس سال پہلے کے قصے سنا رہی تھیں کہ لڑکپن میں میں ایسی تھی۔ زیور اس طرح پہنا کرتی، شاعری کا بھی شوق تھا۔ یہ تھا وہ تھا۔

شیطان ایک ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولے: "کاش کہ میں آپ سے پہلے ملا ہوتا۔"

اس کے بعد رضیہ کا نمبر آیا جس میں جھُپ کر سن رہا تھا۔ پہلے رضیہ کی تعریفیں ہوئیں۔ پھر لگے ہاتھوں اظہارِ محبت بھی کر ڈالا اور بالکل وہی الفاظ دہرائے جنہیں رضیہ چند سال پہلے سن چکی تھی۔

"میں محبت کے تمام معیاری طریقے آزما چکا، لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

رضیہ حسبِ معمول اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی کہ موسم پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ فلمیں فضول سی لگی ہیں۔ اچھے گتے کہیں نہیں ملتے۔ جب شیطان کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ لڑکے آج کچھ کہتے ہیں اور محض چند برسوں میں بدل جاتے ہیں۔

"میں بھلا کیونکر بتا سکتا ہوں کہ اگلے سال میرے خیالات کیا ہوں گے۔ مستقبل کے متعلق تو صرف ولی اللہ ہی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ البتہ میرا ماضی تم جانتی ہی ہو۔ رہ گیا حال، سو وہ تم پر عیاں ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر پامسٹری کی اور لکیروں کی باتیں کر چکنے کے بعد کہا: "مگر یہ سارا ہاتھ تو میرا ہے۔"

"لیکن آپ مجھے بہت تھوڑا جانتے ہیں۔"

"میرے خیال میں میں تمہیں کافی جانتا ہوں۔ تم قبول صورت ہو، سگھڑ ہو، امورِ خانہ داری میں ماہر ہو۔ سلیقہ شعار ہو، پڑھتے لکھتے خاندان کی لڑکی ہو۔ تم سے بہتر لڑکیاں بھی میں نے دیکھی ہیں۔ مگر دنیا میں رضیہ صرف ایک ہی ہے۔"

"افوہ! مغرب کی اذان ہو رہی ہے" رضیہ بولی۔

"اور تمہارے نظریے مولویانہ ہیں۔ تم غلط ملک میں آگئیں۔ تمہیں کہیں اور ہونا چاہیئے تھا۔ خیر اب بھی دیر نہیں ہوئی، جاؤ حج کرو، شرعی کپڑے پہنو، حافظ بنو، نمازیں پڑھو، اذانیں دو۔

"دو اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں"

شیطان بڑے خوش خوش ملے، پوچھا کیسے رہے؟ بولے۔ جو کچھ دل میں تھا کہہ دیا۔ پوچھا۔ ہاں ہوئی یا نا؟ بولے۔ یقیناً نا ہوئی۔

شیطان کی سالگرہ آئی۔ پکنک کا پروگرام بنا کہ شہر سے باہر دریا پر دن گزارا جائے۔ ان تینوں لڑکیوں کی بہنیں اور سہیلیاں آرہی تھیں۔ اس لیے شیطان بڑے مسرور تھے۔ ہم گراموفون ریکارڈ چھٹنے لگے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ "وائن میوزک وومن" والا ریکارڈ ضرور ساتھ لے چلیں۔

"کل وہاں تینوں چیزیں ہوں گی۔ موسیقی ہوگی، خمار ہوگا اور لڑکیاں ہوں گی۔"

نوکر ہاتھ میں فہرست لیے حساب لگا رہا تھا۔ "آٹھ درجن سینڈوچز اور تین بڑے کیک۔"

"اور لڑکیاں ـــــ" شیطان آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"دو سیر مٹھائی، پچیس انڈے اور تین درجن مالٹے ہوں گے۔" نوکر پنسل سے لکھتا جا رہا تھا۔

"اور لڑکیاں ہوں گی۔" شیطان نے ٹھنڈا سانس لیا۔

صبح صبح ہم انہیں لینے گئے۔ تینوں نئی لڑکیاں بھی عینک نکلیں۔ ویسے انہوں نے بغیر فریم کی عینکیں لگا رکھی تھیں۔ سب لڑکیوں کے چہروں پر بلا کا نکھار تھا۔ غضب کی تازگی تھی چہرے خوب چمک رہے تھے۔ عینکیں بھی چمک رہی تھیں۔ آسمان پر بادل تھے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے ایک دو مرتبہ بارش ہوئی۔ پھر کڑی تیز دھوپ نکلی۔ ہم کچھ بھیگے کچھ پسینہ آیا۔ اب جو غور سے انہیں دیکھتے ہیں تو عجب حلیہ بنا ہوا تھا۔ سارا میک اپ اتر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ ان کی اصلی شکلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کریمہ کی ہلکی ہلکی مونچھیں نظر آرہی تھیں۔ چہرے کے ہلکے ہلکے گل مچھے تھے جیسے تصویروں میں مغل بادشاہوں کے ہوتے ہیں۔ سفینہ بھویں اکھیڑتی تھی چنانچہ اس کی خود ساختہ بھووں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ نئی لڑکیوں کے چہروں پر بھی کئی ایسے نقوش ابھر آئے تھے جو پہلے پوشیدہ تھے۔ ہمارا گروہ کچھ سرکس سا معلوم ہو رہا تھا جس میں ہر سائز اور ہر سائز کی شخصیتیں موجود تھیں۔ لڑکیوں میں جس کی شکل بہت اچھی تھی وہ دُبلی بہت تھی اور قد نہایت لمبا تھا۔ جس کی مسکراہٹ حسین تھی وہ فربہ بہت تھی۔ جو سمارٹ معلوم ہو رہی تھی وہ ویسے نخشی ہوئی تھی جس کی باتیں بہت اچھی تھیں، وہ بہت ہی چھوٹی تھی۔ بہر صورت ایک لڑکی بھی نارمل نہیں تھی۔

ادھر شیطان بار بار مجھے تاکید کرتے کہ ہر ایک سے باتیں کرو۔ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس طرح اپنی توجہ پانچ پر تقسیم کر کے برابر برابر بانٹنا کسی انسان کے لیے تو نہایت مشکل ہے۔ البتہ ایک حقہ یہ فرض بخوبی سر انجام دے سکتا ہے۔

"ہم مچھلیاں پکڑنے بیٹھے لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ کسی نے خاموش ہونے کو کہا کہ کہیں مچھلیاں نہ بھاگ جائیں۔"

"آپ ضرور شور مچائیے"۔ شیطان نے دریا میں اپنے خدوخال دھوتے ہوئے کہا۔ "ان کم بختوں کو کسی طرح تو پتہ چلے کہ ہم انہیں پکڑنے آئے ہیں۔"

بارش کا ایک اور چھینٹا پڑا۔ ہم سب درختوں کی طرف بھاگے۔ شیطان صبح سے ایک نئی لڑکی کو بڑی

عجیب طرح سے دیکھ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

" یہ آج تو بالکل مون سون کی قسم کی بارش ہو رہی ہے " وہ بولی۔

" مون سون ہیں ہنی مون کیسا ہوتا ہوگا " شیطان کچھ اور نزدیک آ گئے " چلئے وہاں چلیں۔ یہ درخت تو ٹپک رہا ہے۔ لائیے میں آپ کا بٹوہ تھام لوں۔ بوجھل معلوم ہو رہا ہوگا "

اس نے بٹوہ دے دیا۔

" یہ درخت بھی لیک کر رہا ہے چلیے " شیطان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ کھینچ لیا " شکریہ ! مجھے اپنا ہاتھ بوجھل نہیں معلوم ہو رہا "

بارش رکی تو شیطان نے چیزیں گرم کرنے کے لیے لکڑیوں کا چولہا بنایا۔ جب آگ جلائی گئی تو چولہا بھی جل گیا اور کئی چیزیں بجھ گئیں۔ شیطان کو سالگرہ کی مبارک باد ملی۔ چھوٹے موٹے تحفے بھی ملے، وہ کہنے لگے کہ کل تک وہ صرف پچیس سال کے تھے اور آج چھبیس سال کے ہو گئے۔ صرف ایک رات میں سال کا فرق پڑ گیا۔ یہ خوشی کا نہیں رونے کا مقام ہے۔ پھر اس نئی لڑکی کی طرف دیکھ کر بولے " میں دنیا کی ہر چیز سے گریز کر سکتا ہوں۔ سوائے ترغیب کے۔ گستاخی معاف آپ کی شادی کب ہو رہی ہے ؟ "

" میری منگنی ہو چکی میرے کزن کے ساتھ "

" وہ کیا کرتے ہیں ؟ "

" ان کے والدین نکھٹو ہیں "

اقوہ ! تو کیا آپ نے محض دولت کے لیئے "

" اقوہ ! ہاں میں نے محض دولت کے لیے ۔ اور پھر اس ملک میں رومانی، زبردستی کی، اپنی پسند کی۔ خواہ کیسی بھی ہوں سب شادیاں دو تین سال کے بعد ایک جیسی ہو جاتی ہیں "

" اور آپ شادی کب کر رہی ہیں ؟ " شیطان نے دوسری نئی لڑکی سے پوچھا۔

" میں شاید کبھی نہیں کروں گی "   " کیوں ؟ "

مجھے نوکروں، گھر کے حساب کتاب، دھوبیوں اور بچوں سے سخت نفرت ہے "

بچوں سے کیوں نفرت ہے ؟"
"اس لیے کہ مجھے پالتو جانوروں اور پرندوں سے بھی نفرت ہے ۔"

"اور آپ کی شادی کب ہو رہی ہے ؟" کریمہ نے شیطان سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ! بتایئے کب ہو رہی ہے ؟" سب ایک دام بولیں۔

"پہلے اپنے ایک کان میں انگلی ڈال لیجئے پھر بتاؤں گا۔"

"وہ کیوں ؟"

"کیوں کہ بات ایک کان سے سنی جاتی ہے اور دوسرے سے اڑائی جاتی ہے۔"

"نہیں یہ تو ہم کسی کو بھی نہیں بتائیں گے ۔"

دراصل جو راز شیطان انہیں بتاتے وہ چند دنوں میں ہر جگہ مشہور ہو جاتا ایک دفعہ شیطان نے غلطی سے لڑکی کی امی کی جگہ ایک لڑکی کو یہ پیغام بھیج دیا کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمایئے ۔ لڑکی بے حد خفا ہوئی ۔ شیطان نے یہ بات کریمہ کو بتائی اور تاکید کی کہ کسی اور کو مت بتانا، اس نے رحیمہ کو بتائی اور کہا کہ ہرگز کسی اور مت بتانا ۔ چلتے چلتے یہ بات شیطان تک پہنچی اور جس عقل مند نے شیطان کو بتائی اس نے انہیں بھی تاکید کی کہ کسی اور مت بتانا۔

"میں مستقبل سے نہیں گھبراتا، بلکہ مستقبل مجھ سے ڈرتا ہے ۔" شیطان مُنہ پُھلا کر بولے : "مگر حقیقت یہ ہے کہ شادی کے بعد عاشق کی حالت نہایت خستہ ہو جاتی ہے ۔ ناما فرنویس نے کہا ہے کہ عاشق پہلے بوسے کے لیے جد و جہد کرتا ہے ۔ دوسرا بوسہ جیتتا ہے ۔ تیسرے کے لیے منت سماجت کرتا ہے چوتھا قبول کرتا ہے ۔ پانچواں ، چھٹا ، ساتواں ، آٹھواں اور باقی کے سب بوسے برداشت کرتا ہے ۔"

"بالکل غلط ہے ۔" سفینہ بولی : "اور رحیمہ وہ تمہارا کزن ۔"

"میرا کزن کیوں ہوتا ۔ تمہارا ہوگا ۔"

"واہ ملنے تو وہ تم سے آیا کرتا ہے ۔ کریمہ کے دونوں کزنوں کے ساتھ ۔"

تعجب ہے" ایک نئی لڑکی بولی "کریمہ کا تیسرا کزن سفینہ کے کزن کو بھی کریمہ ہی کا کزن سمجھتا ہے اور وہ خود اسے یہی سمجھتا ہے"

" خواتین، خواتین!!" شیطان بولے "ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ ہم حضرت آدم کی اولاد ہیں"
اتنے میں نوکر نے مژدہ سنایا کہ چار کی پتیاں گھر رہ گئیں۔ شیطان نے نوکر کو تلاش میں ایک سمت روانہ کیا اور خود دوسری سمت نکلے۔ میں لکڑیاں چن رہا تھا۔ لڑکیاں گھاس پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ میرے کان ان کی طرف تھے۔

نئی لڑکی کہہ رہی تھی "یہ روفی بالکل یونہی ہے۔ خاک سمجھائی نہیں دیتا۔ آج کریمہ دیر تک سامنے کھڑی ہو کر منہ چڑاتی رہی انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ بس یونہی دیکھتے رہے"

" یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سنی سنائی باتوں کا یقین نہیں کرتے اور چشم دید واقعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

" اور جو یہ دوسرے صاحب ہیں کتنے عجیب سے ہیں۔ بس اپنی ہی دنیا میں بستے ہیں"

" خیر، عجیب تو نہیں ہیں" نئی لڑکی نمبر دو عجب انداز سے مسکرائی۔

" یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ روفی کسی جج وج کے ہاں جاتا ہے یہ بھی کسی مجسٹریٹ کے ہاں جاتا ہوگا۔ یہ سب اوّل نمبر کے ہرجائی اور طوطا چشم ہوتے ہیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنے کو تیار ہیں۔ بس کسی طرح موقع مل جائے، لیکن عاشق صرف اس پر ہوتے ہیں جہاں کی پہنچ سے باہر ہو۔ ان کا رویہ بالکل وہی ہوتا ہے کہ ووٹ دیتے وقت غلام محمد صاحب کا خیال رکھیئے، لیکن ووٹ میاں محمد حسین ہی کو دیجئے اور محبوب پر بھی تب تک عاشق رہتے ہیں جب تک وہ پہنچ سے باہر نہ ہو۔ پھر جب شادی کا موڈ آتا ہے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر کسی دولت مند مشہور گھرانے میں پیغام بھجواتے ہیں اور ایسی بھیگی بلی بن جاتے ہیں، جیسے پہلے کسی لڑکی سے بات تک نہیں کی"

"تم روفی کی برائیاں کیوں کرتی ہو۔ اگر یہ اتنا ہی بُرا ہے تو اس کے ساتھ کیوں پھرا کرتی ہو؟"

"اس لیے کہ یہ بے حد دلچسپ ہے۔ بس اس میں صرف یہی ایک خوبی ہے"۔

"اور وہ تمہارا کار والا، وہ گویا اور وہ تانگے والا۔۔۔؟"

"کار والا مغرور اور خود پسند سا ہے، اس کے ساتھ ہم صرف کار کی وجہ سے جاتی ہیں، اور نہ وہ ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں، اگر موڈ اچھا ہو تو وہ گویا بہت اچھا رفیق بنتا ہے اور اگر اداس ہوں تو وہ تانگے والا خوب ہے، کم بخت اور بھی اداس کر دیتا ہے۔ وہ طالب علم بیوقوف ہے۔ اِدھر اُدھر کے کام بخوشی کر دیتا ہے بازار سے چیزیں سستی خرید لاتا ہے"۔

شیطان چائے کی جگہ دجانے کس نشہ آور چیز کی پتیاں لے آئے۔ پی کر خمار سا چڑھ گیا۔ جب واپس روانہ ہوئے تو سب ایک دوسرے سے بیزار تھے۔ شیطان بیزار بھی تھے اور تھکے ہوئے بھی۔

"میرے داہنے پاؤں میں درد ہو رہا ہے"۔ سفینہ بولی۔

"میرے بھی داہنے پاؤں میں درد ہے"۔ شیطان نے جواب دیا۔

"میرے کان میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے"۔ نئی لڑکی بولی۔

"میرے کان میں بھی بالکل ویسا ہی ہوتا ہے"۔

"میرے ۔۔۔" رحیمہ نے شروع کیا۔

"جی میرے بھی ۔۔۔" شیطان جلدی سے بولے۔

گھر پہنچ کر ہیں نے شیطان سے کہا کہ یہ چھوٹے موٹے سیکنڈ ہینڈ معاشقے انہیں زیب نہیں دیتے انہوں نے تصور وار رضیہ کو ٹھہرایا۔ ہر لڑکی پر وہ اس لیے عاشق ہو جاتے ہیں کہ انہیں رضیہ کی محبت ہی نہیں مل سکی۔ دراصل ہر معاشقے میں انہیں رضیہ ہی کی محبت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے نہایت دلدوز انداز میں یہ شعر پڑھا ۔

تجھ سے چھُٹ اوروں سے بھی جھوٹا سچا پیار کیا
وہ بھی تیرے عشق کے حیلے، یہ بھی تیرے غم کے بہانے

جج صاحب کے ولایت جانے کی افواہ خبر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ عنقریب پاسپورٹ بنوانے والے ہیں اُنہوں نے بڑی کار فروخت کر دی ہے۔ باہر سے کوئی نیا ماڈل لائیں گے۔ بیگم کے لیے ایک نہایت چھوٹی سی کار خریدی گئی تھی جو دراصل اسسٹنٹ کار تھی۔ ننھے میاں ضد کر کے اسے سائیکل سٹینڈ پر کھڑا کرتے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ اس کار کے لیے ایک سائڈ کار بھی خریدی جائے۔

شیطان کا دن بدن حال بُرا ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ جج صاحب جائیں نہ جائیں رضیہ ضرور ولایت جائے گی اور پھر وہیں رہ جائے گی۔ انہوں نے بڑی منتوں کے بعد مجھے سراغ لگانے بھیجا۔ بیگم کمرے صاف کروا رہی تھیں "سارے روشن دین کھول دو۔ تاکہ گرد نکل جائے۔ یہ بوروں کی کوٹھی بھی اٹھا دو اور خالی بوتلے کی سوڈلیں یہاں کیا کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ یہاں سے نکالو (چونک کر) کیا وہ لڑکا آیا تھا ابھی ــــ؟"

اندر میں چپکے سے پردے کے پیچھے ہو گیا۔ رضیہ کے کمرے میں پہنچا، سنا ہے تم ولایت جا رہی ہو؟"

"ولایت تو نہیں عرب جانے کا ارادہ ہے۔"

"اور ہم؟ ہم یہیں رہ جائیں کیا؟"

"میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے گایا کیجیے۔"

"اور عرب کے بعد کیا پروگرام ہوگا؟"

"نمازیں پڑھا یا کروں گی۔ اذانیں دوں گی، وعظ کیا کروں گی۔"

"ارے! مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ لڑکا کہاں چلا گیا؟" بیگم کی آواز آئی۔

"لڑکا مراقبے میں ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

جب میں رات گئے شیطان کے کمرے میں پہنچا، تو وہ اونگھ رہے تھے۔ جب ان پر نیند کی غنودگی طاری ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ان سے اگر سنجیدہ گفتگو کرنی ہو تو میں ہمیشہ یہی وقت چنتا ہوں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے تینوں لڑکیوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ شاید شام کو انہیں کزنوں کے ساتھ دیکھ آئے تھے یا ان کی باتیں سن آئے تھے۔

"لیکن اس کے باوجود ہم ان سے راہ و رسم رکھیں گے۔ مجھے تم سے بڑی شکایت ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"عہد جو کر چکا تھا۔"

"خیر، رضیہ کی خبر سناؤ۔"

"وہ کہیں نہیں جا رہی۔"

"سچ مچ" انہوں نے آنکھیں میچیں اور جیب سے عینک نکالی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی پرانی عینک تھی جو کھوئی گئی تھی۔

"ایک مرتبہ رضیہ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔"

"اس نے تو یہ کہا تھا۔ کاش کہ آپ عینک کے بغیر اچھے معلوم ہوتے۔ تم نے اچھی طرح سنا نہیں۔"

انہوں نے عینک صاف کر کے لگائی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ محبت نام ہے غلط فہمی کا کہ ایک لڑکی دوسری لڑکی سے مختلف ہے۔ مگر رضیہ کے لیے میرے دل میں وہی خیالات ہیں جو پچھلے برس تھے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ یہ کہیں سمندر پار نہ چلی جائے۔ یہاں کم از کم اسے دیکھ تو لیتے ہیں اور اب کہ بہار ختم ہو رہی ہے۔ خوشیاں بھی ختم ہو رہی ہیں جب بہار ختم ہونے لگتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بڑھاپا آ رہا ہے۔"

"مگر تمہارا چہرہ تو۔"

"یہ چہرے کا نہیں دل کا بڑھاپا ہے۔" وہ سینے پر مکا مار کر بولے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر آنکھیں موند

بس اور بڑبڑانے لگے" اور اگر میرے پاس کار ہوتی، تانگہ ہوتا، کرائے کی سائیکل ہوتی، میرے بال گھنگھریالے ہوتے، آنکھیں نشیلی ہوتیں تو وہ تینوں لڑکیاں مجھ پر عاشق ہو جاتیں۔ لیکن اگر یہ ساری خوبیاں مجھ میں ہوتیں تو میں کسی بہتر لڑکی کو اپنے اوپر عاشق کرواتا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں، اگر یہ جھوٹ بولتی رہی ہیں تو میں کون سا سچ بولتا رہا ہوں۔ اگر انہوں نے فلرٹ کیا ہے تو میں نے بھی تو فلرٹ کیا ہے۔ مجھے ان کی پرواہ کب تھی۔ بس ذرا افسوس ہے تو اس بات کا کہ وہ مجھ سے زیادہ چست نکلیں اور جو سلوک میں ان سے آخر میں کرتا وہ انہوں نے مجھ سے ذرا پہلے کر دیا۔ ہم لوگ کیسے عجیب ہیں۔ سیدھی سادی لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ صرف شوخ و شنگ لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دراصل ہم خود چاہتے ہیں کہ وہ چالاک بن جائیں۔ جھوٹ بولنا سیکھ جائیں، ہم خود انہیں ایسا بناتے ہیں۔ یہ سارے حربے ہمارے سکھائے ہوئے ہیں اور جب وہ سب کچھ سیکھ جاتی ہیں، تو ہم انہیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور کچھ دنوں کے لیے پھر سیدھی سادی لڑکیوں کے قصیدے گانے لگتے ہیں۔"

مجھے علم تھا کہ بہار ختم ہو چکی ہے، شیطان کی کھوئی ہوئی عینک مل گئی ہے، ان کی غنودگی بھی کبھی کی دور ہو چکی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ شاید سچ بول رہے تھے۔

ملکی پرندے اور دوسرے جانور

کوّا

کوّا گرامر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔

کوّا صبح صبح موڈ خراب کرنے میں مدد دیتا ہے، ایسا موڈ جو ویسے بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ علی الصبح کوّے کا شور انسان کو مذہب کے قریب لاتا ہے اور نروان کی خواہش شدت سے پیدا ہوتی ہے۔

کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ وہ کائیں کائیں کرتا ہے، کائیں کے کیا معنی ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔

کوّے کالے ہوتے ہیں، برفانی علاقوں میں سفید یا سفیدی مائل کوّا نہیں پایا جاتا۔ کوّا سیاہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔

پہاڑی کوّا ڈیڑھ فٹ لمبا اور وزنی ہوتا ہے۔ میدان کے باشندے اس سے کہیں چھوٹے اور مختصر کوّے پر قانع ہیں۔ کوّے خوبصورت نہیں ہوتے لیکن

پہاڑی کوّا تو باقاعدہ بدنما ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ معمولی کوّے سے حجم میں زیادہ ہوتا ہے۔

کوّے کا بچپن گھونسلے میں گزرتا ہے جہاں اہم واقعات کی خبریں ذرا دیر سے پہنچتی ہیں اگر وہ سیانا ہو تو بقیہ عمر وہیں گزار دے لیکن سوشل بننے کی تمنا اسے آبادی میں کھینچ لاتی ہے۔ جو کوّا ایک مرتبہ شہر میں آجائے وہ ہرگز پہلا سا کوّا نہیں رہتا۔

کوّے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا۔ اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں دیکھا جائے۔ کوّا بے چین رہتا ہے اور جگہ جگہ اُڑ کر جاتا ہے، وہ جانتا ہے۔ کہ زندگی بے حد مختصر ہے، چنانچہ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ کون نہیں چاہتا۔

کبھی کبھی کوّے ایک دوسرے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ دراصل ایک کوّا دوسرے کوّے کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ دوسرے پرندوں کی طرح کوّوں کے جوڑے کو کبھی چہلیں کرتے نہیں دیکھا گیا، کوّا کبھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ یا کرتا ہے؟ کوّے کو لوگ ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں۔ سیاہ رنگ کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ لوگ تو بس ظاہری رنگ وروپ پر جاتے ہیں۔ باطنی خوبیوں اور کیرکٹر کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کوّا کوئی جان بوجھ کر تو سیاہ نہیں ہوا۔ لوگ چڑیوں، مرغیوں اور کبوتروں کو دانہ ڈالتے وقت کوّوں کو بھگا دیتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح نہ صرف کوّوں کے لاشعور میں کئی ناخوشگوار باتیں بیٹھ جاتی ہیں بلکہ ذہنی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ آخر کوّوں کے بھی تو حقوق ہیں۔

کوّا باورچی خانے کے پاس بہت مسرور رہتا ہے۔ ہر لمحے کے بعد کچھ اُٹھا کر کسی اور کے لئے کہیں پھینک آتا ہے اور درخت پر بیٹھ کر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی حسین

ہے۔

کہیں بندوق چلے تو کوے اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آجاتے ہیں، اس قدر شور مچتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا رہتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو کوے نہاتے ہیں اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔ کوا سوچ بچار کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زیادہ فکر کرنا اعصابی بنا دیتا ہے، کوے سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔

کوا بڑی سنجیدگی سے اُڑتا ہے، بالکل چونچ کی سیدھ میں۔ کوے اُڑ رہے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شرط لگا کر اڑ رہے ہیں۔ کوے فکرِ معاش میں دُور دور نکل جاتے ہیں لیکن کبھی کھوئے نہیں جاتے۔ شام کے وقت کوئی دس ہزار کوا کہیں سے واپس آجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلط کوے ہوں۔

کوا اتنا غیر رومانی نہیں جتنا ہم اور آپ سمجھتے ہیں، شاعروں نے اکثر کوے کو مخاطب کیا ہے۔ کاگا لے جا ہمار و سندیس۔ کاگا رے جا رے جا رے۔

لیکن ہمیشہ کوے کو کہیں دُور جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کسی نے بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا۔ بلکہ ایک شاعر تو یہاں تک کہہ گیا۔ کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس۔ یہاں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ جانیں اور آپ کا کاگا۔

اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو یہ مت بھولئے کہ کوے بھی آپ سے نالاں ہیں۔

بُلبُل

بُلبُل ایک روایتی پرندہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ سوائے وہاں کے جہاں اسے

ہونا چاہیئے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ نے چڑیا گھر میں یا باہر بلبل دیکھی ہے تو یقیناً کچھ اور دیکھ لیا ہے۔ ہم ہر خوش گلو پرندے کو بلبل سمجھتے ہیں، قصور ہمارا نہیں ہمارے ادب کا ہے۔

شاعروں نے نہ بلبل دیکھی ہے نہ اسے سنا ہے۔ کیونکہ اصلی بلبل اس ملک میں نہیں پائی جاتی۔ سنا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں بلبل ملتی ہے لیکن کوہ ہمالیہ کے دامن میں شاعر نہیں ہوتے۔

سانیٹ وہ نظم ہے جسے محض بلبل کے لئے لکھا گیا ہو۔ خوش قسمتی ہے بلبل ان پڑھ ہے۔

عام طور پر بلبل کو آہ وزاری کی دعوت دی جاتی ہے اور رونے پیٹنے کے لئے اکسایا جاتا ہے۔ بلبل کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں، ویسے بلبل ہونا کافی مضحکہ خیز ہوتا ہوگا۔

بلبل اور گلاب کے پھول کی افواہ کسی شاعر نے اڑائی تھی جس نے رات گئے گلاب کی ٹہنی پر بلبل کو نالہ وشیون کرتے دیکھا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ پرندہ بلبل ہے۔ اور وہ چیز نالہ وشیون۔ رات کو عینک کے بغیر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔

بلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے۔ یعنی اگر پروں کو نکال دیا جائے تو کچھ زیادہ بلبل نہیں بچتی۔

بلبل کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق طرح کی باتیں مشہور ہیں، بلبل رات کو کیوں

گاتی ہے، پرندے جب رات کو گائیں تو ضرور کچھ مطلب ہوتا ہے۔ وہ اتنی رات گئے باغ میں اکیلی کیوں جاتی ہے۔ بلبل کو چہچہاتے سُن کر دور کہیں ایک اور بلبل چہچہانے لگتی ہے۔ پھر کوئی بلبل نہیں چہچہاتی وغیرہ۔ ہمارے ملک میں تو لوگ بس سکینڈل کرنا جانتے ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کسی چیز کا یقین نہ کیجیے۔

کبھی کبھی بلبل غلطیاں کرتی ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی، چنانچہ پھر غلطیاں کرتی ہے۔ سیاست میں تو یہ عام ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بلبل کے گانے کی وجہ اس کی غمگین خانگی زندگی ہے جس کی وجہ یہ ہر وقت کا گانا ہے۔ دراصل بلبل ہمیں محظوظ کرنے کے لئے ہرگز نہیں گاتی اُسے اپنے فکر ہی نہیں چھوڑتے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بلبل گاتے وقت بُل۔ بُل۔ بلبُلبُل۔ بُل کی سی آوازیں نکالتی ہے۔ یہ غلط ہے۔

بلبل پکے راگ گاتی ہے یا کچے؟ بہرحال اس سلسلے میں وہ بہت سے موسیقاروں سے بہتر ہے۔ ایک تو وہ گھنٹے بھر کا الاپ نہیں لیتی، بے سُری ہو جائے تو بہانے نہیں کرتی کہ سازوالے نکمے ہیں۔ آج گلا خراب ہے۔ آپ تنگ آجائیں تو اُسے خاموش کرا سکتے ہیں۔ اور کیا چاہیئے۔

جہاں تیتر، سبحان تیری قدرت، پپیہا 'پی کہاں' اور گیدڑ 'پدرم سلطان بُود' کہتا ہوا سُنا گیا ہے۔ وہاں بلبل کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصرعے کے ایک حصے پر اٹک گئی ہو۔ مثلاً۔ مانا کہ ہم پہ جور و جفا، جور و جفا، جور و جفا…… یا تعریف اُس خدا کی، خدا کی، خدا کی…… اور دلے بغرد ختم

بغرد ختم بغرد ختم۔ شاید اسی میں آرٹ ہو۔

ہو سکتا ہے کہ ہماری توقعات زیادہ ہوں۔ لیکن یہ گانے کا رکیٹ اس نے خود شروع کیا تھا۔ بلبل کو شروع شروع میں قبول صورتی، گانے بجانے کے شوق اور نفاست پسندی نے بڑی شہرت پہنچائی۔ کیونکہ یہ خصوصیات دوسرے پرندوں میں یکجا نہیں ملتیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت جاتی رہی اور لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ادھر بلبل پر نئی نئی تحریکوں اور جدید قدروں کا اتنا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بلبل سو فی صدی رجعت پسند ہے۔ کچھ لوگ اس زمانے میں بھی بلبل کے نغموں، چاندنی راتوں اور پھولوں کے شائق ہیں۔ یہ لوگ حالتِ حاضرہ اور جدید مسائل سے بے خبر ہیں اور سماج کے مفید رکن ہرگز نہیں بن سکتے، وقت ثابت کر دے گا کہ.... وغیرہ وغیرہ۔

جیسے گرمیوں میں لوگ پہاڑ پر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح پرندے بھی موسم کے لحاظ سے نقل وطن کرتے ہیں، بلبل کبھی سفر نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیئے تھا۔

ہمارے ادب کو دیکھتے ہوئے بھی بلبل نے اگر اس ملک کا رخ کیا تو نتائج کی ذمہ دار خود ہوگی۔

بھینس

بھینس موٹی اور خوش طبع ہوتی ہے۔

بھینسوں کی قسمیں نہیں ہوتیں وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں بھینس کا وجود بہت سے انسانوں کے لئے باعثِ مسرت ہے۔ ایسے انسانوں کی زندگی میں بھینس کے علاوہ مسرتیں بس گنی گنائی ہوتی ہیں۔

بھینس کا ہم عصر چوپایہ گائے دنیا بھر میں موجود ہے لیکن بھینس کا فخر صرف ہمیں ہی نصیب ہے۔ تبت میں گائے کے وزن پر سُرا گائے ہوتی ہے، سُرا بھینس کہیں نہیں ہوتی۔

جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ افریقہ میں بھینس سے ملتی جلتی کوئی چیز Bison ہوتی ہے مگر وہ دودھ نہیں دیتی۔ جغرافیہ دان اتنا نہیں سمجھتے کہ جو چیز دودھ نہ دے بھلا وہ بھینس جیسی کیونکر ہو سکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھینیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں؟ غالباً نہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے مگر اتنی اندھی نہیں۔

بھینس کے بچے شکل صورت میں ننھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں، لہٰذا فریقین ایک دوسرے پر تنقید نہیں کر سکتے۔

بھینس سے ہماری محبت بہت پُرانی ہے، بھینس ہمارے بغیر رہ لے لیکن ہم بھینس کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتے۔ آج کل یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں کو کوٹھی ملتی ہے تو ایسی جس میں گیراج تک نہیں ہوتا جہاں بھینس باندھی جا سکے۔

جس گھر میں بھینس ہو (اور بھینس کہاں نہیں ہے) وہاں اندرونِ حویلی سب کے سب بھینس کے چکنے اُدنیٔے ہوئے دودھ کے لمبے لمبے گلاس چڑھاتے ہیں، پھر خمار چڑھتا ہے کائنات اور اس کا کھیل بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ ایک اور دنیا کے خواب نظر آتے ہیں۔ رہ گئی یہ دنیا، سو یہ دنیا تو مایا ہے مایا!

کئی بھینسیں اتنی بھدی نہیں ہوتیں، مگر کچھ ہوتی ہی ہیں۔ دُور سے یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ بھینس اس طرف آ رہی ہے یا اس طرف جا رہی ہے۔ رُخِ روشن کے آگے

شمع رکھ کر۔ والا شعر یاد آجاتا ہے۔

بھینس اگر ورزش کرتی اور غذا کا خیال رکھتی تو شاید چھریری ہو سکتی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض لوگ مکمل احتیاط کرنے پر بھی موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بھینس کا مشغلہ جگالی کرنا ہے یا تالاب میں لیٹے رہنا، وہ اکثر نیم باز آنکھوں سے اُفق کو تکتی رہتی ہے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچتی۔ اگر بھینس سوچ سکتی تو رونا کس بات کا تھا۔

ڈاروِن کی تھیوری کے مطابق صدیوں سے ہر جانور اسی کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو بہتر بنا سکے۔ یہاں تک کہ بندر انسان بن گئے ہیں۔ بھینس نے محض سستی کی وجہ سے اس تگ و دو میں حصہ نہیں لیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ارتقائی دور ختم ہو چکا کیونکہ انسان بالکل نہیں سدھر رہا۔ بھینس یہ سب نہ جانتی ہے نہ جاننا چاہتی ہے۔ اگر معلّمین اُسے نقشوں اور تصویروں کی مدد سے سمجھانا چاہیں تب بھی بے سُود ہو گا۔

بھینس کا حافظہ کمزور ہے، اسے کل کی بات آج یاد نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے وہ انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔

اگر بھینس کی کمر میں پتھر یا لٹھ آ لگے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی، ذرا سی کھال ہلا دیتی ہے بس۔ اسے فلسفۂ عدم تشدّد کہتے ہیں۔

بھینسے کو بالکل نکما سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہل میں جوتنے کی سکیم ناکامیاب ثابت ہوئی۔ کیونکہ وہ دائمی طور پر تھکا ہوا اور ازلی سُست ہے۔ اس نے بچپن میں بھینس کا دودھ پیا تھا۔

کبھی کبھی بھینسا چہرے کی جھریوں کو دیکھ کر چونک اٹھتا ہے اور سینگ کٹا کر کٹڑوں

میں شامل ہو جاتا ہے۔ نہیں یہ حرکت کون نہیں کرتا۔

بھینس کے سامنے بین بجائی جائے تو نتیجہ تسلی بخش نہیں نکلتا۔ بھینس کو بین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کبھی کبھی مجھ پر موڈ آتے ہیں جب میں گائے بکری وغیرہ کو بھی بھینس جیسا سمجھنے لگتا ہوں۔

اُلّو

اُلّو بردبار اور دانشمند ہے لیکن پھر اُلّو ہے۔

وہ کھنڈروں میں رہتا ہے لیکن کھنڈر بننے کی وجوہات دوسری ہیں۔ اُلّو کا ذکر پرانے بادشاہوں نے اپنے روزنامچوں میں اکثر کیا ہے لیکن اس سے اُلّو کی پوزیشن بہتر نہیں ہو سکی۔

اُلّو کی بیس قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں پانچ چھ قسمیں کافی تھیں۔ ویسے اُلّوؤں کی عادتیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں، ایک اُلّو کو دیکھ لینا تمام اُلّوؤں کو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔

اُلّو کو وہی پسند کر سکتا ہے جو فطرت کا ضرورت سے زیادہ مدّاح ہو۔ سرو قد کے اُلّو کو بوم کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑے کو چغد۔ چغد سے بڑا اُلّو ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔

پالتو اُلّو وہ لوگ رکھتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کو پالنے کے عادی ہوں۔ اُلّو کی شکل و صورت میں اصلاح کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک اُلّو دوسرے اُلّو کو کیونکر بھاتا ہے۔

دن بھر الّو آرام کرتا ہے اور رات بھر ہُو ہُو کرتا ہے۔ اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ - میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ آپ کا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ الّو تو ہی تو کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ ان خود پسندوں سے ہزار درجہ بہتر ہے جو ہر وقت میں ہی میں کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

شوخ اور ہانوُنی پرندوں میں الّو کا مرتبہ بہت بلند ہے کیونکہ وہ چپ چاپ رہتا ہے اور غالباً حسِ مزاح سے محروم ہے بہت سے لوگ محض اس لئے ذی فہم سمجھے جاتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں مسکراتے۔

الّو یہ انتظار نہیں کرتے کہ کوئی ان کا تعارف کرائے۔ دیکھتے دیکھتے یوں بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں شریکِ حیات منتخب کرتے وقت الّو طبیعت شکل وصورت اور خاندان کا خیال نہیں رکھتے۔ تبھی وہ صدیوں سے ویسے کے ویسے ہیں۔

مادہ ننھے الّوؤں کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے مگر جونہی وہ ذرا بڑے ہوئے اور ان کی شکل اپنے ابا سے ملنے لگی انہیں باہر نکال دیتی ہے۔

الّو کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب بے سُود ہے۔

الّو دوسرے پرندوں سے میل جول کو اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ اپنا وقت اور زیادہ الّو بننے میں صرف کرتا ہے۔ آپ کام سو مہا کام۔ "الّو کا مقولہ ہے"

الّو کا محبوب مشغلہ رات بھر بھیانک آوازیں نکال کر پبلک کو ڈرانا ہے، وہ جانتا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کی مثال تو ہم پرستی میں الّو نے قابلِ تقلید حصہ لیا

ہے۔ بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب اس عزیب الّو کو بتاتے ہیں جو مکان کے پچھواڑے درخت پر رہتا ہے۔ الّو کی نحوست ہوتی ہے مگر اتنی نہیں۔

الّو اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اچھے تو وہ ہوتے ہیں جو دُور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ الّوؤں کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولئے کہ انہوں نے الّو بننے کی التجا تھوڑا ہی کی تھی۔

ماہرین غور کرتے رہتے ہیں کہ الّو ہمیشہ تنہا کیوں نکلتا ہے، الّوؤں کا جوڑا باہر کیوں نہیں نکلتا۔ ماہرین کو یہ بھی ڈر ہے کہ الّو دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں کہیں نایاب نہ ہو جائیں۔ انہیں فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسی چیزیں کبھی نہیں مٹتیں، یہ ہمیشہ رہنے کے لئے آئی ہیں۔

ویسے الّوؤں کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے۔ مگر وہ بات نہیں رہے گی۔

الّو آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے تو اس کی نیت آپ کو پریشان کرنیکی نہیں ہو گی آپ بھی تو اسے گھور رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں وہ زبان ہلائے بغیر آپ کو ہم خیال بنا لے گا۔ اسے ہپناٹزم کہتے ہیں۔

الّو کی تلاش میں آپ کو زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ الّو آپ کے قیاس سے کہیں قریب ہے۔ انسان کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیئے۔ دنیا میں الّو سے زیادہ بُری چیزیں بھی ہیں۔ دو الّو۔

الّو اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر قدرت ایک مرتبہ کچھ ٹھان لے تو پورا کر کے رہتی ہے۔

اس ساری لے دے کے باوجود الّو کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتی ہے۔

بلّی

بلیاں سلطنتِ برطانیہ کے مختلف حصّوں میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بلیوں پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔

بلیوں کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جو لوگ بلیوں کی قسمیں گنتے رہتے ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بلیاں پالنے والوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ بلّی انہیں خواہ مخواہ چاہتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ بلّی کے قیام و طعام کا بندوبست کرتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔

بلیاں دو ہفتے کی عمر میں نازو انداز دکھانا شروع کر دیتی ہیں بغیر کسی ٹریننگ کے۔ سُنا ہے کہ کچھ بلیاں دوسری بلیوں سے خوبصورت ہوتی ہیں۔ بعض لوگ سیاہ بلی کو حسین سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی چیز کو بھی حسین سمجھنے لگیں گے۔ انگورا کی بلّی کی جسامت اور خدوخال کتّے سے زیادہ ملتے ہیں۔ ویسے ایرانی بلی ایک اچھی آل راؤنڈر بلّی کہی جا سکتی ہے۔

ایران میں ایرانی بلیوں پر غیر ملکی بلیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سودیشی بدیشی کا سوال ہر جگہ ہے۔

ایرانی بلی بھی تماشہ ہے، کبھی گربۂ مسکین بن جاتی ہے اور کبھی نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود۔ شاید ایرانیوں نے اپنی بلی کو نہیں سمجھا، یا شاید سمجھ لیا ہے۔

بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ہیں، تنوعی بلی می می آآؤ ؤں کہتی ہے تاکہ ہر ایک سُن لے۔ جب بلّی زیرِ لب بڑبڑانا شروع کر دے اور تنہائی میں دیر تک بڑبڑاتی رہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ زندگی کے بہترین دن گزار چکی ہے۔

گرمیوں میں بلیاں پنکھے کے نیچے سے نہیں ہلتیں، سردیوں میں بن ٹھن کر بن بند ہوا کر دھوپ سینکتی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد یہی ہے۔ بلی کا یہ رشد اپنی نوعمر لڑکیوں کے لئے مہلک ہے۔ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بلی کے لئے مفید ہے۔ وہ سب کے لئے مفید ہو گا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ بلیاں اتنی مغرور اور خود غرض کیوں ہوتی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو محنت کئے بغیر ایسی مرغن غذا ملتی رہے جس میں پروٹین اور وٹامن ضرورت سے زیادہ ہوں تو آپ کا رویہ کیا ہو گا؟

بلی دوسرے کا نکتہ نظر نہیں سمجھتی۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ہم دنیا میں دوسروں کی مدد کرنے آئے ہیں، تو اس کا پہلا سوال یہ ہو گا کہ دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

سال بھر میں بلی سدھائی جا سکتی ہے، اگر سال بھر کی مشقت کا نتیجہ صرف ایک سدھائی ہوئی بلی ہو گا۔ جہاں بقیہ چوپائے دودھ دینے والے جانوروں میں سے ہیں وہاں بلی دودھ پینے والے جانوروں سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر غلطی سے دودھ کھلا رہ جائے تو آپ کی سدھائی ہوئی بلی پی جائے گی۔ اگر دودھ کو بند کر کے قفل لگا دیا جائے تب بھی پی جائے گی، کیونکر؟ یہ ایک راز ہے جو بلیوں تک محدود ہے۔

شکی لوگ بلیوں پر اعتبار نہیں کرتے، بلیاں کیا کریں۔ ان پر ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جب انہیں خود اپنے آپ پر اعتبار نہیں رہتا۔

بلی کو بلانے کے لئے پُوس پُوس، مانو مانو، پُسی پُسی جیسے بے معنی اور غیر مہذب کلمات استعمال کئے جاتے ہیں، اور بلی سمجھتی نہیں۔ تاہم کبھی کوئی بلی خواہ مخواہ ساتھ ہو لیتی ہے

جہاں جاؤ، پیچھا کرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بلیاں پیار سے پنجے مارتی ہیں اور کبھی چند وجوہات کی بنا پر 'غیریت' نہیں سمجھتے کاٹ بھی لیتی۔ شکر ہے کہ بلّی کے کاٹے کا علاج آسان ہے، اس کا کاٹا پاگل نہیں ہوتا۔

بلیاں آپس میں لڑتی ہیں تو ناخنوں سے ایک دوسرے کا منہ نوچ لیتی ہیں اور مہینوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں۔

بلّی اور کتے کی رقابت مشہور ہے، بلّی برداشت نہیں کرسکتی کہ انسان کا کوئی وفادار دوست ہو، بلی میں برداشت بہت کم ہوتی ہے۔

بلّی اپنی کمر کو خم دے کر بہت اُونچا کرلیتی ہیں اور دیر تک کئے رکھتی ہیں، اس کی وجہ تو وہی جانتی ہوں گی۔ مگر وہ جو کچھ کرتی ہیں اکثر غلط ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس طرح وہ گیئر بدلتی ہوں۔

جب بلی چاند کی طرف دیکھ کر بڑی طرح رونے لگے تو روئے سخن آپ کی طرف یا میری طرف نہیں۔ یہ سب کسی اور بلّی کے لئے ہے۔

چند بلیاں گھر میں سارے چوہوں کو ختم کرسکتی ہیں، چوہے تو رفع ہوجائیں گے۔ مگر بلیاں رہ جائیں گی۔ بلیاں دن بھر میک اپ کرتی رہتی ہیں، ان کی جلد پر طرح طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں۔ موٹی بلیاں اپنے جسم پر لمبائی میں سیدھی دھاریاں بنالیں تو ان کا مٹاپا چھپ سکتا ہے۔ وہ چھریری اور کیوٹ معلوم ہوں گی۔

بلیاں دوپہر کو سوجاتی ہیں، وہ رات تک انتظار نہیں کرسکتیں۔ بعض اوقات

بظاہر سوئی ہوئی بلّی اِدھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس سے باز پرس کی جائے تو خفا ہو جاتی ہے۔ بلی کی جگہ کوئی بھی ہو خفا ہو جائے گا۔ ایک ہی گھر میں سالہا سال گزارنے کے باوجود انسان اور بلّی اجنبی رہتے ہیں۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔

بلی سامنے سے گزر جائے تو لوگ خوشخبری کا انتظار کرتے ہیں۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے میں کسی کام جا رہا تھا اسی طرح بلی بھی کہیں جا رہی ہوگی۔

اندھیرے میں کالی بلّی کا نظر آجانا خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے۔ پتہ نہیں بدقسمتی کیا ہوتی ہوگی۔

خیر جو کچھ بھی ہو ہم سب کی تقدیر میں لکھی ہے۔ اپنی بلّی سے بچنا محال ہے۔ کوئی دلیر ہو یا بزدل، عقلمند ہو یا احمق، کسی نہ کسی دن ایک بلی اسے آلے گی۔ ویسے ایرانیوں کا اصول ہے کہ گُربہ کشتن، روزِ اوّل۔

میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ میں بیویوں سے دُور رہتا تو بہتر تھا۔

سفرنامہ جہاز باد سندھی کا

بسم اللہ، دیباچۂ فسانہ نغمہ زنی عندلیب خانہ، رنگین ترانہ، راست براست، بلا کم و کاست، یعنی تذکرۂ جہاز باد سندھی عفی عنہ،

اے صاحبو! خدا آپ کا بھلا کرے۔ مدت مدید و عرصہ بعید کا ذکر ہے کہ ایک سہ پہر کو ایک نوجوانِ نحیف و نزار (کہ جسے نوجوان سمجھنا نری خوش فہمی تھی) کافی ہاؤس کے دروازے پر زندگی سے بالکل بیزار کھڑا تھا۔ نام اس دراز قد کا جہاز باد تھا۔ تخلص سندھی اور لقب خورد حلیہ اس کا فاقہ زدہ تھا۔ اور سر کے بال ماڈرن خواتین کے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ ناک پر ایک شکستہ عینک زندگی کے دن توڑ رہی تھی شیو اس نے ہفتے بھر سے نہیں کروایا تھا۔ بغل میں اس کے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ پوشاک اس کی ایسی تھی کہ گمان تک نہ ہوتا کہ اس نے پوشاک کو پہن رکھا ہے معلوم ہوتا تھا کہ پوشاک ہے جو اسے پہنے ہوئے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نوجوان انٹیلکچوئل طبقے سے متعلق تھا۔!

اس نے اپنی سائیکل سنبھالی، ملازم کو اگلے روز بخشش دینے کا وعدہ کیا اور مال روڈ پر ہوا ہو گیا۔ چوک کے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑتا کہیں کا کہیں جا پہنچا ایک عالی شان محل کے سامنے اسے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی۔ جیسے خیالات کی روانی میں دفعتہً الجھن پیدا ہو گئی ہو۔ چونک کر دیکھا تو پچھلے پہیے میں پنکچر ہو چکا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور دکانیں بند تھیں یا یُننا ک کہ وہ حضرات جو ایک پمپ اور پنکچر لگانے کا ذرا سا سامان لے کر سائیکل ورکس کھول لیتے ہیں اور پروپرائٹر کہلاتے ہیں۔ غائب غلّا ہو چکے تھے۔

اتنے میں محل کے دروازے سے ایک شخص ہاتھ میں کار آمد شے تھامے نمودار ہُوا اسے دیکھ کر جہاز باد کی عینک مسرت سے چمک اٹھی، اس نے بڑھ کر پمپ مانگا۔ اس شخص نے دے دیا۔ جہاز باد نے اسے کھینچا، مروڑا، کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا، بس یہ وہ مردِ توانا زیرِ مونچھ مسکرایا (کہ اس کا چہرہ ایک جوڑی سیاہ گھنی اور عمدہ مونچھوں سے مزیّن تھا) اور بولا — اے مردِ ناداں مزید کوشش عبث ہے کیونکہ یہ پمپ نہیں ڈنڈا ہے۔

جہاز باد نے سائیکل ایک طرف رکھ دی اور محل کی جانب متوجہ ہُوا۔ دروازے پر بورڈ پڑھا تو عینک کے شیشے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، لکھا تھا "جہاز باد سندھی کلاں"

ذرا قریب گیا تو مرغانِ نواسنج کی زمزمہ پردازی دل کو لبھانے لگی، ہزار، طوطی کی صدا آنے لگی، انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے دماغ طبلۂ عطار بن گیا۔ ذرا سی دیر

میں یہ طبلہ بجنے لگا۔ ریڈیو پر نغمۂ دلربا اور رباب کی آوازِ خوش کانوں میں آئی۔ طعمۂ لذیذ کی خوشبو آتی تھی۔ بادۂ خوشگوار کی صراحی قلقل کی صدا سنائی تھی۔ دیکھا کہ احباب بذلہ سنج اور خاتونانِ ذی مرتبہ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہمجولیاں قہقہے لگاتی ہیں۔

جہاز باد سوچنے لگا کہ صرف خورد اور کلاں کا فرق ہے مگر کوئی مجھ سا بے نصیب، بد طالع، بدبخت ہے، کوئی صاحبِ تاج و تخت ہے اس مکان کے مکین پر بڑی عنایت ہے اور مجھ گنہگار پر یہ عتاب۔ یہ کسی شاہِ فلک بارگاہ کا ایوانِ سپہر توامان ہے۔ یا روضۂ رضوان ہے۔ کہیں حور ہے، تو کہیں غلمان ہے۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی مردِ قوی مونچھ نے آکر پیغام دیا ہے کہ صاحبِ مکان نے فرمایا ہے کہ ہمارا سلام بولو۔ جہاز باد خورد نے کہا۔ وعلیکم السلام اور روانگی کا قصد کیا۔ مگر وہ مرد قوی ہیکل کہنے لگا کہ صاحبِ خانہ یاد فرماتے ہیں۔ جہاز باد سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو صاحب مکان کوئی ماہر نفسیات ہے جس نے اتنی دور سے میرا تجزیۂ نفسی کر کے خیالات بھانپ لئے ہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس مونچھ مچھندر نے ہاتھ پکڑا اور اندر لے گیا۔ جہاں شاندار دعوت منعقد تھی۔ حیرت ہوئی کہ یا الٰہی اتنی خوبرو اور گلبدن حسینائیں پُرفن شوخ و شنگ رشکِ گل رخانِ فرنگ کیونکر ایک مقام پہ جمع ہیں۔

جہاز باد سندھی کلاں بڑے تپاک سے ملا اور گویا ہوا۔ "اے معزز اجنبی حضرت دیکھنے میں تو آپ انٹلکچوئل معلوم ہوتے ہیں۔"

جہاز باد خورد نے اثبات میں سر ہلایا۔ جہاز باد کلاں کی باچھیں کھل گئیں۔ "الحمد للہ۔ یہ خاکسار بھی کبھی انٹلکچوئل تھا۔ یہ سب شہزادیاں اور شہزادے ایسے

ہیں جو انٹلیکچوئل ہیں۔ ہونے والے ہیں یا کبھی تھے۔ آپ ان سے ملئے۔"

سب خوب بغلگیر ہو ہو کر ملے۔ اگرچہ جہاز باد خورد گدگدی سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ عید کے روز چھپتا پھرتا۔ تاہم ایک موہوم سی اُمید پر اس نے بغلگیر ہونا شروع کر دیا لیکن جب شہزادیوں کا نمبر آیا۔ اور اس نے سرخ لباس والی حسین شہزادی سے بغلگیر ہونے کی کوشش کی تو کامیابی نصیب نہ ہوئی وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" جب دونوں جہاز بادوں نے ایک دوسرے کا نام سنا تو کمال درجہ محظوظ بھی ہوئے اور محفوظ بھی۔

جہاز باد کلاں نے خورد کو ایک چھوٹا پیگ دینا چاہا تو وہ معذرت خواہی کرتے ہوئے گویا ہوا۔" یا پیر و مرشد ابھی سورج نظر آتا ہے، غروب آفتاب سے پہلے وہسکی سے گریز کرنا چاہیئے۔ البتہ بیئر وقت کی چیز ہے۔"

جہاز باد کلاں یہ تقریر سُن کر دم بخود رہ گیا عش عش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شہزادیوں کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور یوں بولا۔" اے باذاق انسان بیئر کا گلاس نوش جان فرما اور بار بار دروازے کی طرف مت دیکھ، تیری سائیکل ہم نے مرمت کے لئے بھیج دی ہے۔"

ہوالشّافی کہہ کر وہ جام جہاز باد خورد نے پیا اور دوسرا انڈیلنے لگا۔ جہاز باد کلاں نے اس کی جانب شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔" اے نوجوانِ سلیقہ شعار ہم خوش ہوئے۔ لیکن یہ مت بھولو کہ یہ خدائے ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے کہ ایک گدائے بے نوا کو چشم زدن میں صاحب دولت و جاہ کرے اور قارون سے مالدار کو ذرا سے اشارے سے تہہ خاک و تباہ کر دے تو ضرور حیران ہو گا کہ

یہ نعمتیں ہمیں کیونکر میسّر آئیں۔ یہ فرمانبردار بہرے جنہیں سنائی بھی دیتا ہے یہ افرنگی بیٹر جو غلط شدہ غم صحیح کرتی ہے۔ یہ پر رونق محفلیں، یہ سب کچھ ہمیں یونہی نہیں ملا ہم۔"

"واحد متکلم صیغہ استعمال کیجئے۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

"معاف کیجئے تو اس کے لئے مجھے کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں اس کا ذکر میں ابھی سناؤں گا۔"

محفل میں یکلخت کھلبلی سی مچ گئی۔ کوئی گھڑی دیکھنے لگا۔ کسی کو ضروری کام یاد آگیا کسی نے کہا ابا جان انتظار کر رہے ہوں گے۔ کوئی بولا یہ کہانی اتنی مرتبہ سنی ہے کہ زبانی یاد ہو چکی ہے۔ جب سب جا چکے تو جہاز باد کلاں نے خورد کے لئے چوتھا گلاس انڈیلا، کباب سامنے رکھے اور یوں کلام کیا۔

جہاز باد سندھی کا پہلا سفر

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا مے رود دیوار کج

اے میرے معزز ہم نام تُو نے ان شہزادیوں کی مینا چشمی دیکھی، حیرت ہے کہ تجھے کوئی ضروری کام یاد نہ آیا یہ بیئر پھسپھسی معلوم ہوتی ہے۔ نئی بوتل کھول اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھ۔"

"اے میرے محترم ہم نام، اِدھر اُدھر کی باتوں سے پرہیز فرما اور اپنا سفر بیان کر۔"

"یہ ان دنوں کا ذکر ہے —" کلاں گویا ہوا — "کہ جب یہ خاکسار نیا نیا جوان ہوا تھا۔ اُن دنوں بجے۔ بادسندھی کہلاتا تھا۔ بعد میں بجے۔ بی سندھی ہو گیا۔ اس علاقے میں کئی اور بجے۔ بی سندھی بھی تھے۔ چنانچہ کلاں کا اضافہ کیا۔ ناچیز کو فنونِ لطیفہ، فنونِ لطیفہ شناسی، فنونِ حرب وغیرہ۔ فنونِ جمع و تفریق میں خاصی شُدبُد تھی۔ موسیقی میں وہ مہارت تھی کہ شدھ سارنگ، شدھ کلیان، شدھ بکر دھوج سب بخوبی گا سکتا ہے۔ لیکن طبیعت میں اس بلا کی سادگی تھی کہ ایک بھیڑیئے کو السیشن کتا سمجھ کر پکڑ لایا اور کئی دنوں تک ساتھ ساتھ لئے پھرا۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو ایک بھیڑ کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔ سیب کے درخت کو تبھی پہچان سکتا اگر اس میں سیب لگے ہوں۔ ورنہ پھلوں یا پھولوں کے بغیر پودے اور درخت میرے لئے یکساں تھے۔ نصیب دشمناں علیل ہوا تو طبیب نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ حقیر نے گلے میں باندھ لیا اور شفا پائی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تعویذ نہ تھا نسخہ تھا۔ ایک مرتبہ سرِ راہ ملنے پر حکیم سے دریافت کیا کہ اسے کھانا کھانے سے پہلے استعمال کروں یا بعد میں۔ لغت میں قیلولے کے معنے دیکھے تو ہکا بکا رہ گیا۔ برسوں دوپہر کے کھانے کے بعد سویا کیا۔ لیکن کبھی احساس تک نہ ہوا کہ ایسی معمولی سی حرکت کتنے تاریخی قیلولے کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں کہ قاف جس کا حلق میں فلک شگاف گونج پیدا کرتا ہے
جب فارغ التعلیم ہوا یعنی تعلیم نے مجھ سے فراغت پائی تو چند جاں نثاروں نے سیاست کی طرف رغبت دلائی۔ فدوی نے رجوع کیا اور رات دگنی دن چوگنی ترقی نصیب ہوئی۔ میری آتشیں تحریروں نے کئی جگہ لاٹھی چارج کرایا۔ متعدد مقامات پر جوتا چلا۔ کئی اخبارات ضبط ہو گئے۔ اس حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ میرے

دو جگری دوست تھے جو بے حد معمولی صلے کے عوض یہ سب کچھ لکھ دیا کرتے۔ فلکِ کج رفتار کو میری شہرت ایک آنکھ نہ بھائی اور دفعتاً میری تحریریں نمام ہوئیں چند ہی مہینوں میں خود غرض دنیا مجھے بھول گئی محض میرے دوستوں کی وجہ سے۔"

"تو کیا آپ کے وہ دوست داعی اجل کو لبیک کہہ اٹھے۔؟"

"نہیں! ان میں سے ایک تو ضلعدار بن گیا۔ اور دوسرا مجسٹریٹ درجہ سوئم۔ کچھ دنوں کے لیئے تو دنیا اندھیر معلوم ہوئی۔ پھر شاعری کا شوق چرایا، محروم تخلص کیا غزل میں ترنم کا یہ عالم تھا کہ ہر شعر کی وُرنت سے پر بھی تین تالہ بج سکتا تھا۔ اور بلمپت لے پر بھی۔ غزل کے لئے طبیعت غیر حاضر ہوئی تو آزاد نظم بڑی آزادی سے کہہ لیا کرتا خدا کا کرنا کیا ہوا کہ محلسرا کے باہر جو بیچدان کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا وہ کسی ضرورت مند نے چرا لیا۔ دروازہ نئے بورڈ سے مرصع کیا گیا۔ مجھے بغرضِ تبدیلِ آب و ہوا خانیوال جانا پڑا۔ واپس لوٹا تو خطوط کا ایک پلندہ منتظر پایا یہ سب تعزیت نامے تھے۔ حیران تھا کہ کس نے کس کی جانِ آفریں کس کے سپرد کی۔ جو بورڈ دیکھتا ہوں تو کاتب نے غلطی سے محروم کی جگہ مرحوم لکھ دیا تھا۔ اسی روز بورڈ بدلا۔ لیکن شہر بھر میں رسوا ہو چکا تھا۔ سندھی تخلص کرنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا شاعری ترک کرنا پڑی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ باہمت شاعری گئی تو کیا ہوا اور بہت سے مفید مشغلے ہیں۔ اس ملک میں انسان کی اوسط عمر بیس بائیس سال ہے تو یہ عمر کبھی کی گزار چکا۔ اب اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ اور پیری مریدی کی طرف رجوع کر ایک دفعہ نام چمک اٹھا تو وارے نیارے ہو جائیں گے چنانچہ اس ناچیز نے اس سلسلے میں بڑا اضافہ کیا۔ بہاول پور اور سندھ کے تکیوں میں بیشتر وقت گزارا۔

قابل فقیروں ملنگوں سے ٹریننگ حاصل کی۔ بھنگ سے بصیرت افروز ہوا۔ لیکن قسمت میں چکر لکھا تھا کہ کسی ایک۔ لائن کو شک نہ کر سکا۔ ایک دن اتفاق سے آلڈس ہکسلے، ورجینیا وولف، برٹرنڈ رسل کی کتابیں ایک کباڑیئے کے ہاں اتنی سستی مل گئیں کہ خریدنا پڑیں۔ چونکہ خرید چکا تھا۔ اس لئے ورق گردانی پر مجبور ہو گیا اچھا بھلا بیٹھا تھا اچانک بشارت ہوئی کہ تو انٹلیکچوئل ہے اگرچہ یہ دُرِ بے بہا خاکسار نے ورثے میں پایا تھا۔ تاہم خاندانی انٹلیکچوئل کہلاتے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے کافی ہاؤس جانا شروع کر دیا۔ پوشاک، غذا، ورزش اور چلنے سے لاپرواہ ہوتا چلا گیا سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ پڑوسیوں سے بات کرنا تو ایک طرف ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ میری زندگی ایک انقلاب سے آشنا ہوئی ایک چاندنی رات کو جب میں کافی ہاؤس سے لوٹا تو ایک پرندہ بالکل میرے سر کے اوپر سے گیا یہ واہمہ نہ تھا۔ تشویش ہوئی۔ کیونکہ مقامی پرندے بڑے سست اور ڈرپوک تھے اندھیرا ہو چکنے کے بعد کبھی نظر نہ آتے دل میں یہ شبہ یقین پا گیا کہ ہو نہ ہو یہ پرندہ ہما اس مژدہ جانفزا سے روح کو سرور حاصل ہوا۔ اور طبیعت کو کمال درجہ سکون۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سب کچھ ساکن ہے زندگی میں تسلی بخش راحت ہے۔ دنیا میں امن ہے اور میں انٹلیکچوئل ہوں۔

اچانک ایک سائنس دان دوست نے بڑی بُری خبر سنائی کہ میں ساکن ہرگز نہیں ہوں۔ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد زمین کی گردش کی وجہ سے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم جاتا ہوں فضاؤں میں کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑا جا رہا ہوں سورج کے گرد ہر سال بیس کروڑ میل کی مسافت طے کرتا ہوں اور کہکشاں کی جانب ڈیڑھ سو میل فی سیکنڈ

کی رفتار سے جھکا جا رہا ہوں ــــ ادھر کی گردش، اُدھر کی گردش، اس طرف، اُس
طرف، ہر طرف رواں دواں، میرے کانوں میں تیز ہوا سے شوں شوں ہونے لگی
چکر پر چکر آنے لگا۔ فوراً ٹھیکہ شراب دیسی، پر پہنچا (جہاں ہندوستانی شرفا بیٹھ
کر پی سکتے ہیں) جب باہر نکلا تو دنیا تاریک تھی دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا۔
کہ کیا کروں اتنے میں شاہراہ پر ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ساتھ گھنٹی بج رہی تھی دونوں
کی ہم آہنگی اس قدر خوش الحان معلوم ہوئی کہ مُردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ میں لاشعوری
طور پر پیچھے ہو لیا۔ جب چونکا تو اپنے آپ کو اکھاڑے میں پایا۔ غیر انٹلکچوئل ہجوم
کو دیکھ کر بہت گھبرایا۔ پہلوانوں نے طرح طرح کے پٹھے ساتھ بٹھائے ہوئے تھے
وہاں اپنے ماموں جان کو بھی دیکھا (کہ خطاب جس نے پہلوان السندھ کا پایا تھا)
وہ ایک ہاتھ ہوا میں اٹھائے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا اکھاڑے کا طواف کر رہا
تھا۔ اس کا پٹھا پیچھے پیچھے تھا۔ غالباً میں نے اپنے عمِ محترم کا ذکر نہیں کیا کہ گھر اس
کا ایک بیسوی صدی کی امریکن طرز کی محلسرائے تھی جس کا نقشہ ملکِ فرنگ کے ایک
ذی فہم زیرک کاریگر نے تیار کیا تھا۔ اس کے دروازے پر بیک وقت تین چار موٹریں
(کہ اہلِ فرنگ کی صناعی و جادوگری کا حیرت انگیز ثبوت ہیں) کھڑی جھومتی تھیں
وہ احتشام، وہ دبدبہ، وہ طمطراق تھا کہ انٹلکچوئل جب سامنے سے گزرتے تو منہ دوسری
طرف پھیر لیتے ویسے یہ مردِ طرار ناپ تول کا پورا تھا۔ فنِ تراز و طرازی میں اس
کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس کے دروازے پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہمیشہ
اژدحام رہتا کیونکہ آٹے اور چینی کا راشن اس کے اختیار میں تھا۔

کشتیاں فراہم ہوئیں تو ماموں جان کی نظر اس طرف پڑ گئی۔ اس نے گردن سے آ

بوچار زور سے دھپ لگا کر بولا۔۔۔ سنا بے گیدی یہاں کہاں پھر رہا ہے کہ مقام
تیرا کافی ہاؤس اور مریل نوجوانوں کی محفل ہے ایسی جگہ آتے ہوئے اپنے تئیں شرم محسوس
نہیں کرتا؟ یہ کہہ کر وہ تو پہلوانوں کے غول کے ساتھ سوئے ڈپو روانہ ہوا۔ اور اس
فقیر کو کمال خفت اٹھانی پڑی سوچنے لگا یہی مروک کبھی تانگے کے گھوڑے کی طرح
لاغر تھا۔ خدا کی شان کہ ڈپو پہ آتے ہی اس قدر توانا ہو گیا کہ فیل بھی دیکھے تو بغیر پانی
مانگے شرم سے ڈوب مرے۔ اور اس پر ایسی گفتگو۔۔۔ واللہ، یہی جی چاہتا تھا کہ سڑک
پر دراز ہو جاؤں اور اپنے آپ کو جان بحق تسلیم کر دالوں۔ یکایک ایک صدائے روح
پرور سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوش پوشاک نوجوان (جو فقط ایک لنگوٹے
سے مرصع تھا) ڈھول پر رقصاں ہے۔ بس یہ اس خاکسار کے پاپوشوں کو حرکت
ہوئی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ تمام جسم میں حلول کر گئی۔ یہاں تک کہ ضبط نہ رہا اور
یہ حقیر اس قلندرِ خوش لباس کے پیچھے ہو لیا۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ ڈھول والے
کی کمر پر ایک بورڈ ہے چشم زدن میں چشمہ (جو ماموں جان کے دھپ سے اتر
گیا تھا) جیب سے نکالا۔ آہ سرد بھری۔ جس سے شیشوں پر چند قطرے نمودار
ہوئے۔ قمیض سے عینک صاف کر کے ناک پر رکھی تو آنکھوں کو وہ تقویت پہنچی
کہ بیان جس کا احاطۂ تحریر سے باہر ہے بعد از مطالعہ انکشاف ہو کہ وہ ریڈیم ٹانک
پلز کا اشتہار تھا۔

عم محترم کا وہ طعنہ جو اس ناچیز کی صحت پر کھلم کھلا حملہ تھا تیر کی طرح پیوست ہو
چکا تھا۔ قصد انتقام کا یہ نیاز مند کر چکا تھا۔

ایک دن ماموں جان نے اپنی دکان پر کسی کو چینی دینے سے معذرت چاہی

کیونکہ حقیقتاً اتنی چینی بِک رہی تھی جو اس کے احباب کے لیئے درکار تھی۔ اس نے گاہک کو اپنی شیریں بیانی سے خوش کرنا چاہا لیکن وہ شخص کہ شرارت کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ کاغذ کا ایک پرزہ دکھا کر دکان کی تلاشی لینے کا متلاشی ہوا۔ عین اس وقت جب وہ مفسد دکان کے اندر گیا۔ عم محترم اپنی بیوک میں بیٹھ کر ملسرا پہنچا اور خواجہ سرا سے رخصتِ سفر بند ھوا کر سرحد کا قصد کیا۔ لیکن سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ ماموں جان کو روک لیا گیا۔ اور سرکاری مہمان خانے میں (کہ اس ملک میں جیل کہلاتا ہے) قیام و طعام کا بندوبست دو روز تک رہا۔ اتنی دیر میں بلند مرتبہ اور عالی مقام حضرات کی سفارشیں پہنچ چکیں تھیں۔ چنانچہ جب اُسے قاضی صاحب کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے فقط پہلوان السندھ کا خطاب واپس لے کر چھوڑ دیا۔

ماموں جان کو اس صدمے نے نڈھال کر دیا۔ کیونکہ اسے پہلوانی اور سیاست بے حد عزیز تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ دو چیزیں تھیں۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلوان السندھ کوئی ایسا بڑا خطاب نہیں جس کے لیئے جان ہلکان کر لی جائے۔ آپ پہلوان الہند بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ فاضلِ اجل علاّمہ اقبالؒ فرما گئے ہیں ــــ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

میرا ماموں اس پر پھڑک اٹھا اور کہنے لگا۔ واہ واہ۔ مگر برخوردار اس کا اگلا مصرعہ کیا ہے۔ وہ غالباً میرے حق میں زیادہ مفید ہو گا۔

دوسرا مصرعہ اے محترم عشق کے امتحانوں کے متعلق ہے۔

واہ، تو عشق کے بھی امتحان بھی ہوتے ہیں۔ کونسی یونیورسٹی لیتی ہے؟

میں نے اس مردِ جاہل سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ گویا یہ شخص

عم اس نانشدنی کا تھا۔ بزرگوں کا ادب پاسِ حکم خداوندی ہے۔ مگر جہالت اس کے چہرے پر ہُن کی طرح یوُں برستی تھی کہ اس ناچیز کو اس کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوتی۔

عشق کے امتحانوں کے متعلق کیا فرما گئے ہیں علاّمہ؟ اس نے اصرار کیا۔

یہ دوسرا مصرعہ اے عم محترم آپ جیسے پیر فرتوتوں کے لیے نہیں۔ مجھ جیسے نوجوانوں کے لیئے ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ پہلے مصرعے کا ہی اپنے اوپر انطباق کریں۔ میں نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

مجھے ستاروں سے کوئی دلچسپی نہیں (وہ آہ سرد کھینچ کر بولا) مگر دوسری چیز عشق بالکل میری لائن میں ہے۔ اور برخوردار تو گستاخ ہوتا جا رہا ہے۔

اس نے اپنی انگلی کا ٹھینگا بنا کر میرے سر کے مختصر سے گنج پر مارا، نہایت مترنّم آواز نکلی۔ جو کانوں کو تو بھلی معلوم ہوئی لیکن خودداری نے لعن ملامت شروع کر دی۔ یہی خیال آتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر سٹیشن پہنچا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ پھر سوچا کہ اے مردِ مجہول کیوں اپنے ماموں سے ڈرتا پھرتا ہے۔ طاقتور بن اور اس کا مقابلہ کر۔ اس دن سے میں نے کافی ہاؤس جانا ترک کر دیا۔ اور ساری کتابیں ایک بھٹیارن کے حوالے کیں کہ وہ بقدرِ ضرورت استعمال میں لائے اور ریڈیم ٹانک پلز کھانے اور مگدر گھمانے میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ڈنڑ پیلنے کے بعد تین گولیاں کھاتا۔ لنچ تک بیٹھکیں نکالتا۔ لنچ پر چار گولیاں۔ پھر ڈنڑ اور مگدر، رات کو پانچ گولیاں۔ ہفتہ گذرا ہو گا۔

یقین جانیئے بدن سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ اندھیری سے اندھیری رات میں بغیر روشنی کے چل پھر سکتا۔ طاقت کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آٹھویں دن خواہش پیدا ہوئی کہ شیر ببر پر سواری کی جائے۔ لنگوٹا کس کر چڑیا گھر پہنچا۔ مگر شیروں کو پنجروں میں دھاڑتے دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کیوں نہ عمِ محترم کی خبر لی جائے۔ چنانچہ اُسی لنگوٹ میں ماموں کی محلسرا پر پہنچا۔ نوکر چاکر ڈر کر بھاگ گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں جان بسترِ استراحت پر بصد خضوع و خشوع دعا مانگ رہا ہے کہ اے باری تعالیٰ میرے اس نابکار بھانجے کو توفیق دے کہ کافی ہاؤس جانا ترک کر دے۔ اور اپنی روزی خود کمانے لگے۔ مجھے بھی یہی توفیق دے۔ ہم سب کو یہی توفیق دے۔ میں اب بالکل سیدھا ہو گیا ہوں۔ تیری شان ہے کہ جس کی ڈیوڑھی پر بیکار ڈلے اور کیڈی لک جھومتی تھیں وہاں اب گدھا تک نظر نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ کہیں مجھے کسی انٹلکچوئل کی بد دُعا تو نہیں لگی۔

بس بس اے مردِ بدبخت اُٹھ! میں نے تیرے فیل تن ہونے کا راز پالیا ہے۔ اور خبردار جو کسی انٹلکچوئل کو بُرا بھلا کہا ہے تو، خبردار جو کسی کو بُرا بھلا کہا ہے، کیا ہم سب ایک جیسے نہیں، سب برابر نہیں۔ میں برابر ہوں برنارڈ شا کے، برنارڈ شا برابر ہے کنفیوشس کے، کنفیوشس مساوی ہے ابنِ بطوطہ کے۔

اے عزیز از جان بھانجے! آج سے مجھے اپنا ساتھی سمجھ۔ تیرے حق میں جو دُعا کی تھی وہ میں واپس لیتا ہوں۔ اُس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

دفعتہً مجھے محسوس ہوا کہ صحت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدے بھی بدل

بدل چکے ہیں۔ مجھے انٹلکچوئل پناہ دبھر دکھائی دینے لگا۔ کہ اس طبقے میں رہنا بڑا مشکل ہے۔ انہیں لوگ سمجھتے نہیں۔ ہر وقت مذاق اڑاتے ہیں۔ سارا جیب خرچ طبیبوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ صحت اس طبقے کی نہایت خستہ ہوتی ہے۔ ملازمت کے لیئے انٹرویو میں جاؤ تو آسان سے سوالوں کے جواب مشکل سن کر ممبرون کو احساسِ کمتری ہو جاتا ہے۔ اور وہ خواہ مخواہ فیل کر دیتے ہیں۔ ویسے پبلک حلیہ دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ الغرض ان لوگوں کو سوائے ہوا پھانکنے کے اور کچھ میسّر نہیں آتا۔ اور ہوا میں غذائیت نہیں۔ سچ پوچھو تو ارادہ اس خاکسار نے اس روز بدلا جب عیدگاہ میں دو بزرگوں کو بغلگیر ہوتے دیکھا۔ دونوں بھینگے تھے مگر بلا کے انٹلکچوئل تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ہاتھ پھیلائے، مسکرائے، زیرِ لب کلماتِ خوشگوار لائے اور ایک دوسرے کے برابر سے نکل گئے۔ جب غلطی کا احساس ہوا تو نعرے بلند ہوگئے۔ "کہاں چلے گئے؟" "میں تو یہاں ہوں اور تم؟" "یہ رہا"۔

مڑے اور بغلگیر ہونے کے قصد سے واپس لوٹے لیکن اس دفعہ پھر نشانہ خطا ہو گیا۔ تیسری مرتبہ بغلگیری پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

رات کو اس نیازمند نے ایک خواب دیکھا کہ اپنے ایک انٹلکچوئل اُستاد سے بغلگیر ہوتے وقت جو انکی کمر پہ ہاتھ پھیرتا ہوں تو چونک پڑا۔ ان کی دم غائب تھی۔ جاگا تو عبث شرمندہ ہوا۔ اسی دن سے میں نے اس انٹلکچوئل بننے بلکہ بننے سے کنارہ کشی کی۔ (PSEUDO-INTELLECTUAL) بھئی تو سن نہیں رہا ہے اونگھ رہا ہے۔

سامنے تقریر کرتے سُنا - وہ کہہ رہا تھا کہ ۔ سب لوگ برابر ہیں۔ سب مرد برابر ہیں، سب عورتیں برابر ہیں، سب بچے ایک سے ہیں۔ لہذا سب کو برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ زندگی آسان ہو سکتی ہے، بس میں سفر کیجیے، ساڑھے چار آنے میں سیکنڈ شو دیکھئے، اندھیرا ہو جانے پر اندر جائیے اور روشنی ہوتے سے پہلے باہر نکل آئیے، میونسپلٹی نے کہیں کہیں ریڈیو نصب کیے ہیں اور ان پر موسیقی (جو اسی فیصدی فلمی ریکارڈوں پر مشتمل ہے) اور خبریں سُنی جا سکتی ہیں۔ بک سٹال پر کھڑے ہو کر ذرا سی دیر میں تار، رسائل اور نئی کتب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک لیے سے اوور کوٹ سے سردیاں نکل سکتی ہیں اور دو رنگین بش شرٹوں سے گرمیاں ذرا سی خوشامد سے بآسانی محبت کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ مت بھولیے کہ سب لڑکے ایک جیسے ہیں اور سب لڑکیاں ایک سی ہیں۔ مثال کے طور پر روس میں ۔

وہ روس کا ذکر زبان پر لایا تو مجھے شُبہ سا ہوا ؟ اگرچہ معلومات اس احقر کی روس کے بارے میں نہایت محدود ہیں تاہم بحث کرنی ہو تو گھنٹوں بول سکتا ہے۔ اے ہم نام خورد تیرا روس کے متعلق کیا خیال ہے ؟

اے ہم نام کلاں معلومات تو میری بھی ایسی ویسی ہیں، اگرچہ میں نے گراؤ ۔ چو مارکس کی لکھی ہوئی مشہور و معروف کتاب سرمایہ داری پڑھی ہے ۔

نہیں یہ کتاب کارل مارکس نے لکھی ہے ۔

تو وہ بھی تو مارکس برادرز میں سے ہو گا ۔ مارکس برادرز کو ماشاء اللہ کون نہیں جانتا ۔

خیر، تو میں تقریر سنتا رہا، اس نوجوان کے بعد ایک شہزادی نے تقریر

نہیں تو — "جہاز باد خورد دفتہ" جاگا۔

اچھا بتایئں کیا کہہ رہا تھا — ؟

جہاد بادجندی، رہاز بہاد رندی، نہاز باد تندی۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیٹر کا اثر ہے۔

ہرگز نہیں! یہ سفر ہی بہت لمبا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیدل طے کیا گیا تھا۔ اور یا ہمدم وہ پرندہ کون سا تھا جو آپ کے سر مبارک کے اُوپر سے گذرا؟

اے ہمدم نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ پرندہ وہ بُوم تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ وہ اس حقیر کے سر پر سے گذرا۔

کرنا تمام پہلا سفر جہاز باد سندھی کلاں کا۔ رخصت ہونا جہاز باد سندھی خورد کا ساتھ وعدہ آنے کے اگلے روز، بغرض ساعت سفر دوم۔

اگلے روز جب محفل منعقد ہوئی تو اس میں صرف دو حضرات شامل تھے۔ خورد اور کلاں۔ ہر چند کہ استادِ کلاں نے شہزادے شہزادیوں کا بے صبری سے انتظار کیا۔ بار ہا ٹیلیفون کیا لیکن مایوسی ہوئی۔ ناچار چار منگوائی، خورد چاء دیکھ کر نہایت غمگین ہوا اور یہ مصرعہ زبان پر لایا — چاء راکن چاء درپیش — لیکن کلاں نے اُس کی بات سُنی ان سُنی کر دی اور بولا —

جہاز بادسندھی کا دوسرا سفر

حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

اے عزیز از جان ہم نام ایک دن چوک میں مَیں نے ایک شخص کو ہجوم کے

شروع کر دی۔ خاکسار نے تقریر سے زیادہ شہزادی میں دلچسپی لی۔ معلوم ہوا کہ اس پارٹی میں چند شہزادیاں بھی ہیں۔ ان میں سے تو واللہ دو تین شہزادیاں خوب تھیں ناچیز نے چشم و دل کو ان کی دید سے تر و تازہ پایا اور اپنے تئیں اس ٹولی میں شامل ہونے پر آمادہ پایا۔

لیکن پتہ چلا کہ شامل ہونا آسان نہیں، کافی چھان بین کے بعد یہ لوگ اپنے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے ان کے سرپرست کا کھوج لگالا کسی نے بتایا کہ ان کے بچے سبزی ہائے تازہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبیبوں کا اصرار ہے کہ سبزیاں بچوں کی بہبود کے لیے از حد اشد ہیں۔ اُدھر بچے ہیں کہ نباتات، جمادات اور معدنیات سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کو چھوتے تک نہیں۔ میں نے ان حضرت سے مل کر اس مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ چند گاجریں تکیوں کے نیچے رکھ دیں۔ کچھ ٹماٹر بالائے طاق رکھے، شلجم کتابوں کے نیچے چھپا دیئے۔ بچوں کو جب یہ چیزیں فرداً فرداً ملیں تو سمجھے کہ انھوں نے چرائی ہیں، خوب سیر ہو کر کھائیں۔ ان کے ابّا نہایت خوش ہوئے۔ اور گلہ اپنے پیارے کتّے کا کرنے لگے۔ جو علیل تھا۔ مگر دوائی پینے سے احتراز کرتا۔ میں نے پہلے تو دوائی اس سگِ نابکار کے دہن میں اُنڈیلنا چاہی۔ جب اس نے متواتر ناراضامندی کا اظہار کیا۔ تو شیشی فرش پر پٹخ دی۔ بس پھر اس سگِ ناعاقبت اندیش نے زبان سے ساری دوائی چاٹ لی۔ اور کیفر کردار کو پہنچا۔ وہ حضرت کمال درجہ مہربان ہوئے اور بولے — اے مردِ عاقل! تو دولتِ نفسیات سے مالا مال معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا مانگتا ہے؟

میں نے آرزو بیان کی کہ کاش کہ مستقل طور پر آپ کی صحبت سے ذوق حاصل

ہوتا۔ الحمدللہ کہ اس مردِ گرامی نے مجھے اپنی جماعت میں شریک فرمایا۔

ایک ایک دن عیش و کامرانی میں گذرتا۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک سگریٹ کا ٹین کھولتا سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اسی طرح ایک دوسرے کے کپڑے، چیزیں، روپیہ استعمال کرتے۔ ویسے ہم لباس اچھا پہنتے تھے لیکن جب کام پر جانا ہوتا تو نہایت سادہ اور کھردرا سا لباس ہوتا۔ ایک خاص قسم کے سستے کپڑے کا بنا ہوا۔ سر پہ ایک عجیب سی ٹوپی ہوتی۔ واسکٹ اور چپلیوں کا استعمال بھی ضروری تھا۔ ہمارا کام آسان تھا۔ کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا پوسٹر لگانا، خاص خاص جلسوں میں تقریر کرنا، جہاں کوئی کھیل تماشا ہو، بہت سے لوگ جمع ہوں۔ وہاں شور وغل مچاکر رنگ میں بھنگ ڈال دینا اس کے لیے ہمیں معاوضہ ملتا تھا۔ ہمیں اپنی ٹولی کے ممبروں کے علاوہ ہر شخص سے للّٰہی بغض تھا۔ مگر یہ خاکسار محض شہزادیوں کے لیے شریک ہوا تھا۔ اس لیے زیادہ نہ سیکھ سکا۔ اور ویسے کا ویسا رہا۔ آگ خشک و تر کو یکساں جلاتی ہے۔ شہزادیوں کے قرب نے خرمنِ صبر و شکیب پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ یہ فقیر ان میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شہزادیوں نے سردیوں میں تو خوب تبلیغ کی، گرمیاں آئیں تو تیز دھوپ سے ان کی رنگت سنولانے لگی۔ ہر جگہ پنکھوں اور برف کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ موٹر بھی کئی بار پنکچر ہوئی اور پیدل چلنا پڑا۔ شہزادیوں کو شکایت تھی کہ باشندوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے ادھر ہم کتنے تھوڑے ہیں۔ لوگ ان پڑھ ہیں سمجھتے نہیں بلکہ اب تو لوگ ہم سے چڑنے لگے ہیں۔ بھلا اور شہزادیاں ہماری طرح خدمت کرنے کیوں نہیں نکلتیں۔ اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔

پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ایک شہزادی نے خان بہادر قلندر بیگ سے شادی کر لی ہے، حالانکہ خان بہادر موصوف کی گذشتہ سے پیوستہ سب بیویاں صحیح سلامت تھیں۔ دوسری نے ایک رائے بہادر کو چنا، جو سب کی رائے میں کافی بزرگ تھے۔ جن کی بیوی کے متعلق افواہیں اُڑ رہی تھیں کہ بسرگباش ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں۔ یہ تازہ شگوفہ جو پھولا تو یہ ناچیز ساری چوکڑی یک دم بھولا، لیکن پھر سوچا کہ شہزادیوں پر بھروسہ کرنا دلیلِ حماقت ہے ان کی استقامت کا دم بھرنا عین جہالت ہے۔ یکایک تیسری شہزادی نے ایک دولتمند زمیندار سے عقد کیا جس نے فوراً دو مربعے بیچ کر پیکارڈ خریدی۔ الغرض خزاں سے پہلے ساری شہزادیاں ٹھکانے لگیں۔ ان میں سے ایک بے وفا کو میں نے یہ لکھ بھیجا۔

ع جو کیا تھا وعدہ نکاح کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جواب آیا ؎

بہت دنوں کے تقابل نے تیرے پیدا کیا
وہ اک نکاح جو بظاہر نکاح سے کم ہے

ہم طرح طرح کی آزادیاں چاہتے تھے۔ سوچنے کی آزادی، جو جی میں آئے کر گزرنے کی آزادی۔ ایک آزادی نے اس خاکسار کو کمال ذلیل و خوار کیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سرِ بازار اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ سب دیکھتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ قریب جا کر نصیحت شروع کی ہی تھی کہ نوجوان نے ترچھا وار کر کے ایک میرے پاؤں پر بھی جڑ دی۔ دو مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔ قصور نہ میرا تھا نہ اس کا۔ میں نے آزادیٔ گفتار دکھائی تھی اور اُس نے آزادیٔ کردار۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک عجیب خواب اس ناشُدنی کو نظر آیا۔ ایک رات سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جیسے گھوڑے پر سوار ہوں اور گھوڑا جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ یکایک آہ سنائی دی۔ حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہ نمبر دو سنی، دوسری بار حیران ہوا۔

میں نے بھری ہے۔ گھوڑے نے بڑی سلیس اُردو میں کہا۔ اور میں کیوں نہ بھروں۔ میں بھی تو جاندار ہوں۔ منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ تم انسانوں کے لیئے تو حقوق مانگتے ہو۔ جانوروں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ ڈارون کی تھیوری کے مطابق ہم سب ارتقار کی مختلف منزلوں پہ ہیں۔ ہمارا ماخذ ایک ہے لہٰذا ہم سب ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ میرے کزن میں تھک گیا ہوں۔ اب تم گھوڑے بنو اور میں سواری کروں گا۔

چار و ناچار اس حقیر کو گھوڑا بننا پڑا۔ باری باری ہم نے سواری کی۔ جنگل سے باہر نکل کر خیال آیا کہ اگر دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلتے تو بہتر تھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اپنے کزن سے دریافت کیا کہ اگر وہ انسان بننا چاہے تو کسی ماہر نفسیات سے مل کر آپریشن کا انتظام کرایا جائے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ بولا ان دنوں تانگے کے گھوڑوں کو چھوڑ کر بقیہ گھوڑوں کی پوزیشن انسان کی پوزیشن سے بدرجہا بہتر ہے۔

صبح جاگا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ تانگے میں بیٹھنے سے احتراز کرنے لگا۔ اور کوئی سواری میسّر نہ تھی۔ نقل و حرکت محال ہو گئی۔ سائیکل چلا چلا کر بُرا حال ہوا تو عقیدے بدلنے پڑے۔ ادھر شہزادے بھی تتر بتر

ہو گئے۔ کچھ رجواڑوں میں جا بسے، ایک دو ایکٹر بن گئے۔ باقی کے ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اُسے ہر وقت یہ وہم رہنے لگا کہ ؏

شاید کہ پولیس خفیہ باشد

وہ بھی سنا کہ نائب تحصیلدار بن گیا۔ اس کے ساتھ میرا دوسرا سفر تمام ہوا، عزیز القدر ایسی نگاہوں سے الماریوں کی طرف مت دیکھ کہ موم بھی پتھر بن جائے مجھے احساس ہے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ آج ولیسی شراب منگائی ہے کہ چُلّو میں اُلّو کرتی ہے۔

اگلے روز جب خاتونِ شب نے چادرِ سیاہ میں رُخِ الور چھپایا اور شاہِ خاور نے اورنگ سپہر پر جلوہ فرمایا۔ (یعنی جب صبح ہوئی) ــ تو دونوں جہاز بادوں کو آرام کرسیوں پر سوتا پایا۔ کہ ساتھ ان کے چند خرگوش بھی خوابیدہ تھے۔ آنکھ کھلنے پر غنچہ صبح کھلکھلایا، مرغانِ خوش الحان کی ترانہ سنجی سے کانوں نے لطف مزید پایا۔ جہاز باد کلاں شرمایا اور زبان پر یہ کلمے لایا ــ

اے مردِ نیک طینت! بادۂ دیسی نہایت تیز نکلا، اب تک حالت خستہ ہے۔ آج اچھی طرح اس شعر کے معنی سمجھ میں آئے ہیں۔ ؎

جو آج پی ہو تو ساقی حرام فتنے پی ہو
یہ کل کی پی ہوئی مے کا خمار باقی ہے

یہ بتا کہ تیرے عزیز و اقربا تیرا انتظار تو نہ کرتے ہوں گے۔ شاید تھانے میں پوچھنے گئے ہوں۔

میں خدا کے فضل و کرم اور آپ کی دعا سے ناکتخدا ہوں ــ خورد

نے ششدر ہاکر کہا۔

تو ملا ہاتھ، میں بھی ناخدا۔ یعنی ناکتخدا ہوں۔ تو پھر سناؤں تیسرا سفر؟

ذرا صبر فرمایئے، سمندِ کلام کو زیرِ لگام لایئے۔

اتنے میں ملازم نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ چھوٹا حاضری تیار ہے، چار پی کر کلاں ضبط نہ کر سکا اور یوں گویا ہوا۔

جہاز باد سندھی کا تیسرا سفر

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اے مردِ مخلص! میں موسم گرما گزارنے ملتان کے مرغزاروں میں گیا۔ وہ سرزمین جو رنگین مزاجوں کے لیئے عشرت افزاء گلشن اور درویشوں کے لیئے دل کشا خلوت کدہ ہے جب کچھ عرصہ خوش وقت ہو کر واپس لوٹا تو ایک نیا نام سننے میں آیا جس سے کان قطعی طور پر ناآشنا تھے۔ یہ نام تھا ترقی پسندی۔

معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں ایسی خوش گوار ہوا چلی کہ بچّہ بچّہ ترقی پسند بن گیا۔ شاعری ترقی پسند ہوئی، ادب ترقی پسند بنا۔ ہمارا ملک ترقی پسندی کے گن گا رہا تھا۔ یہ غلام بہت خوش ہوا، ترقی کون نہیں چاہتا۔ بہت سے احباب جو ملازم تھے۔ ترقی کے لیئے مدّتوں سے کوشاں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیش قیمت تحائف بھی دے چکے تھے۔

نوجوان تو اس تحریک کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ترقی پسندی کو اپنے نام کے ساتھ بطورِ ڈگری استعمال کرنے لگے۔ تعارف کراتے وقت ذکر

کیا جاتا کہ فلاں ترقی پسند ہے کہ نہیں ۔

ادھر ترقی پسند ادب کا ریکٹ بڑے زوروں پر تھا۔ یہاں تک کہ پبلشرز اور ایڈیٹروں نے حد بندی مقرر کر دی اور ترقی پسند رسالوں اخباروں میں صرف ترقی پسند چیزیں ہی چھپ سکتیں ۔

اس فدوی نے بڑے شوق سے اس نئے ادب کا مطالعہ کیا اور اسے بے حد عام فہم پایا۔ ہر کتاب دوسری کتاب سے ملتی تھی ۔ تمام افسانے ایک جیسے تھے ۔ ساری غزلیں ایک سی تھیں۔ تھوڑے سے مطالعے کے بعد اتنی خود اعتمادی آگئی ۔ کہ افسانے کا آغاز پڑھ کر انجام بتا سکتا تھا۔ غزل کا مطلع سُن کر پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ بقیہ اشعار میں کیا ہوگا۔ لوگ بڑی سُرعت سے ادیب اور شاعر بن رہے تھے ۔ جن حضرات کو میں سڑکوں پر سارا دن گھومتے یا کافی ہاؤس میں گپیں ہانکتے دیکھا کرتا اب اس نئی دنیائے ادب میں نام پیدا کر چکے تھے ۔

یہ حقیر شاعری تو کر چکا تھا۔ لہٰذا ادیب بننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ اسی دھن سے سانچہ ملا کر اسی لَے میں الاپنا شروع کر دیا ۔ میری چیزوں پر ترقی پسند حلقوں میں تو واہ واہ ہوئی لیکن کچھ لوگ خواہ مخواہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے ۔ معلوم ہوا کہ ان دنوں دو مختلف کیمپ بن گئے ہیں ۔ جو ایک دوسرے کے سامنے مورچہ باندھے منتظر بیٹھے ہیں ۔ میں کچھ حیران ہوا اور ایک بہت بڑے ترقی پسند سے ملا۔ پوچھا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لکھنے کے لیئے کسی ایک کیمپ میں رہا جائے ۔

اس نے بتایا کہ یہ بے حد ضروری ہے ۔

میں نے کہا ۔ لیکن ان دونوں کیمپوں میں ہر وقت تُو تُو میں میں ہوتی

دیتی ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں۔ کیا کوئی غیر جانبدار رہ کر نہیں لکھ سکتا؟

وہ بولا اگر آپ غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں تو لکھنا چھوڑ دیجئے۔

چنانچہ یہ حقیر نقّاد بن گیا۔ اس میں بھی ایک راز مضمر تھا جو ابھی بتاؤں گا۔ ترقی پسند کا فلسفہ کچھ مشکل نہ تھا۔ اپنے جیسے لوگوں کی سدا تعریفیں کرنا۔ جو لوگ لکھنے لکھانے کے علاوہ روزی کمانے کے لیئے محنت کرتے ہیں۔ انھیں ادب کا دشمن قرار دینا۔

افسانہ، مقالہ، غزل۔ سب کے لیئے سانچے موجود تھے۔ چنانچہ ترقی پسندی کا لیبل لگانے کے لیئے یہ ضروری تھا کہ صرف اُن مسائل پر قلم اُٹھایا جائے جن پر اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تنقید کرتے وقت نہ میں پلاٹ کو جانچتا نہ مصنف کے پیغام کو، نہ پیغام کی افادیت کو، ہر چیز میں وہی جانے پہچانے موضوع وہی مقرّرہ ترکیبیں اور الفاظ ڈھونڈتا۔ اگر یہ مل جاتے تو ترقی پسندی کا ٹھپہ لگا دیتا۔ ورنہ مصنف کو گمراہ کرنے والا سرمایہ دار، تنزّل پسند، اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔

آپ نے فرمایا تھا کہ نقّاد بننے کی وجہ تسمیہ بیان کریں گے۔ خورد نے بات کاٹی۔

ہاں تو بات دراصل یہ تھی کہ اس عنی عنہٗ کو چند افسانہ نگار اور شاعر شہزادیاں پسند تھیں۔ ان میں سے دو ایک کو تو میں یونیورسٹی سے جانتا تھا۔ اور کئی سال سے لگاتار ان پر فریفتہ تھا۔ لیکن اُنھوں نے میرا اتنا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ لکھتی وِکھتی یہ ایسا ہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر ان کی

تعریف کرنے لگوں تو شاید ملتفت ہو جائیں۔ موقعہ بھی تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی تخلیقات کو سراہنا شروع کیا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے ٹھوس مضامین میں ان کی تعریفیں کرتا۔ لیکن تعجب ہوا کہ یہ مداح سرائی رائیگاں گئی۔ کسی سے پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شہزادیوں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ مجھے شبہ ہوا اِدھر اُدھر پوچھنے پر انکشاف ہوا کہ انھوں نے کیا کسی نے بھی نہیں پڑھا۔ ایسے مضامین یہاں کوئی نہیں پڑھتا کیونکہ انھیں خشک اور ثقیل سمجھا جاتا ہے۔

ویسے بھی نقادوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

اُن کیمپوں کا کیا بنا؟

بتاتا ہوں، سُن — یوں تو ہر تحریک کچھ عرصے کے لیے مقبول ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نام سے خواہ مخواہ خوش فہمی ہوتی تھی کہ اب ہر چیز میں ترقی ہو گی۔ حالات سُدھر جائیں گے۔ انسان ترقی کرے گا۔ دنیا بہتر بن جائے گی — لیکن آہستہ آہستہ مایوسی چھانے لگی۔ ادب بالکل جرنلزم بن کر رہ گیا۔ آج کوئی بات ہوئی۔ اُسی ہفتے اس پر نظم لکھ دی گئی یا افسانہ، اور اگلے مہینے کتاب۔ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس تحریک کا پیرہن نرا کاغذی تھا۔ اس تحریک کا مقصد تخریب تھا۔ تعمیر مفقود تھی۔ یہ ہیرو نہیں تھے۔ پبلک اب تک غلط گھوڑوں پر BETTING کرتی رہی تھی۔ ان کی زندگی عمل سے خالی تھی۔ ان کا نظریۂ حیات مریضانہ اور قنوطی تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ہر پڑھنے والے کو مالیخولیا ہو جائے۔ ادب کسی خاص طبقے کی میراث نہ ہوا ہے نہ ہو گا۔ چنانچہ لوگ اس وقتی ہنگامے سے تنگ آ گئے۔ اور ادب سے ایسے بدگمان ہوئے کہ اُنھوں

سے فلمی رسالے پڑھنے شروع کر دیئے، فلمی رسالے تو فراری ادب میں شامل نہیں ہیں ۔ ساتھ ہی ایک عجیب و غریب ادب نے جنم لیا۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے متعدد حضرات نے تاریخی اور مذہبی ناول لکھنے شروع کر دیئے۔ جو ہاتھوں ہاتھ بکے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بور ہو رہے ہیں ۔

جی نہیں ، بور تو نہیں ہو رہا۔ خورد جمائی لے کر بولا۔ فراری ادب پر مجھے ایک چشم دید واقعہ یاد آ گیا، طے ہوا کہ ہمارے ضلعے کے جیل میں قیدیوں کو اخلاقی کتابیں پڑھائی جائیں ۔ داروغۂ جیل اتفاق سے رجعت پسند تھا۔ سب کتابیں فراری ادب پر لے آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو مہینوں کے اندر اندر سارے قیدی فرار ہو گئے۔

خیر، تو یہ کمترین بدستور ترقی پسند رہا ، محض ایک ماہ پارہ کے عشق کی وجہ سے اس بتِ طناز کو میں نے مینا بازار میں دیکھا۔ میں اپنے دو سنیل کتے لئے جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ ذرا مینا بازار کا نظارہ کر لوں ۔ ایک سٹال پر کچھ خریدنا چاہا۔ لیکن دونوں ہاتھوں کو گھرا پایا۔ ایک حسینۂ پرتمکین کو قریب پا کر کتوں کی زنجیریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں ۔ جب خرید سے فراغت ہوئی تو حسینۂ مذکور سے کتے طلب کیے۔ اس نے کمال بھولپن سے کہا۔ ایک کتا تو بلّی کے پیچھے بھاگ گیا۔

انگشت بدنداں سخت پریشان ہوا۔ اور سوال کیا کہ کیونکر بھاگ گیا؟

یوں بھاگ گیا۔ اس نے دوسرا کتا بھگاتے ہوئے کہا۔

کتے تو دونوں مل گئے۔ لیکن ادا یہ اس کی اس درجہ بھائی۔ کہ بجز عاشق ہونے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اختر شماری شروع کر دی۔ اس علاقے میں جتنے

اختر حسن، اختر حسین، حسن اختر، محمد اختر وغیرہ تھے سب گن ڈالے مگر افاقہ نہ ہوا۔

آخر اپنی کزن کی مدد چاہی۔ وہ خالہ جانی بلائیں لے کر بولی۔ میں آج ہی اُسے کلب میں بلاؤں گی۔ چنانچہ شام کو ماہ جبین کلب میں آئی، اس ٹھسّے سے کہ بھاری فرشی غرارہ پہنے، عطر لگائے، زیور بیش بہا عجب بہار دکھاتا تھا۔ گلے میں جگنی، چمپا کلی، موتیوں کی مالا، دھگدھگی، کانوں میں پہنے بالیاں، ہاتھوں میں حسین بند، الماس کے کڑے، پاؤں میں سونے کے چھڑے، ناک میں ہیرے کی نتھ، انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں، سر پہ چھپکا، اس فقیر نے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔ ؎

جان پڑ جاتی ہے زیور میں پہننے سے ترے
کہیں اُڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہو کر

لیکن میری کزن نے بڑے زور سے ہشت کر کے چپ کرا دیا اور اس سے گویا ہوئی ۔ کہ کلب میں بلانے کا تو فقط بہانہ تھا، اصل میں تمہیں ایک پیغام سنانا تھا۔ میرا کزن جوانِ زیبا خرام خوبرو گلگوں دیکھتے ہی آپ پہ شیفتہ و دوالہ ہوا، عشق کا بول بالا ہوا۔ وہ ہزار جان سے تمہارے گل رخسار کا عندلیب شیدا ہے، آہِ سرد اور دل میں درد سے عشق کا مرض پیدا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ عجیب و غریب نوجوان ہے، عجب آن بان ہے، لاکھوں جوانوں میں انتخاب ہے، حسن و خوبی میں اپنا آپ جواب ہے۔ تم دونوں کی خوب نبھے گی، گہری چھنے گی۔ وہ بھی کم سن تم بھی جوان، وہ نازک بدن، تم بھی دھان پان۔ وہ محوِ جادو آفرینی، تم سروِ چمن زار ناز نینی۔

افوہ! اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی ۔ حسینہ نے بات کاٹی والدین میری شادی کا تہیّہ کر چکے ہیں ۔ تبھی مجھے پارٹیوں اور کلب وغیرہ میں جانے کی اجازت اتنی آسانی سے مل جاتی ہے ۔ کئی اخباروں میں اشتہار بھی دیئے گئے ہیں ۔ غالباً اگلے مہینے میرا سوئمبر رچایا جائے گا ۔ اگر آپ کے کزن کو اتنا ہی ذوق و شوق ہے تو سوئمبر میں شرکت کرے ۔

حسینہ کی یہ تقریر اس حقیر کو نہایت ترقی پسند معلوم ہوئی ۔ اور اس نیاز مند نے اس کے ساتھ رُمبا ناچنا چاہا ۔ زیوروں سے ایسی عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں کہ ارادہ ترک کر دیا ۔ پھر سامبا ناچنے کی کوشش کی مگر ایک دوسرے کے ملبوسات آپس میں اُلجھ کر رہ گئے ۔ چنانچہ رقص کی حسرت حسرت ہی رہی ۔

سوئمبر قریب آیا تو میری کزن نے اخبار میں چھپا ہوا اشتہار دکھایا جو ضرورتِ رشتہ کے عام اشتہاروں سے ملتا جلتا تھا ۔ مگر ترقی پسندی کی عینک لگا کر پڑھا تو عبارت کا مفہوم کچھ یوں سمجھ میں آیا ۔

اشتہار برائے پبلک

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح چھ بجے سے شہزادی ولیمہ جہاں کے سوئمبر کا ٹورنمنٹ شروع ہو گا ۔ اور مناسب اور معقول اُمیدواروں کو شہزادی پر عاشق ہونے کی اجازت ہو گی ۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اُترتے ہوں ۔

(۱) کنوارہ پنے کا سرٹیفیکیٹ جس پر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کے دستخط ہوں ۔

اور اُمیدوار کے والد کی سالانہ آمدنی اور جائداد کی تفصیل درج ہو۔
(۲) تندرستی کا سرٹیفکیٹ جس پر سول سرجن صاحب بہادر کی تصدیق ہو۔
۳ دو معزز آدمیوں کے نام اور پتے جو اُمیدوار کے چال چلن کی ضمانت دیں۔ اور اس کے رشتہ داروں میں سے نہ ہوں۔
۴ سرکاری خزانے میں پانچ روپیہ جمع کرانے کی رسید۔
۵ طلسماتی چیزیں مثلاً زمینداروں اور خان بہادروں کی سفارشیں ممنوع ہیں
۶ اُمیدوار ایک ہفتے کا راشن، بستر اور وفادار ملازم ہمراہ لائیں۔
۷ مہاجر کو ترجیح دی جائے گی۔
۸ کامیاب اُمیدوار کو شہزادی ولیمہ کے علاوہ جائداد کا تہائی حصّہ بطور انعام ملے گا۔

نوٹ! سب کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ عاشق ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کا اُمیدوار ایسی سزا کا مستحق ہوگا جو پچاس روپیہ جرمانہ اور تین ماہ قید تک ہو سکتی ہے۔

اس ناچیز نے اس شاندار ترقی پسند سپرٹ پر اظہارِ مسرّت کیا اور دعا مانگی کہ دنیا کی ہر شہزادی کی شادی اسی طرح ہوا کرے۔ فوراً کاغذات مکمل کر کے گھوڑا منگایا۔ سیڑھی لگا کر سوار ہوا اور سوئے ٹورنامنٹ روانہ ہوا۔ مقابلہ نہایت شاندار رہا۔ طرح طرح کے امتحان لیئے گئے۔ آئی کیو (I-Q) بھی ٹسٹ کیا گیا۔ جو زیادہ ذہین تھے اُنھیں نکال دیا گیا۔ اتفاق سے ایک حبشی بھی کہیں سے آن ٹپکا، اسے سزا دی گئی اور فہرست سے خارج

کرتے وقت اس کے منہ پر سفیدی مل کر شہر میں پھرایا گیا۔ تاکہ سب کو عبرت ہو۔

چند رجعت پسند امیدواروں نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ جائداد کا کونسا حصّہ ملے گا، شمالی یا جنوبی۔ جواب ملنے پر وہ راتوں رات فرار ہو گئے کیونکہ وہ علاقہ نہری نہ تھا۔ وہاں ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت تھی۔

خاکسار سیمی فائینل جیت کر فائینل تک پہنچ گیا۔ اتنے میں نہ جانے شہزادی کے ماموں کا لڑکا کہاں سے آمرا۔ یہ مردک کہ بے حد نحیف و نزار تھا۔ ایک بہت بڑی جائداد کا تنہا وارث تھا۔ (اور صحت اس کے باپ کی گرتی جارہی تھی) ۔ اس امرود کے مقابلے میں یہ ناچیز قدرے مُفلس تھا۔ مفلس عاشق کہلاتے ویسے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ صحیح ہے کہ۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
آدمی کا وقار کھوتی ہے

اس کمبخت کے آجانے سے ٹورنمنٹ کا رنگ ہی بدل گیا۔ نہایت سرمایہ دارانہ سوالات پوچھے جاتے۔ اُدھر شہزادی کی اماں نے برادرزادے کے لیئے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ آخر وہ سب کے سب رجعت پسند ثابت ہوئے۔ اور فیصلہ اس ملعون کے حق میں کیا گیا۔

ٹورنامنٹ کے نتیجے کی خبر وحشتناک سنتے ہی موم جامۂ صبر چاک ہوا۔ ماتمی لباس پہنے اس حال میں تھا کہ نہ سر پر جُوتا تھا نہ پاؤں میں پگڑی۔ لیکن شہزادی کے والد نے اس حقیر کو خلافِ توقع مبارک باد دی۔ اور کہا،

کہ لڑکی کو اُس کی والدہ نے بے حد بگاڑ رکھا ہے۔ شاید تو نے بیگم کو نہیں دیکھا جو در اصل بے غم نہ ہے۔ لڑکی بھی چند سال کے بعد ویسی ہی لحیم شحیم بن جائے گی۔ اگرچہ مجھے مٹاپا مرغوب نہیں۔ لیکن وائے نادانی کیا بتاؤں کہ ؎

میں اسیرِ دامِ فربہی رہا ہوں
اے نوجوان تو گھاٹے میں نہیں رہا

اس کے بعد ترنم سے بولے ؎

تم بھی بیاہ کر دو نوجوانو
ہم دکھیوں کی فریادوں کو

اس بیان سے اس نیاز مند کی تسلّی تو نہ ہوئی۔ لیکن یہ یقین ہو گیا کہ شہزادہ یہاں اس ملک کی ہر گز ترقی پسند نہیں ہیں۔

"یا پیر و مرشد ایک بات پوچھوں؟" خورد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"دو پوچھ لے۔"

"اب دو ہی پوچھوں گا۔ یہ بتائیے کہ کبھی آپ کو کسی سے سچ مچ محبت ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔ یہ شہزادی فارغ التحصیل بلکہ فارغ الضلع ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جرنلزم کی کلاس میں ملتے۔ ہائیکورٹ کے پاس جو باغیچہ ہے۔ وہاں اکثر جایا کرتے۔ وہاں میں نے اسے کورٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے رخِ روشن پر ایک خال ہوتا۔ یہ خال کبھی تو پیشانی پر ہوتا، کبھی رخسار پر تو کبھو ٹھوڑی پر۔ اور کسی روز سرے سے غائب ہوتا۔ میں حیرت سے یہ شعر زبان پر لایا ؎

مصحفِ رُخ پہ ترے خال نگہبان ہوا
یہ غلام حبشی حافظِ قرآن ہوا

بس پہ اس نے فوراً مطلع کیا کہ خال وہ مصنوعی تھا اور سُرمے سے محض زیبائش کی خاطر بنایا جاتا۔ میں نے جھٹ سُرخ ہونٹوں کی تعریف کی ؎

لال ہیں آپ ہی لب سرخیٔ پان دور رہے
نازکی کہتی ہے یہ بارِ گراں دور رہے

اس پر شہزادی نے عجب تمسخر سے فرمایا کہ یہ پان دان کی سُرخی نہیں میکس فیکٹر کی بڑھیا لپ سٹک ہے۔ اگر اس فقیر کو علم تھا کہ لپ سٹک کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سٹک نہیں کرتی۔ تاہم موضوع بدلنا پڑا اور پامسٹری کا ذکر چھیڑا وہ بولی۔ میں جانتی ہوں آپ اس حیلے سے میری خوشامد کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے چوڑیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا میں انہیں چھُو سکتا ہوں؟"

وہ بولی۔ آپ اسی بہانے سے میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہو۔"

اس صاف گوئی پر یہ درویش باغ باغ ہو گیا۔ ماشاءاللہ کیا ترقی پسند مجبوبہ تھی۔ بے حد مسرّت کا سامنا ہوا۔ سوچا کہ جب انجام مقرّرہ ہے تو فرار بزدلی میں شامل ہے

بیاہ کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چنانچہ میں نے اُسے شادی کے لئے کہہ دیا۔

بولی۔ "آپ خرّاٹے تو نہیں لیتے؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس پر وہ بولی۔ "تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ جائیے اور میرے

والدین کو منا لیجئے"

یہ جواب بھی ترقی پسند تھا اور اس فدوی کو پسند آیا۔ میں سیدھا اس کے والدین کے پاس پہنچا اور سوال کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس کمترین کا شجرۂ نسب حضرت آدم تک دریافت کیا۔ پھر جملہ متعلقین کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا گویا تہمت لگا رہے ہیں۔ پھر بولے۔ اگر تم دونوں میں سے خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو گیا تو لڑکی کے لیے کیا انتظام ہو گا۔ کوئی ذاتی ملکیت یا بیمے کی پالیسی ہے؟ پھر مہر کا قضیہ شروع ہوا۔ جیسے نیلامی ہو رہی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ نیک ہے اور انشاء اللہ مہر کی ادائیگی تک نوبت ہی نہ پہنچے گی۔ اگر آپ اتنے لمبے چوڑے مہر کے لیے کیوں مصر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہے کہ یہ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ بولے۔ اگر مہر تھوڑا لکھا گیا تو دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ جائیگی خیر یہ حقیر مان گیا۔

وہ چاہتے تھے کہ پرانی رسومات ساری ادا کی جائیں۔ میں معروض ہوا کہ ہجوم اکٹھا کر کے غل مچانا ایام جہالت کی رسم ہے۔ جب پبلسٹی کا یہی ایک طریقہ تھا کہ لوگوں کو بلا کر دکھا دیا جاتا تھا کہ واقعی شادی ہوئی ہے۔ تاکہ وہ سب بعد میں گواہ رہیں۔ اب تو فوراً اخبار میں تصویر آ جاتی ہے اور پھر شور و غل سے یہ احقر بہت گھبراتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں سچ مچ کچھ کر بیٹھا ہوں۔ لیکن وہ بدستور مصر رہے۔

آخر یہ تجویز پیش کی کہ شادی دو حصوں میں ہو۔ پہلے آپ مجھے فارغ کر دیں۔ پھر مہینوں بلکہ سال بھر تک روشنیاں جلا کر خوب ڈھول بجائیں اور عورت پر سارے

ایشیا کو دمعہ ایشیائے کوچک کے، مدعو کر لیں۔

وہ کمال درجہ رجعت پسند نکلے کہ نہ مانے۔

اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ شہزادی کو دوبارہ بغور تو دیکھو دیکھا تو حلیہ بدل چکا تھا۔ بھنویں اکھیڑنا، بال ترشوانا، ناخن پالنا۔ ان خوبیوں کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ جوتوں اور میک اپ سے کسی روز بے حد لمبی معلوم ہوتی۔ گھر میں سادہ کپڑوں میں دیکھتا تو چھوٹی اور موٹی دکھائی دیتی۔ رنگ و روغن کی وجہ سے اصلی شکل دیکھنا محال تھا۔ چنانچہ عشق و عاشقی کو بالائے انگیٹھی رکھا اور ان رجعت پسندوں کو ان کے حال پر چھوڑا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کچھ تنزل پسند ایک ترقی پسند کو سر بازار پھول مار رہے تھے اور وہ خاموش کھڑا برداشت کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک اچھا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور بولا۔ اے مردِ سخن فہم۔ یہ سب تو بے سمجھ ہیں۔ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ تُو تو ترقی پسند ہے۔ تجھ سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔

اس واقعے کے بعد الجھن سی پیدا ہو گئی۔ کیسے ترقی پسند اور کہاں کی ترقی پسندی۔ لوگ جہاں تھے وہیں کے وہیں ہیں۔ کوئی کسی رُخ بھی ترقی نہیں کر رہا۔ ویسے میرے اور ترقی پسندی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو زیادہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید مجھے شہزادیوں کی وجہ سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد یہ ہوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے پگڑیاں اچھالنے میں خاصی مہارت ہو گئی۔ ادھر فلمی پرچوں کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہ فقیر فلمی نقاد بن گیا۔ اور فلمی ستاروں کے متعلق تازہ ترین افواہیں بہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے والے میری رنگین

تحریروں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ فلم ساز اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں سے اسی بہانے دوستی ہو گئی۔ ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں مجھ پر رشک کرتے لگے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر خاک ہوا۔ دھول ہوا۔" کلاں نے جھلا کر کہا۔

"ابھی کتنا سفر باقی ہے؟"

"تو بڑا بے صبر ہے۔ اچھا لے۔ سفر یہیں ختم ہوا۔ یونہی طبیعت بدمزہ کر دی۔ اگلی مرتبہ جب فرصت ہو تب آئیو۔"

سر شام جہاز باد خورد آن دھمکا اور بولا۔

"صبح جو کچھ ہوا۔ اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ سزا کے طور پر تیسرا سفر دوبارہ سننے کو تیار ہوں۔"

جہاز باد کلاں مسکرا کر بولا۔ "ہم معاف کرتے ہیں اور چوتھا سفر پہلی مرتبہ سناتے ہیں

جہاز باد سندھی کا چوتھا سفر

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلاّ اٹھائیے

اے رفیقِ دیرینہ! ایک رات کا ذکر ہے کہ میں نے کتّے کو مارنے کے لئے ایک وزنی سی کتاب اٹھائی۔ کتا دور جا چکا تھا۔ لہذا ورق گردانی کرنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ علی الصبح جب اٹھا تو اپنے آپ کو پردلستاری پایا۔ سوچا کہ شاید مشیت ایزدی اسی میں ہے کہ پردلستاری بنوں اور نام پاؤں۔"

"اے ہمدم طوطی گفتار؛ لفظ پرولتاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہ ایک انگریزی لفظ کا نعم البدل ہے اردو میں۔ ڈکشنری دیکھیے۔ بہت کچھ معلوم ہو گا۔ پرولتاری بننا آسان کام نہیں۔ بڑی ہمت چاہیئے۔ دن رات بھاری بھاری کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکچروں میں جانا پڑتا ہے۔ پریکٹیکل الگ ہوتے ہیں۔ بہت جلد فدوی نے یہ کورس مکمل کر لیا۔ زندگی میں کئی تبدیلیاں آگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا صرف پرولتاریوں میں ہوتا۔ بڑی طویل بخشیں ہوا کرتیں۔ پرولتاری ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہمیں مذہب، جنس اور دیگر اہم مسائل پر جدید ترین نظریوں کا اظہار کرنے کی پوری پوری آزادی تھی۔ ہماری انوکھی اور بصیرت افروز باتیں سُن کر عوام چونک پڑتے۔ ہر مذہب کو ہم تضیعِ اوقات سمجھتے۔ انسانی رویّے کے عالمگیر قوانین ہمارے لئے مہمل اور لغو تھے۔ ہر انسان، ہر اصول، ہر بیان کو ہم نہ صرف شبہ کی نظر سے دیکھتے بلکہ منٹوں میں دھجیاں اڑا دیتے۔ عجب دن تھے وہ بھی۔ کیا رعب تھا۔ کیا دبدبہ تھا۔ سڑک پر پرولتاری چلتا تو لوگ اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ دیتے۔ جھک جھک کر سلام کرتے۔ کیا مجال جو کوئی ہم سے بحث کر سکے۔ چند ہی فقروں کے بعد وہ یوں خاموش ہو جاتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ بڑے سے بڑے ہجوم میں محض چند پرولتاریوں کی آمد قیامت برپا کر سکتی تھی۔

"بھاگ چلو یارو۔ پرولتاری آگئے۔" کا نعرہ لگا کر وہ ایسے بھاگتے کہ ٹوپیاں اور چھاتے چھوڑ جاتے۔

جہاں ہم نے مقامی پبلک کو آگے لگا رکھا تھا۔ وہاں مقامی لڑکیاں تھیں۔ کہ سیدھے منہ بات نہ کرتی تھیں۔ وہ ہم سے بدگمان تھیں۔ ہم مذہب، دوستی، ایمان،

فلسفۂ عشق کے پرخچے ضرور اڑاتے تھے۔ لیکن یہ سب دکھاوے کے لئے تھا۔ کبھی کبھی ہمارے دل بھی محبت کی آگ سے سلگنے لگتے۔ ضرورت پڑنے پر ہم خدا کا واسطہ دیا کرتے مصیبت پڑتی تو دعائیں مانگتے۔ رہ گئی جنس۔ سو اس کے متعلق ہمارا تجربہ اتنا ہی تھا۔ جتنا غیر پردلتاریوں کا۔ لیکن ہماری معلومات کا ماخذ فرائڈ، ڈی ایچ لارنس اور دیگر حضرات کی کتابیں تھیں۔ خیالات ان کے تھے بیان ہمارا تھا۔ اگرچہ ہم نے ان مصنفین کا حوالہ کبھی نہیں دیا اور یہاں میں بتانا بھول گیا کہ پردلتاری ایک انقلاب بھی چاہتے تھے۔"

"کیسا انقلاب؟"

"کبھی ایک عالمگیر انقلاب تو کبھی ملکی یا غیر ملکی انقلاب۔ بعض اوقات ہم مقامی انقلاب پر ہی قناعت کر جاتے۔ بس انقلاب ہو۔ کہیں، کسی قسم کا، کسی سائز کا۔ چنانچہ ہم بار بار پبلک کو انقلاب کے لئے اکساتے۔ ہم چاہتے تھے کہ ہنگامے بپا ہوں اور افراتفری مچے۔ دنگے فساد ہوں۔ تاکہ لوگوں پر ہماری اہمیت واضح ہو جائے۔ لیکن مجھے غصہ تھا تو اس پر کہ یہی لڑکیاں جو ہم سے ملنا اپنی ہتک سمجھتیں کلب میں وہ دھما چوکڑی مچاتیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک خاص طبقے سے خوب چہلیں کرتیں۔ یہ حضرات بھی عجیب تھے۔ ویسے اچھے بھلے تھے۔ لیکن اپنے آپ کو بیحد غمزدہ اور بدنصیب سمجھتے۔ اس کی وجہ اپنی بے بورژ شادی بتاتے۔ حالانکہ ہر ایک ماشاءاللہ چھ چھ بچوں کا باپ تھا۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ان کی ازدواجی زندگی نہایت غمناک ہے اور وہ بیوی سے تقریباً تقریباً علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بہانے وہ ہر لڑکی سے فلرٹ کرتے۔ چونکہ ان کے پاس کاریں تھیں۔ اس لئے بے بورژوا تھے۔"

اس ناچیز کے چچا جان جو تعلقہ دار ہیں۔ کار رکھتے ہیں۔ کیا وہ بھی بورژوا ہیں؟" نورد

نے پوچھا۔

"ضرور ہوں گے۔ تو یہ شادی شدہ بورژوا حضرات دن بھر کاروں میں لڑکیوں کو لئے لئے پھرتے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پنتالیس برس سے کم نہ تھا۔ پتہ نہیں انہیں اس میں کیا ملتا تھا؟"

"غالباً انہیں سنہ تیس اکتیس کے پرانے ماڈل پسند نہیں تھے۔ اور نئے مسٹر یم لائینڈ ماڈل درحقیقت وبدہ زیب ہوتے ہیں۔" خورد نے مؤدبانہ عرض کیا۔

"مگر یہ نئے ماڈل ان کا خوب مذاق اڑاتے ملتے ہی سوال ہوتا کہ آپ کی ننھی بچی کا اب کیا حال ہے؟ آپ کے لڑکے کا بخار اترا؟ بیوی کا کوئی خط آیا؟ بڑی لڑکی کی کب شادی ہو رہی ہے؟ دیکھئے ہمیں ضرور بلایئے۔ مگر یہ بورژوا تھے کہ:"

"ویسے بورژوا ہونا کیا ہے؟"

"بورژوا وہ ہے۔ دکلاں نے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بتانے کی کوشش کی) جو۔ جو۔ بالکل بورژوا ہو۔ سنا ہے کہ فرانس میں سوداگروں کا ایک طبقہ رہتا تھا۔ اسے بورژوا کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن یہ کافی عرصے کا ذکر ہے۔"

"یا پیر و مرشد۔ ایوننگ اِن پیرس کی نیلی شیشی پر ایک لفظ بورژوا لکھا ہوتا ہے۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے کیسے میں دخل دینا سخت نادانی ہے۔ تو میں نے لڑکیوں سے ان بورژوا حضرات کی خوب بُرائیاں کیں اور انہیں بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ یہ سب سرمایہ دار ہیں اور سماج کے دشمن ہیں۔ وہ ہنسنے لگیں

کہ کار کو چھوڑ کر ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ بینک میں ان کا حساب صفر ہے۔ بلکہ مقروض رہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ سرمایہ دار ہونے کے لئے سرمائے کی ضرورت نہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے جس پر غصہ آتا ہے۔ وہ بولیں۔ جب سرمایہ نہیں تو ذہنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ میں خود پرولتاریت سے اکتا چکا تھا۔ لیکن یہ گلے کا ڈھول تھا کچھ عرصہ بجانا پڑا۔ آخر ایک دن میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ذلیل سی پرانی موٹر کہیں سے خریدی اور بورژوا بن گیا۔ وا پنے بائیں ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا شروع کیا اور ہرجائی کے نام سے شہرت پائی۔"

"آہا تو آپ ہرجائی بھی رہ چکے ہیں۔ ملاحظے ہا تھ۔ یہ ناشدنی بھی ہرجائی رہ چکا ہے۔ آہ۔ سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے اور حسین چہرے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں۔"

لیکن دو تین لڑکیاں تو سچ مچ پسند آگئیں اور ارادہ اس خاکسار کا شادی کرنے کا تھا۔"

"ان سب سے؟" خورد چونک پڑا۔

"نہیں۔ ایک سے۔ لیکن معلوم ہوا کہ لڑکیوں کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔ کورٹ شپ میں وہ صرف لڑکے کے نقائص معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ ہونے والی ساس کس مزاج کی ہے۔ کنبے میں بہت زیادہ لوگ تو نہیں۔ لڑکے کی تنخواہ کا گریڈ کیا ہے اور یہ گریڈ اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ مزید بننے کے کیا امکانات ہیں۔ رشکی مزاج تو نہیں کہ ذرا دوسرے مرد سے بات کی اور خفا ہو گیا۔"

"پتہ نہیں۔ البتہ شادی کے متعلق سنجیدگی سے صرف ایک طبقہ سوچتا ہے۔ خاوندوں کا طبقہ۔ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حقیقی مسرّت کو انسان تب تک نہیں پہچانتا۔

جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ لیکن تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

"یار تُو بات مت کاٹ، چپ چاپ سنتا رہ۔ یہ لڑکیاں بیحد۔ matrimonial-minded تھیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ میں ہر چیز سے بیزار ہوتا گیا یہاں تک کہ شادی سے ڈرنے لگا۔ ان لوگوں سے بھی خوف کھاتا جو خسر بنتے بنتے بال بال بچ گئے۔ ہر رات سونے سے پہلے اس قسم کی دُعا مانگتا کہ۔ اے پروردگار میرے حال پر رحم فرما، رشیدہ کی کہیں شادی کر دے، نرگس بن غفور کی کہیں منگنی ہی ہو جائے، مس ربیّا معراج دین اور ڈورتھی متوکل کا بھی کہیں انتظام کرادے۔"

"لیکن اس کا بور ہونے سے کیا تعلّق ہے؟ کاش کہ موضوع بدل جائے" خورد جو اتنی دیر میں ڈکشنری دیکھ چکا تھا بولا۔

"بہت اچھا۔ اب اس سفر میں ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ تجھے یاد ہوگا کہ الف لیلہ کے سندباد کی ملاقات تسمہ پیر سے ہوئی تھی۔ جس کے چنگل سے بڑی مصیبتوں کے بعد نکلا تھا۔ میرا بھی ایک ایسے ہی مسخرے سے واسطہ پڑا۔ سفر سے لوٹتے وقت میں ایک بندرگاہ پر اترا۔ جہاں بندر ہی بندر تھے، وہاں ایک انشورنس ایجنٹ میرے پیچھے لگ گیا۔ ایسا تعاقب کسی نے کسی کا نہ کیا ہوگا۔ چوبیس گھنٹوں میں دو فقط تین چار گھنٹے مجھے چھوڑتا ورنہ ساتھ رہتا۔ اس سے دور رہنے کے لئے میں نے کیا کیا جتن نہ کئے، منت سماجت کی، ڈرایا دھمکایا، آخر تنگ آکر خودکشی

کی دھمکی دی۔ جس پہ وہ بولا کہ میں بھی ساتھ خودکشی کروں گا اور پالیسی دینے کے لئے اگلے جہان تک پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ جب مَیں نے سچ مچ پستول دکھایا۔ تو بولا۔ اے مردِ نیک خصلت اگر تو واقعی خودکشی کر رہا ہے تو پالیسی مفت لے لے لیکن وارث مجھے بنا جا۔ مجھے اتنا غصّہ آیا کہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور سیدھا کباڑی بازار میں الف لیلہ کا قدیم نسخہ مطالعہ کرنے گیا تاکہ کوئی ترکیب نکالوں۔ سندباد نے اس مردِ نابکار کو انگوروں کی شراب پلا کر مدہوش کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے بادۂ افرنگی پلایا۔ لیکن اثر اُلٹا ہوا۔ پی کر وہ اپنے تئیں ہوش میں نہ رہا۔ کچھ دیر واہی تباہی بکتا رہا پھر اس حقیر کو خوب زدوکوب کیا۔ بے حد حیران ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں اسیرِ دامِ بلا ہوا، خود گرفتارِ بحرِ ستم ہوا۔

جب اگلے روز وہ مجھے سڑک پر ملا تو شرما کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اس کے بعد جب کہیں ملتا خجل ہو کر رہ جاتا۔ خیر اس طرح میری نجات ہوئی۔ لیکن الف لیلہ سے عقیدہ اُٹھ گیا۔"

"گستاخی معاف"۔ خورد بولا شروع سے اب تک جو واقعات آپ نے سنائے ہیں بالکل اٹل ٹپ ہیں، غالباً آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پتہ نہیں آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا یہ سفر بھی نہایت بے تُکا رہا۔"

"مگر تو نے مجھے بار بار ٹوکا بھی تو ہے شاید ایک دن میں دو سفر سن کر تُو اُکتا گیا ہے۔ اب آئندہ تجھے ایک لفظ نہ سناؤں گا۔ جب تک تو ہونٹ سی لینے کا وعدہ نہ کر لے۔"

"کس کے ہونٹ؟ آپ کے؟"

"نہیں اپنے۔"

اور وہ دونوں خنداں ہوئے، فرحاں ہو کر شک و شبہات دُور ہوئے دل صاف ہوئے اور جہاز بادِ کلاں کا چوتھا سفر تمام ہُوا۔

اگلے روز جب شاہبازِ نجوم نے آفتاب پر جال پھینک کر شکار کیا، سیاہ انوار کو شکست ہوئی، ظلمت کی حکمرانی ہوئی، تب جہاز باد خود حاضر ہو کر بولا "یا استادِ کلاں اپنا پانچواں سفر بیان کر کہ میں دو روز تک تیرے ہاں قیام کروں کا اپنی گھری بھی کسی کو دے آیا ہوں اور دو لوٹیں ساتھ لایا ہوں۔ اب مجھے سماعت کے لئے تیار سمجھ۔"

جہاز بادِ کلاں نے یوں کلام کیا۔

جہاز بادِ سندھی کا پانچواں سفر

سہ دل دُکھایا کسی گلچیں نے کوئی گل توڑا
باغ سے نالۂ بلبل کی صدا آتی ہے

اس پر نوجوان زہیر بول اُٹھا "بھائی ایک صلاح ہم دیں گے۔ وہ یہ کہ آئندہ آپ ایسے اوٹ پٹانگ اور بے محل شعر کم از کم اپنے محل میں نہ پڑھا کریں۔ اب تک جو اشعار حضور نے پڑھے، ان کا قصے سے کوئی سروکار نہ تھا۔"

"اے نوجوان بلند بخت! اعتراض کرنا تیری سرشت میں ہے۔ یہ اشعار میں نے روایتِ قدیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پڑھے، پرانے زمانے میں دستور تھا کہ داستان گوئی اشعار کے بغیر نامکمل تھی۔ اسے محض رواداری سمجھ، رواداری

بشرطِ استواری اصل ایماں ہے"۔

"رواداری نہیں ۔ وفاداری بشرطِ استواری" خوردؔ نے لقمہ دیا ۔

"اچھا بابا وفاداری سہی ۔ لیکن واسطہ ہے تجھے اپنے پیر کا ۔ اگر تیرا ۔ پیر ہے تو ۔ تو خاموش رہ ۔ آج کا سفر بالکل مختصر ہے اور غالباً آخری سفر ہوگا ۔ لہٰذا آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ ۔

سُن میں زیادہ دیر بودژدا نہ رہ سکا ۔ لوگ اس لفظ کے نہ ہجے کر سکتے نہ صحیح تلفظ کسی کو آتا تھا ، بار بار معنے پوچھتے ۔ ادھر میری کار بھی بک چکی تھی ۔ سوچا کہ ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے یہ سفر شروع کئے تھے ۔ ورنہ کافی ہاؤس برا نہ تھا چنانچہ پھر باہر نکلنے کی ٹھانی ۔ موسمِ گرما گذارنے کے لئے سانگلہ ہل کا رُخ کیا کہ اسی بہانے بڑے بڑے آدمیوں سے ملاقات ہو جائے گی وہاں نہ جانے کیا ہوا کہ خیالات اس ناچیز کے دفعتہً بدل گئے ۔ غالباً یہ اونچے طبقے کی صحبت کا اثر تھا کہ خاکسار منزلیں مارتا کہیں کا کہیں جا نکلا ۔ آخرکار اس جگہ پہنچ گیا جہاں تو مجھے آج دیکھ رہا ہے ۔ اب بالکل بے نیاز ہوں ، کسی کی پرواہ نہیں کرتا ۔ مطلب ہو تو خیر ورنہ کسی کی مدد نہیں کرتا ۔ کسی کو خط نہیں لکھتا ۔ لوگوں سے تب ہی ملتا ہوں اگر کوئی کام ہو ۔ بلاغرض کسی کو مدعو نہیں کرتا ۔ نہ زیادہ سوچتا ہوں نہ محنت کرتا ہوں ۔ بھلا دنیا کے جھمیلے آج تک کسی سے ختم ہوئے ہیں جو میں اور تو انہیں ختم کر سکیں گے ۔ ہر قسم کی تقریر و تحریر سے اعتبار اٹھ چکا ہے ۔ پڑھنا لکھنا ، ملنا جلنا ۔ یہ سب بیکار باتیں ہیں ۔ شہزادیوں کی متواتر بے وفائی سے شادی میں بھی دلچسپی نہیں رہی ۔ بچوں کی سماجی حیثیت پالتو جانوروں پرندوں کی سی ہے ۔ چند

سال کھیلو پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ماں باپ کو بیوقوف سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے پڑوسیوں نے میرے نظریوں کی استقامت میں بڑی مدد دی ہے۔ آ تجھے بھی قدرت کا تماشہ دکھاؤں۔"

یہ کہکر وہ خورد کو دریچے تک لے گیا۔ کواڑ کھلنے کی دیر تھی کہ دوسرے گھر سے چیخم دھاڑ سنائی دی رکئی ننھے بڑی بھیانک آواز میں چلّا چلّا کر رو رہے تھے۔ خورد نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں تو کلاں نے دریچہ بند کیا۔

"اے میرے دوست! جب کبھی مجھے گھر بسانے یا آئندہ نسل کے متعلق خیال آتا ہے تو فوراً یہ دریچہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں اور پھر اگلی نسل کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جس روز میں اس جہان سے رخصت ہوا، وعدہ کرتا ہوں کہ بچوں کو خاندان کا نام روشن کرتے دیکھنے دوبارہ ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"اُفّوہ! ۔ تچ ۔ تچ ۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔" خورد نے اظہارِ افسوس کیا۔

"اب میں تمدن زدہ نہ ہوں، فی ملبسٹ!" کلاں نے اپنے سینے پر مُکّوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔ "خبردار جو اس لفظ کے معنی پوچھے ہیں تو۔ اور اے مردِ جلد باز میرے پانچوں سفر تمام ہوئے۔ آفیشلی مجھے سات سفر کرنے چاہیئں تھے لیکن دنیا کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پانچ کافی ہیں۔ ویسے بھی محسوس ہوتا ہے کہ ذہنی تگ و دو میں اپنی منزل میں نے پالی ہے، میرا مقام مجھے ہاتھ آ گیا ہے اور تو جو یوں بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا ہے اگر چاہے تو بقیہ دو سفر تو کر آ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"جی نہیں۔ ایسے ماحول اور ایسا محل چھوڑنے کو کس کا جی چاہتا ہے۔"

"یہ محل میرا کہاں سے الاٹ شدہ ہے۔ شروع شروع میں خاکسار نے اخباروں رسالوں میں بڑے دردناک بیانات چھپوائے کہ میں ایک ادبی اکادمی کھولنا چاہتا ہوں۔ پبلک سے زبانی حوصلہ افزائی تو بہت کی لیکن چندہ کسی نے نہ بھیجا۔ دراصل پبلک بڑی ہوشیار ہو گئی ہے۔ فوراً سمجھ جاتی ہے ـــ (سرگوشیوں میں) اے رفیقِ تنہائی یہ اکادمی کا ریکٹ چل جاتا تو دولت کا ڈھیر لگ جاتا!"

اور برخوردار تیری پوسٹ دار پلین کہاں ہے؟ نوکری کے لئے اپنا نام رجسٹر کروایا؟"

"نام رجسٹر تو نہیں کرایا لیکن جس محلے میں رہتا ہوں وہاں چوہے بلّیاں اور کتّے بہت زیادہ ہیں، سوچ رہا ہوں کہ وہاں ایک چینی ریستوران کھول لوں۔"

"اُس سے تو یہ بہتر ہے کہ میرے ساتھ شرکت کر۔ تو کافی فرمانبردار نوجوان نظر آتا ہے کہ کام تجھے کوئی خاص نہیں ہے۔ تیری بلند پیشانی کو دیکھ کر میرا مُوڈ یکلخت ادبی و علمی ہو گیا ہے۔"

"یہ بلند پیشانی نہیں گنجے پن کی پہلی نشانی ہے۔"

"یہ گنجِ بے بہا تُو نے کیونکر پایا؟"

"ایک دو مرتبہ سول سروس کے مقابلے میں شرکت کی تھی۔"

"اخاہ! پھر تو تُو پورے نیم میں تولنے کے لائق ہے۔ پہلے اپنی ہیئت کذائی ٹھیک کر، حجامت کرا، عینک بدل، ہر ہفتے غسل کیا کر اور ہر روز شیو، کپڑوں کو دُھلوا کر استری کرایا کر۔"

"کہیں مجھے انٹلکچوئل اپنی برادری سے نہ نکال دیں۔"

"تو کیا ہُوا؟ خیال ہے کہ چند شرفاءِ ذی مرتبہ کو خوش کرنے کے لئے ایک بلند پایہ

کا معیاری رسالہ جاری کروں۔ دلیپ کام درست دگ کریں گے لیکن نام ہمارا ہوگا کیا ارادہ ہے ۔۔۔؟"

"خاکسار آمادہ ہے ۔"

"اب جب کہ تو نے سب کچھ سن لیا ہے بتا کہ تو بھی کبھی ایسی کٹھن منزلوں سے گذرا ؟ کبھی ایسی مصیبتیں تجھ پر بھی پڑیں ۔۔؟"

خورد نے کلاں کا ہاتھ چوما اور آنکھوں میں آنسو لا کر بولا "آپ واقعی بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہوئے، صید انتشار ہوئے۔ اب آپ حظ اٹھائیں، دل کھول کر کھائیں اور کھلائیں۔ خدا کرے تمام عمر شاد رہو، نائل المرام و بامراد رہو"

اس پر جہاز باد سندھی کلاں نے خورد کے سر پر دستِ شفقت پھیرا، اس کا رتبہ اور بھی بڑھایا۔ جب تک زندہ رہے دوجان اور دو قالب ہو کر رہے۔

خالقِ زمین و زماں، آفرینندۂ ہر دو جہان، کارسازِ مطلق، قادرِ برحق کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیئے کہ بندوں کو کیسی کیسی مصیبتوں سے بچاتا ہے۔ کاڑھے وقت میں اُسی کا فضل آڑے آتا ہے۔

نتیجہ ۔۔ بس اے پیارے بچّو! نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سے نتیجہ نکلے۔

---

۲ نظمیں

ا- کون

کون ہے میری جواں سال امنگوں کا سہارا مرے ہمدم مرے دوست !
تجھ کو معلوم اگر ہے تو بتا
کس کے شب رنگ معطر گیسو
میرے بازو پہ بکھر جاتے ہیں ؟
کس کے خوابیدہ شبستانوں میں
کیف آمیز اندھیرے لے کر
نیند کی دیوی، تکلف کے بغیر
میری پلکوں، میری آنکھوں میں دبے پاؤں چلی آتی ہے
موزے جب گردش رفتار سے گھس جاتے ہیں
سوزنِ سادہ سے کون اُن کو رفو کرتا ہے ؟

میری بکھری ہوئی بوسیدہ کتابیں آخر
کون چُن دیتا ہے ترتیب سے الماری میں
سلوٹیں دیکھ کے ملبوس پہ خم کھائی ہُوئی
اِستری کون کیا کرتا ہے ؟
آنکھ کس کی مرے بٹوے پہ جمی رہتی ہے
کون ہر ماہ چکا دیتا ہے دھوبی کا حساب ؟

جب کبھی زندگی درماندہ و واماندہ نظر آتی ہے
اور بن جاتی ہے اِک خُوں بھرا جام
تلخیاں روح میں رچ جاتی ہیں
تہ بہ تہ ظلمتیں جم جاتی ہیں
زیست اور موت میں رہتا نہیں ننھا سا تفاوت باقی
ایسے لمحوں میں سدا
کون دیرینہ رفیق آکے پکڑتا ہے مجھے بازو سے ؟
اور لاتا ہے سوئے بزم، جہاں میرا لہُو کھول کے تپ جاتا ہے
تو بتا سکتا ہے کیا ؟
ہاں ذرا میں بھی تو سنوں
کیا کہا — ؟
تیرے گستاخ تبسم پہ ہنسی آتی ہے
تیرا وجدان ابھی تک ہے بہت خام اے دوست !

کیا بتاؤں میں تجھے
وہ کوئی اور نہیں
وہ تو میں خود ہوں۔ مری جاں، مرے ہمدم، میرے دوست!

۲۔ خرّاٹے

اس نے خرّاٹے سنے۔
دفعتاً چونک پڑا، جاگ اٹھا،
لبِ نازک پہ مچلتے تھے "رسیلے نغمے"
اور بیوی تھی کہ خوابیدہ تھی
فربہی تھی کہ جوانی کا سہارا لے کر
تہہ بہ تہہ جسم پہ اس طرح جمی جاتی تھی
جس طرح کیک کرسمس کا ہو۔
اس نے خرّاٹے سنے۔
مٹھیاں بھینچ کے یوں کہنے لگا
آج نیند آئی تھی دو روز کے بعد
کہ حسیں ہونٹوں کے نغموں نے سکوں چھین لیا
اور اب زندگی بھر دن کو نہ آئے گا قرار
کہ یہ "نغمے" کسی اندوہِ مسلسل کا پتہ دیتے ہیں۔
ایسے جینے پہ خدا کی پھٹکار!

اُس نے خرّاٹے سُنے۔

(اپنی بیوی کی لگاتار علالت کا خیال
یہ عیادت کا مسلسل بُحران
کہ کسی پل بھی سکوں مل نہ سکا
اور پھر اس پہ ستم دیدوں طبیبوں کا نزول
حُسن بیمار۔ مگر ویسا ہی بیمار رہا
جیسے صدیوں کا سماج)

اس نے خرّاٹے سُنے۔

اُٹھا آئینے میں صورت دیکھی
آنکھ کے گرد سیاہ حلقوں کو رقصاں پایا
سبزۂ خط تھا ہم آغوشِ ذقن
اپنی صورت سے ڈرا۔
اور کیا جانئے کیا سر میں سمائی وحشت
دل میں اک سوزِ جواں جاگ اُٹھا

اُس نے خرّاٹے سُنے۔

اور کچھ سوچ کے الماری کی جانب لپکا
اُسترا ہاتھ میں لیا۔ شدرے پہ رکھ کر دیکھا
دھار تھی تیز کسی تیغِ مجاہد کی طرح
دیکھ کر بیوی کے مرمرے گلو کی جانب

مزید حماقتیں

اس نے آئینے میں خود پر بھی نظر دوڑائی
اور سوچا کہ یہی موقعہ ہے۔
اُس نے خراٹے سُنے۔
کمرے سے جھانک کے باہر دیکھا
اک ہمہ گیر خموشی تھی فضا پر طاری
دُور اک کتّا پڑا سوتا تھا
اس نے سوچا کہ یہی موقعہ ہے
۔ اُسترا زور سے پکڑا، کانپا
اور پھر شیو بنانے لگا جلدی جلدی۔

ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد

خالد نے ولایت سے آکر مقصود گھوڑے کو ہوم سِک کر دیا۔

خالد کے آنے پر کرکٹ کا ایک میچ ہوا جس میں ایک طرف خواتین تھیں اور دوسری طرف حضرات۔ حضرات کو بُرقعے پہننے پڑے۔ ماڈرن قسم کے مصری، ترکی یا اصل بغدادی بُرقعے نہیں بلکہ پُرانی وضع کے شٹل کاک نما بُرقعے جنہیں پہن کر باہر والوں کو اندرونِ بُرقعہ کی خبر نہ ہو اور اندر سے مقامی حالات کا کچھ پتہ نہ چلے۔ بولنگ کرتے وقت بھی برقعوں کے وہ بند بند رہتے اور گیند کے پیچھے بھاگتے وقت بھی۔ لوگوں کو شاید پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بُرقعے پہننا کیا معنی رکھتا ہے۔ حضرات نے اُلجھ کر خوب نٹوں کے تماشے دکھائے۔

میں سکور گِن رہا تھا اور شیطان بیٹھے ٹٹنگ کر رہے تھے۔ وہ اس قسم کی تقریبوں پر ہمیشہ ٹٹنگ کیا کرتے ہیں، اپنی محبوبہ کے لئے کبھی سویٹر بُن رہے ہیں کبھی جُرابیں۔

آشوب حبشی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ وہ جنرل گارڈن پر تنقید کر رہے تھے۔ حبشیوں پر بحث ہو رہی تھی۔ میں حبشیوں کا طرف دار تھا کیونکہ وہ افریقہ میں رہتے ہیں۔

اس روز بالکل معمولی سی صبح طلوع ہوئی۔ روزمرہ کی طرح جمائیاں لیتا سورج نکلا۔ پرندے بھی اُنہی پُرانی سُروں میں چہچہائے۔ ریڈیو پر حسبِ معمول سارنگی پر بھیرویں سُنائی گئی۔

کسے پتہ تھا کہ یہ معمولی صبح ایک اہم دن میں تبدیل ہوا چاہتی ہے۔

خالد دو سال کے بعد لوٹے تھے۔ اب وہ پُرانے خالد نہیں تھے جو ہر وقت لائف کا رونا رویا کرتے تھے "فلاں کی لائف بن گئی" "فلاں نے فلاں کی لائف تباہ کر دی"۔ اب وہ مجسّم آئن سٹائن کی تھیوری تھے۔

خالد کا شیطان سے تعارف کرایا گیا۔ خالہ جان جنرل کے جیسے ہیں ... "میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"پہلے آپ اپنے لئے کچھ کیجئے" شیطان نے صابن کے جھاگ کی طرف اشارہ کیا جو خالہ کے چہرے پر لگا ہوا تھا۔

دونوں دُور دُور جا بیٹھے۔

"بیٹی، اب آ بھی جاؤ۔ اتنی دیر کر دی" چشتی صاحب کار کی طرف دیکھ کر چلّائے۔

"اتنی دیر سے کہہ تو رہی ہوں کہ بس ایک منٹ میں آئی" ہم سب مُڑ کر دیکھنے لگے دروازہ کھلا اور کوئی چیز بلاّ ہاتھ میں لئے نکلی جو چند لمحوں کے لئے لڑکی سی معلوم ہوئی معلوم ہوا کہ یہ چشتی صاحب کی دختر نیک اختر ہیں۔ ان کا نام انجم ہے اور مجوزہ شیطان ہیں شیطان کی زندگی میں پہلے دو انجم آ چکی تھیں جنہیں تمیز کرنے کے لئے انجم خورد اور انجم کلاں کہا جاتا تھا۔

"اور یہ تیسری انجم؟"

"یہ انجم خورد بُرد ہے" وہ بولے۔

میں نے انہیں بتایا کہ اب تو شاید ہی آس پاس کے علاقے میں کوئی انجم باقی رہی ہو کتنا اچھا ہو کہ اگر اس قسم کا اشتہار دے دیا جائے۔

کیا آپ انجم ہیں؟"

اگر ہیں تو مزید وقت ضائع مت کیجئے۔ فوراً مندرجہ ذیل پتے پر خط و کتابت کیجئے جو صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔

چشتی صاحب کے عزیزوں سے تعارف ہوا۔

"یہ کلیم الدین عرف کالو ہیں"

"آداب عرض!"

"اور یہ بہاء الدین عرف بھورو ہیں!"

"آداب عرض!"

"اور آپ کی تعریف۔۔۔؟" ایک صاحب نے اُن کے متعلق پوچھا جو کالو اور بھورو صاحب کے ساتھ کھڑے تھے۔

"انہیں ڈبّو سمجھ لیجئے" شیلیان نے جواب دیا۔

چار بالکل ایک قسم کے حضرات سے مل کر شیلیان نے کہا "مجھے آپ چاروں سے مل کر بہت خوشیاں ہوئیں"

میں نے انجمؔ کے متعلق پوچھا اور عاشق ہونے کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ وہ بولے "میں انجمؔ پر ہرگز عاشق نہ ہوتا۔ اگر وہ رضیہ سے اس درجہ مشابہت نہ رکھتی" میں نے انہیں بتایا کہ رضیہ اور انجمؔ میں صرف اس قدر مشابہت ہے کہ دونوں کی دو دو آنکھیں ہیں، ایک ایک ناک اور دو دو کان ہیں۔ بس!

اب مردوں کی باری تھی۔ خواتین فیلڈ کرنے نکلیں۔ تالیوں کے شور میں دو حضرات برقعے پہن کر نکلے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ بھٹک گئے۔ ایک کا رُخ شمال مشرق کی طرف ہو گیا اور دوسرے کا شمال مغرب کی طرف۔ خواتین نے ان کی مدد کی۔ انگلی پکڑ کر انہیں وکٹوں کے سامنے لایا گیا۔

پہلی گیند پر ایک صاحب نے برقعے کے اندر حیرت انگیز ہٹ لگائی۔ دوسری گیند پر گیند بلّا برقعہ سب آپس میں اُلجھ گئے۔ تیسری پر انہوں نے زور سے بلّا اپنے گھٹنے پر دے مارا اور بجائے سامنے بھاگنے کے وکٹ کیپر کی طرف چل دیئے۔ آواز دے کر انہیں واپس بلایا گیا ایک صاحب نے خواہ مخواہ اُچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ برقعے میں بھڑ داخل ہو گئی ہے برقعہ اتار کر بھڑ کو باہر نکالا گیا۔ انجم کو گھورتے رہنے کے باوجود مقصود گھوڑا اچھا کھیلا۔ پھر موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ مقصود گھوڑا بھاگتا بھاگتا رُک گیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر سائیکل کے چلے جانے کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ رن آوٹ ہو چکا ہے۔

انجم نہ جانے کس بات پر کس سے خفا ہو رہی تھیں۔ خالد نے آگے بڑھ کر معافی مانگی۔

"معافی! معافی کس بات کی؟"

"پتہ نہیں۔۔ لیکن چونکہ میں مرد ہوں اس لئے قصور لازمی طور پر میرا ہی ہو گا۔"

انجم شرمانے لگیں، دراصل ان کا ہاتھ چھل گیا تھا اور ڈاک کے ٹکٹ جتنے زنانہ رومال سے مالش کر رہی تھیں۔ شیطان بولے۔ "اس پر تھوڑی سی سپرٹ لگاؤ۔"

پھر انجم کے چہرے کو غور سے دیکھ کر بولے۔۔۔۔ "اس پر تھوڑی سی سپرٹ بے شک مت لگاؤ۔"

میں نے شیطان سے خالد کے متعلق رائے پوچھی۔ انہوں نے بتایا۔ "یہ شخص اتنا چست ہے کہ

ہاتھ میں کیمرہ لے کر خود اپنی تصویر اُتار سکتا ہے۔"

"اور یہ لڑکی۔۔۔؟" شیطان نے بے صبری سے پوچھا۔

"اس کے سامنے ایک شاندار ماضی ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور حبشی صاحب۔۔۔ وہ بزرگ نما شخص؟" میں نے خالد سے پوچھا۔

"وہ شخص"۔ خالد نے ہونٹ چبا کر کہا "ایسا ہے کہ اگر پنیر سے اس کا واسطہ پڑ جائے تو پنیر ہار مان لے اور دوبارہ دودھ بن جائے۔"

اگلی صبح اخباروں میں چھپ گیا کہ خواتین نے حضرات کو تقریباً ڈیڑھ سو رنز سے شکستِ فاش دی۔

حبشی خاندان تین سو سال پُرانا تھا۔ اس کا ثبوت خاندان کے افراد کے چہروں سے ملتا تھا وہ کسی دوسرے ملک سے آئے تھے اور وہاں کسی اور ملک سے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے کہ بھلا وہ وہاں سے یہاں کیوں آئے۔ میرا خیال تھا کہ ایسے لوگ کسی ملک میں زیادہ دیر قیام نہیں کر سکتے، مقامی باشندے تنگ آجاتے ہیں۔ وہ حبشی کیوں کہلاتے تھے؟ یہ ایک راز تھا۔

خاندان کے سارے افراد کی تعداد دو ڈھائی درجن کے لگ بھگ تھی۔ لوگوں کی رائے تھی کہ وہ درجن بھر ہی کافی ہوتے۔ خاندان کے موجودہ سرکردہ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے اور ان بزرگ کی سرکردہ چند جہاں دیدہ خواتین تھیں۔

یوں دیکھنے میں وہ سب بڑے شرمیلے تھے لیکن آپس میں ہرگز شرمیلے نہیں تھے۔ اس کا ثبوت ان متعدد شادیوں سے ملتا تھا جو حبشی خاندان میں ہوتی رہتیں۔ حبشی حضرات شروع شروع میں بڑے خلیق اور مہمان نواز ہوتے لیکن بہت جلد سیکھ جاتے۔ حبشی بچے بڑے خوبصورت ہوتے لیکن پھر بڑے ہو جاتے۔ وہ بچے جنہیں آزادانہ تعلیم دی جاتی کہ خود صلاحیتیں پیدا کر سکیں، خلافِ توقع نامعقول نکلتے

اور وہ بچے جنہیں ڈرا دھمکا کر پڑھایا جاتا وہ بھی خلافِ توقع نامعقول نکلے۔ چنانچہ سارے حشمی بچے احمق تھے۔ بڑے حشمی اور بھی زیادہ احمق تھے کیونکہ ان کا وزن زیادہ تھا۔

ویسے حشمیوں میں کچھ اتنی زیادہ بُرائیاں بھی نہ تھیں، مصیبت یہ تھی کہ اُن کی خوبیاں نہایت بیہودہ تھیں۔ شیطان کی عادت ہے کہ کسی نئی جگہ پہنچتے ہی ادھر اُدھر دیکھتے ہیں سب سے عجیب و غریب کُنبہ چُن کر اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سوشل ہو جاتے ہیں۔

جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ انجم حشمی عرف نور حشمی پر عاشق ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو سارے دوست حیران ہوئے سوائے میرے۔ میں شیطان کی کسی بات پر حیران نہیں ہوتا۔

اُس خاندان میں سب سے نمایاں شخصیت آشوبؔ صاحب کی تھی۔ یوں تو وہ شاعر بھی تھے لیکن اُن کی سب سے بڑی خوبی اُن کی باتیں تھیں۔ متواتر اَن تھک باتیں۔ مجموعی طور پر ان کی آواز بُری نہیں تھی بس وہ اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کے عادی تھے۔ یہ استعمال فضول خرچی تک پہنچ چکا تھا۔ جب کبھی اُن کے ہاں فون کیا جاتا تو آشوب صاحب کی آواز بیک گراؤنڈ میں ضرور سُنائی دیتی۔

ان کے کمرے میں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے کئی حضرات ہر وقت بیٹھے رہتے۔ یہ حضرات آشوب صاحب کی طرح بیکار تھے۔ ان کا گزارہ بھی مکانوں اور دکانوں کے کرائے پر تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے تھے جو کسی نہ کسی غرض سے آتے، قرض مانگنے، اپنی مصیبتیں سنانے یا حشمی لڑکیوں کے رشتے کی درخواست کرنے۔

لیکن ہر ایک کو حشمی صاحب کی باتیں سننا پڑتیں۔ چنانچہ صبح و شام، دن رات، گرمی سردی، ملاقاتیوں اور باتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ افواہ تھی کہ اگر وہ باتیں نہ کریں تو انہیں مالیخولیا ہو

جاتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ مالیخولیا کو وہ ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تبدیلی گفتگو کی غرض سے بہار پر گئے۔ وہاں خواتین زیادہ تھیں لہٰذا باتیں سننے والا کوئی نہ مل سکا۔ آشوب صاحب کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

وہ طرح طرح کی مفید باتیں سناتے مختلف شہروں کے زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم ٹمپریچر بتلاتے۔ یہ بتاتے سلفا مائڈ دوائیاں مغلوں کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ بے خبری کے عالم میں ایکس ریز اور ریڈیم اشوک کے وقتوں میں دریافت ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ استعمال انگریزوں کے کہنے پر شروع ہوا ہے۔ اگر شیخ سعدی اپنی سیاحت کے دوران میں ایک چکر نیوزی لینڈ کا لگا آتے تو جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ بلکہ جغرافیہ مختلف ہوتا۔ حقہ حضرت نوحؑ کے وقتوں کی چیز ہے۔ امرود میں وٹامن اے بی سے لے کر وائی زیڈ تک ہوتے ہیں۔ ہنری ہشتم نے ہشت شادیاں کیں لیکن کامیاب ایک بھی نہ ہوئی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے خواب بھی سناتے جو اکثر اُن کے احباب کے متعلق ہوا کرتے۔ خوابوں میں زمین پھٹتی اور ان کا ایک دوست اندر سما جاتا۔ یا دیکھتے دیکھتے بجلی کڑکتی اور ان کے ایک دوست کے اوپر جا گرتی یا ایک دیو آتا اور ان کے کسی دوست کو اٹھا کر دوڑ جاتا۔

جب وہ اپنے ڈراونے اور تباہ کن خواب چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے حضرات کو سناتے تو ہمدردی کا اظہار بھی کرتے جاتے اور ایسی نگاہوں سے انہیں دیکھتے جیسے ان کی زندگی کے دن گنے گنائے رہ گئے ہیں۔ اب اللہ ہی حافظ ہے۔

اُن کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے بہت دیر سے بیٹھا ہوں۔ باتیں خواہ کتنی آہستگی سے کی جاتیں انہیں سنائی دے جاتیں۔ بعض اوقات تو وہ خیالات تک کو سُن لیتے۔

لیکن شیطان کا رویہ اُن کے ساتھ از حد برخوردارانہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کے خیالات صدیوں سے یکساں ہیں۔ اُن کی ہر بات پر شیطان بڑی طمانت سے جی ہاں کہتے اکثر یہ جی ہاں فقرہ ختم ہونے سے پہلے کہہ دی جاتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شیطان قرض کے سلسلے میں بہت کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے کہ اس طرح انہیں نوحسینی پر لگاتار عاشق رہنے کے موقعے ملتے رہتے ہیں۔ بقیہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ محض مشق کر رہے ہیں۔ ان دنوں اور کسی نے واقفیت نہیں ہے اور وہ آؤٹ آف پریکٹس نہیں ہونا چاہتے۔ شیطان اس قسم کے تجربے کرنا کبھی بند نہیں کرتے جیسے خواتین اپنے کوٹ کے مٹن سردیوں میں کبھی بند نہیں کرتیں۔ مجھ سے وہ اکثر کہا کرتے "حالات اور بھی خراب ہو سکتے تھے۔ کیا ہوتا اگر میں اور تم حسینی ہوتے۔"

خالد اور شیطان کے درمیان کھنچاؤ یا تناؤ جو کچھ بھی تھا بدستور رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کتابی قسم کے آداب برتتے۔ تصنعات سے کام لیتے اور اکثر خاموش رہتے۔ آخر ایک روز شیطان بولے "خالد صاحب! آپ نہائیت نامعقول قسم کے انسان ہیں۔"

"رومی صاحب، آپ نہایت بیہودہ شخص ہیں"، جواب ملا۔

اس کے بعد جو فقرے استعمال کئے گئے وہ ناقابلِ اشاعت تھے۔

پھر شیطان نے آگے بڑھ کر خالد کو اس زور سے گلے لگایا کہ اُن کی جیب میں رکھے ہوئے دو سگار چور چور ہو گئے۔ "بسم اللہ! بسم اللہ! دیکھئے اب بے تکلف ہوتے ہیں"

شیطان، انجم والے رومان سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ زندگی میں انہیں ایک وسیع خلا محسوس ہوتا ہے ایسا خلا جسے ایک رقیب ہی پُر کر سکتا ہے۔ کیا خبر تھی کہ زندگی میں ایسے دن بھی دیکھنے ہوں گے کہ رقیب کے بغیر محبت کرنی پڑے گی۔ اس

قسم کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ کاش کہیں سے آتا۔ کوئی رقیب۔ محبت کے سہانے افق پر آہستہ آہستہ جلوہ نما ہوتا، یا تاریکیوں سے دفعتہً آن کودتا۔

اس سے پہلے بھی وہ رقیب کی خواہش کر چکے تھے مجھ سے کہا۔ میں نے معذوری ظاہر کی کہ میرے حالات ایسے ہیں کہ کم از کم سال بھر مجھے ایسے شخصوں سے دور رہنا پڑے گا۔ خالد سے پوچھا۔ وہ بولے، میں اس قدر تبدیل ہو چکا ہوں کہ مجھ میں اب رقیب بننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔

شروع شروع میں ان کا معیار بلند تھا۔ سرد آہ کھینچ کر کہتے "دنیا بھر کو رقیب ملتے ہیں۔ اگر نہیں تو ہماری ہی قسمت میں نہیں۔ کاش کسی طرح آتا، کوئی رقیب، کیسا ہی ہو، خوبصورت اور معمولی دماغ کا یا معمولی شکل والا اور ذہین (آہستہ آہستہ معیار بدل گیا) موٹا یا بھدا رقیب، باتونی، عینک لگانے والا یا منشی فاضل (آخر میں) زندہ ہو یا مُردہ "

اس سٹیج پر مقصود گھوڑے کو لایا گیا۔

مقصود گھوڑا ہوسٹل میں امن اور چین سے دن گزار رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا، بڑوں کا ادب کرتا، سگریٹ پیتا نہ کوئی اور چیز۔ ہر روز علی الصبح اٹھتا اور رات کو جلد سو جاتا۔ الغرض وہ نہایت اعلیٰ، پاکیزہ اور بھکی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتہً اس کے ماموں جان کو چند ماہ کے لئے کہیں جانا پڑا۔ انہوں نے مقصود گھوڑے کو اپنی کوٹھی کا چوکیدار مقرر کیا اور ہدایات دیں کہ وہ کوٹھی میں منتقل ہو جائے۔ گھر کا خیال رکھے۔ یہ انتقال فوراً عمل میں لایا گیا۔

پہلا ہفتہ تو ہوسٹل کے انداز میں گزرا۔ پھر بڑے بڑے آراستہ و پیراستہ کمرے، حریری پردے، ملائم قالین، گلدان میں سجے ہوئے معطر پھول، جذباتی قسم کی تصویریں، ریڈیو سے نکلتے ہوئے پُرسوز نغمے ۔۔۔ مقصود گھوڑے کے اعصاب پر سوار ہونے لگے۔

گھر، کار، تجوریاں ۔۔۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا لیکن مقصود گھوڑا خوش نہیں تھا، وہ دن بدن غمگین ہوتا گیا۔ آہیں بھرنے لگتا، کلاس میں بیٹھا بیٹھا ایسا کھو جاتا کہ پروفیسر بھی نہ پا سکتے۔ موقع بے موقع چاند کی طرف دیکھنے سے بھی نہ چوکتا۔ آخر ایک روز اس نے چائے پر عجیب سی گفتگو شروع کر دی۔ زندگی کے بے تکے پن پر۔ "یہ کیا ستم ہے کہ ہر روز مقررہ وقت پر اٹھو، شیو کرتے وقت اپنا چہرہ دیکھو۔ وہی چہرہ جو بار بار دیکھا ہے، جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ناشتہ کرو تو وہی چائے اور وہی ڈبل روٹی۔ کالج جاؤ تو وہی لڑکیاں، دوپہر کے کھانے کے بعد ریڈیو پر وہی ریکارڈ، اور ایک ضروری اعلان، رات کو رات کا کھانا ۔۔۔ زندگی میں کسی قدر جمود ہے۔ ایک دن دوسرے دن جیسا ہے۔ دوسرا تیسرے جیسا، تیسرا چوتھے جیسا، چوتھا ۔۔۔"

"تم اس جمود کو توڑتے کیوں نہیں" شیطان بولے ۔۔۔ "صبح اٹھ کر رات کا کھانا کھایا کرو، پھر قیلولہ کرو، سہ پہر کو کالج جاؤ۔ وہاں غسل کرو اور سنگل روٹی کا ناشتہ، حجام سے شیو کراؤ اور حجام کا شیو خود کرو ۔۔۔"

"آہ! تم مجھے سمجھے نہیں ۔۔۔ اس جمود کی وجہ تنہائی ہے" مقصود گھوڑا آسمان کی طرف دیکھ کر بولا ۔۔۔ ہم سمجھ چکے تھے۔

چنانچہ اُسی شام کو ایک نجومی آیا۔ ویسے ہمیں کسی نجومی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جس قسم کی زندگی ہم گزار رہے تھے۔ اس کے لئے نجوم بیکار تھا لیکن مقصود گھوڑے کی قسمت پوچھی گئی۔ نجومی نے شیشے کے گولے کو سامنے رکھ کر ایسی زبان میں باتیں شروع کیں جیسے برما۔ ملایا اور چین کے سننے والوں کے لئے ریڈیو کا پروگرام ہوتا ہے۔ پھر وہ عام فہم فقرے استعمال کرنے لگا "اب دُھند صاف ہو رہی ہے۔ وہ سامنے امریکن کار جا رہی ہے۔ وہ دیکھئے اس کا اگلا حصہ گزر رہا ہے۔ اب درمیان کا حصہ گزرا۔ اور اب آخری۔ لیجئے پوری کار گزر گئی۔ ریڈیو گرام کوٹھی کے

سامنے آکر رُکی۔ یہ کون اُتر رہا ہے۔ یہ چہرے پر کیا الا بلا پہنے ہوئے ہے۔ تانگے کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ اُفّوہ یہ تو سہرا باندھے ہوئے ہے۔ اب دھند چھا رہی ہے۔ جتنی دیر دھند صاف ہو مجھے ایک سگریٹ دیجئے۔ اور یہ کون ہے، ایک لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی بھویں اکھیڑ رہی ہے۔ سامنے ایک نوجوان اپنی مونچھیں تیز کر رہا ہے۔ اب وہ سرے سے بھویں بنا رہی ہے ارے! نوجوان تو یہی ہیں۔۔۔" مقصود گھوڑے کی طرف اشارہ ہو گیا (انجم بھویں اکھیڑتی تھی)

رات گئے وہی شخص شیطان سے پچیس روپے مانگنے آیا۔ شیشے کا وہ گولہ ٹوٹ گیا تھا۔

ہمیں کسی نے بتایا کہ چشتی بیمار ہیں، ہم عیادت کو گئے تو دیکھا کہ وہ بے حد زندہ ہیں اور گلیڈسٹون کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ بیگم چشتی نے حسبِ معمول خالد کو نہیں پہچانا۔ خالد نے حسبِ معمول انہیں یاد دلایا کہ ایک چھوٹی سی کار میں وہ ایک روز بازار گئی تھیں جہاں انہوں نے مشین پر اپنا وزن بھی کیا تھا۔ وزن کے کارڈ پر قسمت یہ لکھی تھی "آپ کا محبوب آپ کے لئے تڑپ رہا ہے" موٹر کی اگلی سیٹوں پہ ایک تو ڈرائیور تھا اور سفید قمیض پہنے ہوئے ایک شخص "ہاں یاد ہے"

"وہ شخص میں تھا۔۔۔"

چشتی ڈاکٹروں کی برائیاں کرنے لگے۔۔۔ "پہلے انہوں نے میرے گلے کے غدود نکالے، پھر ٹانسل، پھر نصف سے زائد دانت پھر اپینڈکس، اگر اُن کی بتائی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تو کبھی کا سدھار چکا ہوتا۔ اپنے رخصت شدہ اعضا سے ملنے"

"آپ مری کیوں نہیں جاتے"

"کیا مطلب"؟ چشتی چونک کر بولے

"جی میرا مطلب ہے کوہ مری۔۔۔"

"اوہ۔۔۔"

جس وقت ریڈیو پر "خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو" ہو رہا تھا تو خالد ایک موٹے تازے بچے کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بچے کو فوراً اندر بھجوا دیا گیا۔

"اس بچے کا نام کیا تھا؟" خالد نے پوچھا۔

"لطیف"

"اور اس کا ۔۔؟" خالد نے ایک نہایت ہونق بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"شکیل"

"اور وہ ۔۔؟" سامنے ایک بیوقوف سی بچی بیٹھی تھی۔

"فہمیدہ"

"ہم لوگ نام رکھنے میں بہت جلدی کرتے ہیں میرے خیال میں آٹھ دس سال کی عمر سے پہلے نام نہیں رکھنے چاہئیں۔ اس کے بعد بچے کی شکل و صورت اور حرکتیں وغیرہ دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔"

"اور اتنی دیر تک ۔۔۔ اتنے دنوں انہیں نمبروں سے پکارا جائے ۔۔؟" چشتی صاحب چڑ کر بولے۔

"جی نہیں عارضی نام دے دیئے جائیں۔"

چشتی صاحب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے کئی حضرات اُن کے منتظر تھے۔

اگر آپ کو کوئی ایسا انسان نظر آئے جو تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو۔ پھر ریل کی سیٹی یا موٹر سائیکل کی آواز سن کر اُسے دورہ سا پڑ جائے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آواز کی سمت میں ٹکٹکی باندھ کر دیر تک دیکھتا رہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے مقصود گھوڑے کو دیکھا ہے وہ نہایت کم گو

اور خاموش طبیعت ہے اس لئے کہ اُسے باتیں کرنی نہیں آتیں۔ آپ اس سے کوئی سوال کیجئے وہ آپ کو کسی اور سوال کا جواب دے گا۔ ضدی اتنا ہے کہ ہمیشہ اپنی ہی مرضی کرے گا۔ جس طرح اُس کا جی چاہتا ہے۔ اگر اُسے منع کیا جائے تو کہیں اور جا کر اُسی طرح کرے گا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ رقیق القلب ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا ہے کہ رقیق القلب ہونا تو ایک طرف رہا اُسے اس لفظ کے ہجے تک نہیں آتے۔ البتہ وہ قنوطی ضرور ہے۔ قنوطی بھی ایسا کہ جب صبح صبح لوگوں کی گھڑیوں میں آٹھ بجتے ہیں تو اُس کی گھڑی میں شام کے آٹھ ہوتے ہیں۔

"پتہ نہیں" اور "ہوسکتا ہے"...... اس کا تکیہ کلام تھا یا تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ زبردست ڈپلومیٹ ہے لیکن شیطان کہتے تھے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں سچ مچ کچھ بھی پتہ نہیں اور جن کے لئے واقعی سب کچھ ہوسکتا ہے جو دوگانہ شکر کو وہ پیار بھرا گانا سمجھتے ہیں جسے ایک لڑکا اور ایک لڑکی مل کر گائیں۔

وہ پرسوز گانے گایا کرتا۔ ہمیشہ کسی درخت یا پودے یا کسی چیز کی آڑ لے کر تاکہ اگر اس کی طرف کچھ پھینکا جائے تو اُسے نہ لگے۔ اس سوز کی وجہ کوئی ٹریجڈی تھی جو اس کی زندگی میں آئی۔ ٹریجڈی کی وجہ ایک لڑکی ہی ہوسکتی ہے چنانچہ اس حادثے کے بعد اس نے کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھا یا کم از کم زیادہ دیر تک نہیں دیکھا۔

ہمارا زیادہ وقت اُس کی پُرتکلف کوٹھی میں گزرتا۔ اس کے ماموں کی کار کو لئے پھرتے اس کی لائبریری کی ساری جاسوسی کتابیں ہمارے لئے تھیں۔ اس کے پیانو پر شیطان ایک عجیب و غریب راگنی بجاتے۔ خالد نے بتایا کہ وہ مصری آسا دری تھی۔ انہوں نے صحراؤں میں بارہا ساربانوں کو یہی چیز گاتے سنا تھا۔ البتہ دور سے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ کون گا رہا ہے! ساربان یا اونٹ یا دونوں؟

اس سارے شور و غل کے باوجود مقصود گھوڑا اُداس رہتا کبھی وہ اپنے آپ کو ازلی کنوارا سمجھتا کبھی ابدی کنوارا۔ خالد مشورہ دیتے کہ فوراً شادی کر لو۔ اس ملک میں کنوارا رہنا بہت مشکل ہے جو یہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ہتھیلی پر شادی کی لکیر سب سے پہلے آتی ہے۔ اگر تم سوشل ہوئے تو لوگ شبہ کریں گے کہ لفنگے ہو اور اگر الگ تھلگ رہے تو تب بھی لوگ شبہ کریں گے کہ لفنگے ہو۔

مقصود گھوڑا دوسرے ملکوں کی مثال دیتا جہاں لاتعداد کنوارے اطمینان اور چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں

"وہاں کی بات اور ہے۔ ان لوگوں کے مشاغل بے شمار ہیں۔ بھلا تمہارا کیا مشغلہ ہے"

"میں ہاکی کھیلتا ہوں۔۔۔" حقیقت یہ تھی کہ وہ ہاکی نہیں کھیلتا تھا، ہاکی اُسے کھیلتی تھی۔

"یہ کوئی مشغلہ نہیں، اور پھر وہاں لوگ اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ انہیں افواہیں سننے یا پھیلانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ ادھر افواہیں ہماری زندگی کے چند گنے گنائے مشغلوں میں سب سے اہم ہیں یہی ہماری محبوب ترین تفریح ہے۔ وہ لوگ کم گو ہیں۔ ان کے مرغے ایک دفعہ کاک اے ڈوڈل ڈو دو کر چپ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مرغوں کی طرح دن رات ککڑوں کوں نہیں کرتے۔ مجال ہے کہ غیر ملکی اُلّو دو تین دفعہ سے زیادہ ٹو وٹ ٹو وو کہے۔ ادھر سودیشی اُلو ہیں کہ رات بھر وہ ہاؤ ہو مچاتے ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی اور قنوطیوں کے لیے تو تنہائی بڑی ضروری ہے جب تک اپنی بیزاری اپنا رنج و غم کسی اور کے سر بھی نہ منڈھا جائے زندگی کا لطف نہیں آتا۔ اگر تم نے دو تین برس اور اسی طرح گزار دیئے تو وہ وقت مرنا یہاں بہت دور نہیں ہے۔ جب لوگ تم سے بھاگیں گے، دوست کترانے

لگیں گے۔ ملک بھر میں ہر گھر تمہارے لئے آؤٹ آف باؤنڈ قرار دیا جائے گا۔ جہاں جاؤ گے علیک سلیک کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تمہاری تشریف آوری کا مقصد کیا ہے۔ بڑھے ہو جاؤ گے تو تمہارے بھتیجے اور بھانجے تمہاری جائیداد کو بڑی محبت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے اور نہایت خلوص سے تمہارے انتقال پُر ملال کی دعائیں مانگیں گے۔"

مقصود گھوڑا بہت گھبراتا۔ آخر اسی گھبراہٹ میں اُس نے اپنی زندگی کی ٹریجڈی سنا دی جو بالکل ویسی ہی تھی جیسی اکثر زندگیوں کی ٹریجڈیاں ہوتی ہیں۔ بھلا وہ اپنی پہلی اور سچی محبت کو کیونکر بھول جاتا۔

"زندگی کی پہلی اور سچی محبت کا علاج زندگی کی دوسری سچی محبت ہے۔" خالد نے اُسے بتایا۔ آخر مقصود گھوڑے نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے رشتہ داروں کو مطلع کر دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد مقصود گھوڑے کو اس مقابلے کا سامنا کرنا پڑا جو اس ملک میں تقریباً ہر نوجوان کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے کے تین راؤنڈ ہوتے ہیں۔

پہلے راؤنڈ میں مقصود گھوڑے کی کزن آئیں۔ چچازاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بہنیں، کینے بھر کے شفقت بھرے فقرے، بزرگوں کی نصیحتیں اور الٹے سیدھے جذبات ایک دو لڑکیاں خاصی تھیں لیکن یہ راؤنڈ کنبوں کا کنبوں کے ساتھ تھا لہٰذا نہ کزنوں نے مقصود گھوڑے کی کوئی قدر کی اور نہ اس نے اُن کی۔ رحیم نے اُسے بتایا کہ ایسی شادیاں دیرپا نہیں ہوتیں۔ فریقین بہت جلد بے پروا ہو جاتے ہیں۔ لڑکے اپنے لباس حجامت اور رویے کا خیال نہیں رکھتے۔ ادھر لڑکیاں موٹی ہو جاتی ہیں۔ یہ سب درست ہوگا جب لڑکے اور لڑکیاں اقتصادی طور پہ آزاد ہو جائیں گے تب ایک دوسرے کو

جیتنے کے لیے رشتہ داری کی جگہ خوبیوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہو گی۔ مقابلہ دوہرا ہو گا اس لیے انتخاب سے پہلے اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہو گا۔ چونکہ اقتصادی آزادی میں ابھی کافی دیر ہے اس لیے مقصود گھوڑا پہلا راؤنڈ جیت گیا۔

دوسرے راؤنڈ میں دور کی رشتہ دار لڑکیاں آئیں۔ خالہ کی چچا زاد بہن کے نواسے کی چچی کی قسم کی لڑکیاں شیطان فوراً پنسل لے کر حساب لگاتے۔ جواب ہمیشہ غلط نکلتا۔ لڑکی یا تو برخوردار ہوتی یا بے حد نمبردگ۔ ایک لڑکی تو تحقیقات کے بعد پوتی نکلی۔ شیطان بولے "اس سے شادی تبھی کر سکتے ہو جب تم خود اپنے پوتے ہو۔۔۔" ادھر مقصود گھوڑے کو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ سب اُس کے والدین اور خاندان کی باتیں کیا کرتے۔ یہ راؤنڈ بھی مقصود گھوڑے کا رہا۔

تیسرے راؤنڈ میں رشتے کی فوری ضرورت کے عنوان سے اشتہار دیئے گئے جواب آئے لیکن اُن میں سے زیادہ ایسے تھے جو لڑکوں نے شرارتاً بھیجے تھے اُن میں سے کئی کو تو ہم نے پہچان بھی لیا۔ وہ اس شغل کو بطور تفریح کیا کرتے اور اسی طرح قسم قسم کی تصویریں جمع کیا کرتے۔ بقیہ خطوط پر ہمیں شبہ ہو گیا۔

"یہ جو لوگ ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ اپنے ملک میں سب کچھ ہے پیارے ایسی اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ کہاں ہیں وہ سب لڑکیاں۔۔۔" مقصود گھوڑا تیسرے راؤنڈ کی طوالت سے تنگ آ کر بولا۔

"ویسے میں کئی حسین و جمیل لڑکیوں کو جانتا ہوں"، شیطان بولے: "یہ دوسری بات ہے کہ فی الحال وہ دوسروں کی بیویاں ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"

"لیکن۔۔۔"

"جب میں ٹوک رہا ہوں مت بولا کرو … دراصل ہم نے اشتہار غلط دیئے ہیں کہ خاوند کے لئے بیوی کی ضرورت ہے۔ مقصود جیسا بیزار نفس اور صلح پسند انسان تو کسی عورت کی بیوی زیادہ اچھی طرح بن سکے گا۔"

ہم مقصود گھوڑے کو لے کر چشتی صاحب کے ہاں گئے۔ وہ قطب الدین ایبک پر خفا ہو رہے تھے کہ پولو جیسا خطرناک کھیل مارکو پولو جیسے انسان سے کیوں سیکھ لیا۔ مارکو پولو سے انہیں یہ گلہ تھا کہ بالا بالا چین کی طرف نکل گیا اور لاہور نہ آیا۔

تعارف ہوا۔ چشتی نے فرمایا کہ مقصود نامکمل سا نام ہے۔ اس کے ساتھ اور ناموں کی طرح کوئی اضافت ہونی چاہیئے۔ مثلاً زئی۔ جائے نمازی قسم کی۔

"جی یہ ایبٹی ہیں" خالد بولے۔

"ایبٹی کون لوگ ہوتے ہیں"؟

"ان کا شجرہ ارپ ارسلان سے جا ملتا ہے"

"مجھے ارپ ارسلان بالکل ناپسند ہے۔ خاص طور پر اس کی سیاسی غلطیاں اور برخوردار تم کیا کرتے ہو"؟

"جی ایم۔ اے کا آخری سال ہے"۔

"اچھا تو طالب علم ہو اور تمہارے مشاغل کیا ہیں"؟

"ہاکی کھیلتا ہوں"

"یہ کوئی مشغلہ نہیں۔ مشغلے اور ہوتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے ٹکٹ جمع کرنا، تتلیوں کے پر اکٹھے کرنا۔ میری لڑکی انجم نے طرح طرح کی تتلیاں پکڑی ہیں۔ پڑوس میں ایک بوڑھا انگریز رہتا ہے۔ وہ اپنے فرصت کے لمحات تتلیاں پکڑنے میں صرف کرتا

ہے اور اس جیسا مسرور النسان میں نے نہیں دیکھا۔ انجم نے اسے دیکھ کر تالیاں پکڑانی شروع کی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجم درجن بھر لڑکوں سے زیادہ عقلمند ہے اُسے سب کچھ میں نے سکھایا ہے۔ اپنی زندگی میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ اگر اپنی سوانح عمری لکھوں تو امریکہ والے اس کی فلم بنانے کے لئے تیار ہو جائیں اور یہ سب کچھ تقدیر سے ملا۔ یہ تقدیر ہی تھی کہ ...."

"تقدیر کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال کیجیے۔ میں اس کا قائل نہیں ...." خالد بولے۔

چشتی صاحب نے ایک لمبی تقریر کی تھی جس میں تقدیر کے معنی اس کی اہمیت اور فوائد بتائے۔

خالد نے کہا "شاید آپ کو یاد ہوگا، آپ کا ایک چھوٹی مونچھوں والا دوست آپ کے پاس خوشبوئیں لایا کرتا تھا۔ اُس نے خوشبوؤں کا نیا نیا کاروبار شروع کیا تھا وہ حوصلہ افزائی کا خواہاں تھا۔ آپ خوشبو سونگھ کر کہا کرتے کہ مجھے تو خاک پتہ نہیں چلتا۔ ایک مرتبہ آپ نے حنا درجہ خاص کے متعلق فرمایا تھا کہ شیشی سے نزلوز کی بُو آرہی ہے۔ اس نے خوشبوؤں کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ آخر اس قدر بیزار ہوا کہ کاروبار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قصور اس کی قسمت کا نہیں تھا آپ کے نزلے کا تھا جو آپ کو ہر وقت رہتا ہے اور آپ کچھ بھی نہیں سونگھ سکتے۔ پرانے زمانے میں ہماری فوجوں کے پاس مڑی ہوئی تلوار کی جگہ سیدھی یورپین تلوار ہوتی تو آج حالات مختلف ہوتے۔ مڑی ہوئی تلوار سے دشمن کو دھما دھم کوٹا جا سکتا ہے۔ سیدھی تلوار والی چستی اور پھرتی ہرگز نہیں آتی۔"

چشمی خفا ہونے لگے

"آپ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی مجھے معلوم ہے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ کا کتا بے حد زود رنج اور چڑچڑا ہے۔ بات بات پر بھونکنے لگتا ہے۔ آپ کی بلّی خود غرض اور ایذا پسند ہے۔ رات بھر دھاڑیں مار مار کر روتی ہے کتے بلیاں ایک کنبے پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کا علم شاید آپ کو نہیں۔ بالتو جانوروں کی خصلت کنبے کے افراد کے تحت الشعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک تندرست کتا، ایک خوش طبع بلّی گھر کی مسرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اسی طرح ذرا سی غلطی سے کئی زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں۔ تعجب ہے کہ ہم لوگ اس طرف ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔ ذرا اپنے کتے بلّی کو بلایئے تو سہی، میں نے مشرقِ وسطیٰ میں جانوروں کا نجوم اور قیافہ شناسی سیکھی ہے۔"

کتا بلّی لائے گئے۔ خالد نے دونوں کے پنجے دیکھے، پھر اُن کے ناموں کے الفاظ کو کاغذ پر لکھ کر حساب لگایا اور افسوس میں سر ہلا دیا۔ کتے پر زُحل کا سایہ ہے یہ شہرت کا خواہش مند ہے۔ اس گھر میں اسے شہرت نہیں ملے گی چنانچہ یہ خونخوار بن جائے گا بلّی کی قسمت کی لکیر غائب ہے۔ اس کا ستارہ گردش میں ہے۔ آپ ان دونوں کو کہیں دور بھجوا دیجئے۔ کل تک ایک تندرست کتا اور ایک ہشاش بشاش بلّی آپ کے ہاں پہنچ جائے گی پھر دیکھئے کتنا فرق پڑتا ہے۔ اور یہ بہت سی خالی بوتلیں کیسی ہیں"؟

چشمی نے مشکل سی زبان میں ایک بیماری کا نام لیا جس سے جوڑوں میں درد ہو جاتا ہے۔ "یہ بیماری مجھے پیدائش سے ہے۔ اپنے جوڑوں کو باقاعدہ استعمال نہیں کر سکتا۔ آج تک کبھی تیز نہیں چل سکا حسرت ہی رہی۔"

"مجھے بھی یہی بیماری تھی لیکن مشرقِ وسطیٰ کے ایک تیر بہدف لنخے نے اُسے غارت کردیا۔ دوائی کتّے بلّی کے ساتھ بھجوا دوں گا۔"

مقصود گھوڑے نے ایک چھوٹا سا جال خریدا اور بڑے جوش و خروش سے تتلیاں پکڑنی شروع کردیں۔ اُدھر بوڑھا انگریز نکلتا، اِدھر مقصود گھوڑا منتظر ہوتا۔ وہ آگے آگے، یہ پیچھے پیچھے۔ گھنٹوں یہی شغل رہتا۔ اکثر یہ تعاقب بے سود ثابت ہوتا۔ کبھی کبھار ایک دو تتلیاں جال میں آجاتیں تو مقصود گھوڑا سوچنے بیٹھ جاتا کہ اب ان کا کیا کروں۔

میں نے صبح صبح عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔ حبشی سرپٹ بھاگے جارہے ہیں اور پیچھے پیچھے وہی خالد کا ارسال شدہ کتّا ہے۔ مجھے دیکھ کر کتّے نے بریکیں لگائیں اور فوراً رک گیا۔ حبشی دور تک ویسے ہی بھاگتے چلے گئے۔ آواز دے کر بلایا۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا اور شکایت کی کہ یہ حادثہ آج ساتویں مرتبہ ہوا ہے۔ جونہی وہ صبح باغ کا رُخ کرتے ہیں، یہ نامعقول کتّا فوراً بھونکتا ہوا کاٹنے کو دوڑتا ہے اور دوڑ لگتی ہے۔ حتیٰ کہ کتّا تھک جاتا ہے۔ اِدھر وہ کمبخت بلّی دودھ اور بالائی کی دشمن بن گئی ہے۔ چار چار قفل لگادو لیکن وہ کسی نہ کسی طرح چٹ کرجاتی ہے۔

"اور وہ آپ کے جوڑوں کا درد ----؟"

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر بولے ۔۔۔ "اوہ! یہ تو خیال ہی نہیں رہا کہ درد کی وجہ سے چلنا پھرنا محال ہونا چاہیئے۔"

کیفے میں انجم کا مقصود گھوڑے سے تعارف کرایا گیا۔

شیطان بولے "تمہاری زلفیں عکم کے بیچے جیسی سیاہ ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی سیاہ ہیں۔"

"آپ بہت اچھے معلوم ہو رہے ہیں۔"

"تم بھی کچھ ایسی بُری نہیں لگ رہیں۔"

شیطان اور انجم اس انداز سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ آس پاس بیٹھے ہوؤں کو گھر یاد آنے لگا۔ حالانکہ بیشتر لوگ ایسے تھے کہ اگر وہ گھر میں ہوتے بھی تب بھی ایسا نظارہ میسّر نہ آتا۔

مقصود گھوڑے سے دوسری مرتبہ تعارف کرایا گیا تو اس کی کار کا بھی ذکر ہوا کار کا ذکر سنتے ہی انجم چونکیں۔

"کون سا ماڈل ہے"؟ ماڈل بتانا تھا کہ وہ مقصود گھوڑے کے ساتھ جا بیٹھیں۔

الغرض پورے ساڑھے پانچ بجے انجم، مقصود گھوڑے کی زندگی میں داخل ہوئیں

وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے کار کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ بھول گئے کہ وہاں کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ صرف مقصود گھوڑا اور انجم رہ گئے اور کار

اگلی صبح مقصود گھوڑے نے شیو کرتے وقت برش کئی مرتبہ چائے کی پیالی میں ڈبویا اور گرم پانی کا پیالہ اٹھایا۔ پھونک مار کر صابن کے جھاگ ہٹائے اور چند گھونٹ بھرے۔ اسے کئی پہر کے بھی لگے جن سے خون نکلا نہ اُسے یاد نہ رہا۔

کچھ عرصے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے انجم کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انجم نے سب کچھ سُن کر "ایضاً" کہا اور بتایا کہ انہیں بھی اس سے سو فیصدی اتفاق ہے لیکن وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اگلے روز سہ پہر کو انہیں کار کی ضرورت ہو گی

مقصود گھوڑے کی زندگی میں انقلاب آگیا!

اب اس کا روزانہ پروگرام حسبِ ذیل تھا:۔

علی الصبح اُٹھ کر تتلیاں پکڑنا، کالج سے سہ پہر کو انجم سے اظہارِ محبت کرنے کے یہ جواب لینا کہ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر سکتیں اور اگلے سہ پہر کو انہیں کار چاہیئے پھر تتلیاں پکڑنا، شام کو سوچتے رہنا کہ پکڑی ہوئی تتلیوں سے کیا سلوک کیا جائے۔

خالد نے بتایا کہ کتے نے حبشی صاحب کے جوڑوں کے درد کا مکمل علاج کر دیا ہے بلکہ بھاگ کر اب کتے کے جوڑوں میں درد شروع ہو گیا ہے۔ بلّی نے دودھ اور بالائی پی پی کر حبشی خاندان کی تین ضرورت سے زیادہ موٹی خواتین کو دُبلا کر دیا ہے۔ اب وہ تینوں قدرے خوبصورت ہو گئی ہیں۔ اُن میں انجم بھی ہے۔ حبشی صاحب کے خواب ختم ہو چکے ہیں۔ اُن کے ہاضمے کا فتور بھی رفع ہو چکا ہے۔ خالد کی بھیجی ہوئی تیر بہدف دوائی دراصل ہاضمے کا مکسچر تھا۔

لیکن خالد اور حبشی کی زبردست ڈوئیل ہوئی۔

ہم حبشی کے ہاں جانے پر مدعو تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ ان مخلص اور جاں نثار رفیقوں کو انہوں نے ایک ایک کر کے چُنا تھا۔ اپنے عزیزوں کو ایک ایک کر کے سدھایا تھا۔ اب اُن کی زندگی کا سرمایہ یہی لوگ تھے۔ قسمت دغا دے سکتی تھی مگر یہ لوگ قابلِ اعتماد تھے۔ پھر انجم کی تعریفیں ہونے لگیں۔ مقصود گھوڑے نے فوراً تتلیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ ہر روز تتلیاں پکڑتا ہے اور یہ مشغلہ اس کی زندگی میں متعدد خوشگوار تبدیلیاں لے آیا ہے مگر وہ بوڑھا انگریز تو نرا ہی بیوقوف سا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ اس عمر میں ایسا مشغلہ کتنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

"وہ بے وقوف نہیں، آرٹسٹ ہے، وہ تتلیوں کے پروں سے ڈیزائن چُن کر

انگلستان کی ایک مشہور کپڑے کی فرم کو بھیجتا ہے۔ کمپنی نے اُسے صرف اسی لئے ملازم رکھا ہے۔" خالد نے بتایا۔

"ممکن ہے یہ سب فراریت ہو۔ بھلا بوڑھوں کو رنگین چیزوں سے کیا واسطہ؟" چشتی نے محض بات شروع کرنے کے لئے کہا۔

"ہو سکتا ہے فراریت ہو۔ لیکن فراریت کہاں نہیں، مذہب، آرٹ، موسیقی سب فراریت ہے۔ ہم بھوک سے فرار ہونے کے لئے کھانا کھاتے ہیں۔ ازلی تنہائی سے فرار ہو کر دوست بناتے ہیں، شادی کرتے ہیں، جانوروں کی طرح ریوڑوں میں رہنا ہم نے اسی سلسلے میں اختیار کیا اور پھر زندگی بھی تو فرار ہے۔ اس حالت سے جو زندگی سے پہلے چھائی ہوئی تھی۔"

"زندگی کو تم فرار بتاتے ہو۔ لاحول ولا۔ زندگی تو جدوجہد ہے مستقل جدوجہد۔ یہ عمل چاہتی ہے عمل اور فرار دو متضاد چیزیں ہیں۔ میری زندگی کو لو، اس کا ایک ایک لمحہ میں نے خود ترتیب دیا ہے مجھے یقین ہے کہ میری اگلی زندگی بھی ایسی ہی اعلیٰ ہو گی۔"

"اگلی وگلی زندگی کچھ نہیں ہو گی بس یہی ایک زندگی ہے۔ موت کے بعد ہی کچھ ہو گا جو پیدائش سے پہلے تھا یعنی نامعلوم۔ آپ کو اپنی پیدائش سے پہلے کا کوئی واقعہ یاد ہے؟ آپ چشتی ہیں کیونکہ آپ اتفاق سے ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو چشتی کہلاتا تھا۔ آپ جاپانی بھی ہو سکتے تھے یا جنوبی امریکہ کے کسی ہوٹل میں ڈھول بجانے والے بھی۔"

"ایسے خیالات تو صرف دہریوں کے ہو سکتے ہیں جنہیں مذہب سے کوئی

سرد کار نہ ہو"۔ حبشی حقارت سے بولے۔

"شاید آپ نے سنا ہو گا کہ ایٹم کی نئی تھیوری کے مطابق انسان زمین کا ایک بہت بڑا حصّہ تباہ کر سکتا ہے۔ اگر یوں ہو جائے تو چاند کی کشش پر اثر پڑے گا اور چاند اس نظام سے نکل کر کسی سیارے سے ٹکرائے گا یا کسی دوسرے نظام میں شامل ہو جائیگا یعنی انسان چاہے تو نظامِ شمسی بدل سکتا ہے پھر نہ چاندنی راتیں ہوں گی اور نہ یہ چاند زدہ شاعری (آشوب حبشی بھی اسی قسم کے شاعر تھے) ممکن ہے نظامِ شمسی خود بدل جائے کیونکہ سورج بڑی تیزی سے ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ گیارہ کھرب سال تک بالکل سرد ہو جائے گا"۔

"اچھا!" حبشی کرسی سے اچھل پڑے، وہ ڈر گئے تھے "کیا کہا کتنے عرصے میں؟"

"گیارہ کھرب سال"۔

"اوہ!" وہ مسکراتے ہوئے بولے، "میں سمجھا گیارہ ارب سال"۔

"اور پھر دنیا کے سب مذہب بخشش کا وعدہ کرتے ہیں۔ ان کروڑوں انسانوں کا کیا حشر ہو گا جو مذہب سے پہلے اس دنیا میں آباد تھے یا وہ جو دنیا سے بے خبر دور دراز گوشوں میں رہتے ہیں جہاں مذہب نہیں پہنچا"۔

"لیکن تمام مذاہب کے قوانین ایک سے ہیں۔ نیکی، بدی، گناہ، سزا ہر دماغ نہیں سمجھ سکتا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ کسی کتاب میں لکھ کر پیش کیا جائے"۔ حبشی بولے۔

"مگر دنیا کے مختلف حصوں میں حالات مختلف ہیں۔ اس کے کچھ حصّے اس قدر سرد ہیں کہ وہاں پانی کی جگہ لوگ شراب پیتے ہیں۔ اگر وہ شراب نہ پئیں تو زندہ نہ رہ سکیں"۔

"شراب نوشی کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ میں نہیں مانتا، شراب کا صرف ایک

مقصد ہے۔ خواہ گرمی ہو یا سردی۔ افریقہ ہو یا روس"۔ چشتی اڑ گئے۔

"کل میں نے آپ کے فریجیڈئر میں بیئر کی بوتلیں دیکھی تھیں۔ شاید اب تک وہیں ہوں۔ لا دیجئے یہ تجربہ بھی ہو جائے"۔ پڑوس سے تین گدھے لائے گئے۔ ایک بالٹی میں بیئر اور لیمونیڈ ڈال کر YOMAHS بنائی گئی اور گدھوں کو پلائی گئی۔

ایک گدھا تو فوراً "آؤٹ" ہو گیا اور آنکھیں موند کر وہیں سو گیا۔ دوسرے نے خرمستیاں شروع کر دیں۔ نعرے لگائے، دولتیاں جھاڑیں۔ کرسیوں کو پھلانگ گیا۔ گلدستے کھا گیا۔ تیسرا گدھا خاموش تھا، وہ نیم وا آنکھوں سے خلا میں تک رہا تھا۔ کتابوں اور تصویروں کی طرف بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ آخر پیانو کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ خالد کی فرمائش پر ایک جذباتی قسم کا نغمہ بجایا گیا تو گدھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چشتی صاحب طیش میں آ گئے۔ گدھوں کو باہر نکال دیا گیا۔ وہ گرج کر بولے یہ نئی پود کس قدر گستاخ ہے۔ ہر چیز کا مذاق اڑاتی ہے۔ زندگی پر انہیں یقین نہیں، مذہب سے یہ منکر ہیں، خوابوں کے یہ قائل نہیں۔ کل کو کہدیں گے کہ روح پر بھی عقیدہ نہیں"

"آپ روح دکھا دیجئے تو یقین کر لیں گے"۔ خالد نے کہا

"روح نظر کیوں کر آ سکتی ہے"؟

"تو اس کی موجودگی ہی محسوس کرا دیجئے"۔

انہوں نے بتایا کہ پڑوس کی کوٹھی آسیب زدہ ہے۔ کبھی وہاں ایک بدنصیب عاشق کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہر رات اس کی روح نالہ و شیون کرتی ہے۔ صبح کاذب کے وقت والسی دل دوز صدائیں آتی ہیں کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں چشتی صاحب کے دائی

نزلے کی یہی وجہ ہے، وہ علی الصبح بلا ناغہ روتے ہیں۔

رات بھر ہم جاگتے رہے۔ صبح کاذب کے وقت آوازیں آنی شروع ہوئیں تو چھت سے ہوتے ہوتے دوسری کوٹھی پر پہنچے۔ یہ آواز نالہ و شیون کی ہرگز نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کسی کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ کچھ ڈر بھی لگا۔ سیڑھیاں اُتر کر دیکھتے ہیں کہ کہ ایک صاحب ہاتھ میں پانی کا گلاس لئے غرارے کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ان کا گلا ہمیشہ خراب رہتا ہے۔ علی الصبح اُٹھ کر وہ نمکین پانی کے غرارے کرتے ہیں۔ اب کچھ افاقہ ہے۔

چشتی صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ ہم لوگوں سے ہرگز بحث نہیں کریں گے "تم لوگ نہ صرف گستاخ ہو بلکہ تمہاری بے معنی گفتگو سے میرے نظریئے خراب ہو رہے ہیں!"

وہ تینوں گدھے ہر شام کو چشتی صاحب کے مکان کے سامنے آ کھڑے ہوتے بڑی مشکل سے انہیں بھگایا جاتا۔ کئی دنوں تک ایسا ہوا۔

محبت مقصود گھوڑا کر رہا تھا اور شرم ہمیں آ رہی تھی۔ انجم کے دل میں اُس کے لئے نہایت کار آمیز اور کار انگیز جذبات تھے۔ پھر بھی مقصود گھوڑے کے رومان کی رفتار غیر تسلی بخش تھی۔

انجم کے بارے میں خالد کی رائے کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ اگر وہ باذاق ہوتی تو صبح صبح کبھی کبھی ایوننگ اِن پیرس نہ لگاتی، کابل بھی تھی۔ ایک مرتبہ خالد سے ایک انار کٹوایا، چھلوایا، دانے نکلوائے، نمک چھڑکوایا، پھر جمائی لے کر بولی "اب آپ ہی اسے کھا بھی ڈالیئے۔"

خالد اور چشتی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چشتی کو خالد کے نظریوں سے نفرت تھی۔ خالد انہیں نظریوں کا فلسفہ سمجھاتے کہ فضا میں ہر قسم کی ریڈیائی لہریں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ مسرور، غمگین، وحشت انگیز، صلح آموز۔ یہ اپنی پسند ہے کہ ریڈیو کو کس طرح ٹیون کیا جائے۔ لیکن چشتی صاحب سمجھنے سے انکار کر دیتے خالد کہتے کہ اس شخص کو دیکھ دیکھ کر مجھے بنی نوع انسان سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔

کبھی کبھی شیطان کو رضیہ کی یاد ستاتی۔

"رضیہ چار سال پہلے کتنی سیدھی سادی تھی"۔ وہ کہا کرتے۔

"اور ہم چار سال پہلے کتنے سیدھے سادے تھے"۔ میں کہا کرتا۔

وہ رقیب والا پروگرام بھی التوا میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ مقصود گھوڑے کی بے قدری تھی۔ ادھر اس کا ایم۔ اے والا مسئلہ اقوام متحدہ کے مسائل کی طرح ادھورا پڑا تھا۔

وہ جمود جو مقصود گھوڑے کی زندگی سے نکلا تھا۔ شیطان کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ بعض اوقات لوگوں کو چائے پر بلایا جاتا۔ اس تقریب پر کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ اسی قسم کی ایک تقریب پر انجم اپنی چند سہیلیاں لے کر آئیں ان میں سے ایک فارسی کی سکالر تھیں۔ شیطان کو ایران سے خواہ مخواہ دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ وہ ان خاتون سے دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ ویسے وہ خود بھی ہر لڑکے میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

"اس طرح آگے آگے مت چلئے۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں آپ کی بیوی ہوں"۔ انجم نے کہا اور شیطان ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ایک سوال کر سکتا ہوں"۔

"کیجیے"

"یہ فارسی زدہ لڑکی کون ہے؟"

"کسی کی منگیتر ہے"۔

"اسے فارسی میں کہدیجئے کہ یہ دوسری منگیتروں کے لیے بڑی مثال قائم کر رہی ہے"۔

"یہ اکیلے اکیلے کیا باتیں ہو رہی ہیں"! مقصود گھوڑا لپک کر آیا۔

"کچھ نہیں، انجم کل گھڑدوڑ پر جانا چاہتی ہیں"۔ شیطان بولے

"تو پھر؟"

"میں نے کہ دیا ہے کہ یہیں دوڑ لیں گے"۔

مقصود گھوڑے نے موقع ملتے ہی اپنی مخصوص گفتگو شروع کر دی۔

"تم پان بہت کھاتی ہو۔ کہیں عادت نہ پڑ جائے"۔

"دس سال سے کھا رہی ہوں۔ اب تک تو عادت نہیں پڑی۔

"انگیٹھی پر جو تمہارا فوٹو رکھا ہے نہایت خوبصورت ہے۔ تمہاری شکل سے بالکل نہیں ملتا"۔

اس کے بعد اس نے منگنی کی انگوٹھی کا ذکر کیا۔ انجم جلدی سے بولی۔ "مجھے منگنی کی انگوٹھی بالکل پسند نہیں۔ یہ ایام جہالت کی یاد دلاتی ہے۔ پرانے زمانے میں منگنی کے بعد لڑکی کی گردن میں لوہے کا طوق پہنا دیتے تھے۔ مہذب ہونے پر صرف ایک کلائی میں ہتھکڑی پڑنے لگی۔ پھر چوڑی آئی اور اخیر میں انگوٹھی"۔

"یہ پھول لو گی؟"

انجم نے پھول سونگھے، خوشبو نہیں تھی، پھینک دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ شیطان سے کہہ رہی تھیں۔ "جیسے پھول آپ لاتے ہیں کوئی نہیں لاتا۔"

شیطان کی عادت تھی کہ رنگ برنگے ولائتی پھولوں کو حنا اور خس وغیرہ کی خوشبو میں بسا کر انجم کو دیا کرتے، جو سونگھتا حیران رہ جاتا۔

"اور جیسے خط میں لکھتا تھا ویسے کوئی لکھتا ہے؟"

شیطان کے محبت نامے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نرالے ہوا کرتے ایک مرتبہ انہوں نے ایک لڑکی کو صرف یہ لکھ کر بھیجا۔

جواب آیا۔

ایک محبت نامے کے اختتام پر انگوٹھا لگا دیا۔ دوسرے میں العبد اور گواہ شد بھی شامل کئے۔

خالد بڑے زور شور سے کتوں کی نفسیات پر بحث کر رہے تھے۔ غالباً انہوں نے کوئی غیر معمولی کتا دیکھ لیا تھا۔

"آپ نے یہ علم کہاں سیکھا؟" فارسی زدہ خاتون نے خالد کے قریب آ کر پوچھا۔

"مصر میں!"

"اہرام مصر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے" وہ اور بھی قریب آ گئیں۔

"مصر میں اب ان کی وہ وقعت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ایک دو مرتبہ پولیس نے گولی بھی چلائی۔ اس جماعت کو اب ختم ہی سمجھیے۔"

"وہاں یہ علم کس زبان میں سکھاتے ہیں۔؟"

"فارسی میں"

خالد سے کریما بہ بخشائے بر حالِ ما والے شعر کا ترجمہ کرایا گیا جسے خالد نے یوں کیا۔ کریما بہ بخشا جو تھا وہ بر حالِ ما تھا اور ہستم اسیرے جو ہے وہ کمند ہوا ہے۔

ہمیں علم تھا کہ خالد انگلستان جاتے وقت ہوائی جہاز سے گئے تھے۔ واپسی بھی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ان کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی ان خاتون کی میکسیکو کے بارے میں۔

اتنے میں اطلاع ملی کہ مقصود گھوڑا امتحان میں فیل ہو گیا۔ آہستہ دھند سی چھانے لگی۔ ہر شے میں اس خبر کی آمیزش ہوتی گئی۔ بڑا سہانا سماں تھا۔ خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ خوشگوار فیل شدہ دھوپ میں رنگین پھولوں کی خوشبوئیں مچلنے لگیں۔ ہم دیر تک وہیں بیٹھے طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم نے فیل شدہ چائے پی اور فیل شدہ حسین غروبِ آفتاب دیکھ کر لوٹے۔

چشتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مقصود گھوڑا اور جانس کلبی سے بھی زیادہ کمینہ ہے۔ خالد اور شیطان خود تو گمراہ ہو چکے ہیں دوسروں کو بھی بہکا رہے ہیں۔ چشتی اپنے بچوں کو ایسے دہشت پسندوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور محفوظ رکھنے لگے۔

مجھے کچھ دنوں کے لئے باہر جانا پڑا۔ لوٹا تو عجیب خبر سننے میں آئی۔ مقصود گھوڑے نے حیرت انگیز کارنامہ دکھایا۔ شہر بھر میں مقصود گھوڑے کا نام مشہور ہو چکا تھا۔

شہر سے باہر ایک سرخ سا پتھریلا ٹیلہ تھا جس کے چاروں طرف پانی تھا مشہور

تھا کہ کسی قدیم آبادی کا کھنڈر ہے۔ مقصود گھوڑے نے اُسی ٹیلے کو کھدوا کر ایک تاریخی شہر کے آثار برآمد کئے تھے۔ کھدائی میں طرح طرح کی چیزیں نکلیں۔ مٹی کے برتن ٹوٹے ہوئے مجسمے، منکے، زنگ آلودہ ہتھیار منکوں کے ہار، گھسے ہوئے سکے، ماہرین کا خیال تھا کہ یہ شہر حضرت عیسےٰ کی پیدائش سے پہلے آباد تھا اور ٹیکسلا کا ہمعصر تھا۔ اپنے وقت میں ایشیائی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

اخباروں میں مضامین نکلنے لگے۔ نامہ نگار مقصود گھوڑے کو ہر وقت گھیرے رکھتے مقصود گھوڑا جہاں جاتا انگلیاں اُٹھتیں۔ وہ دیکھو ملک کا مایۂ ناز سپوت جا رہا ہے جس نے ایک قدیم شہر دریافت کیا ہے۔ شیطان نے اصرار کیا کہ مقصود گھوڑے کا نام بھی کوئی ماڈرن قسم کا رکھا جائے، لوگ رات کو عبدالکریم اور قطب الدین سوتے ہیں اور صبح اے۔ کے غزنوی اور کیو۔ ڈی نجمی ہو کر اٹھتے ہیں۔ چنانچہ مقصود گھوڑے کا نام ایم جی اسپی رکھ دیا گیا۔ ہر روز طرح طرح کے دعوت نامے آتے۔ حضرت ایم۔ جی اسپی مدظلہ کو مشاعروں کا صدر بنایا جاتا۔ پبلک جلسوں میں ان سے درخواست کی جاتی کہ قدیم تہذیب پہ تقریر فرمائیں۔ ایم۔ جی۔ اسپی زندہ باد کے نعروں سے شہر گونجنے لگتا۔ اسپی سائیکل ورکس، اسپی گھی سٹور اور اسپی لانڈری کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ان سے شفاخانہ حیوانات کی افتتاحی رسم ادا کرائی گئی۔ رسالوں میں اس قسم کے مضامین نکلنے لگے۔ اسپی بطور سیاح (از خالد) خالد بطور ادیب (از رونی) رونی بطور دوست (از خالد) رونی بطور دوست (از اسپی)۔ اسپی بطور سکالر (از رونی) رونی بطور سیاح (از اسپی) خالد بطور انسان (از رونی)

چشتی صاحب کا رویہ بدل چکا تھا۔ مقصود گھوڑے کی کارپر انجم کی توجہ بھر ہونے

لگی۔ چشمی اور خالد نے نئے سرے سے بحثیں شروع کر دیں۔ چشمی قبل از مسیح زمانے کے مداح تھے۔ ان کی رائے میں وہ لوگ بہت آگے نکل چکے تھے۔ اڑن کھٹولے ہوائی جہازوں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ کچھ اونچے ہی اڑتے تھے۔ موجودہ زمانے کی ساری ایجادوں کا ذکر پرانی کتابوں میں آچکا ہے۔ ان دنوں نجات حاصل کرنے کا بہت اچھا رواج تھا جو زندگی کی الجھنوں سے تنگ آجاتا اسے حکومت کی طرف سے ساری سہولتیں میسر ہوتیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مِزوان حاصل کر لے۔

یہ مباحثے اکثر ناخوشگوار کلمات پر ختم ہوتے۔ ایک روز تو ہم خالد کو بمشکل گھسیٹ کر لائے۔ کھدائی سے جو عجیب سے اوزار برآمد ہوئے تھے چشمی کا خیال تھا کہ وہ ادویات کشید کرنے کے آلے تھے۔ خالد کہتے تھے کہ وہ بھنگ گھوٹنے کے اوزار تھے۔ چشمی نے خالد سے کہا کہ برخوردار تم وقت سے بہت پہلے دنیا میں آگئے ہو۔ خالد بولے۔ قبلہ آپ اپنے وقت کے بہت بعد تشریف لائے ہیں، دراصل آپ کا تعلق قبل از مسیح کے زمانے سے ہے۔

ان دونوں کی صلح کرانے کیلئے ایک پک نک کا پروگرام کیا گیا جس میں شکار کا پروگرام بھی تھا۔ شیطان نے دو تیتر ہلاک کئے۔ ایک بڑا سا پرندہ خالد کے سامنے سے گزرا انہوں نے توڑے دار بندوق سے نشانہ لیا اور داغ دی لیکن کچھ نہ ہوا۔ بندوق نہیں چلی۔ اتنا بڑا پرندہ یوں سامنے سے نکل جانے پر سب کو افسوس ہوا، توڑے دار بندوق کے موجد کے متعلق نہایت غیر مہذب فقرے استعمال کئے گئے۔ کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ زبردست دھماکا ہوا۔ خالد کے کندھے پر رکھی ہوئی توڑے دار بندوق خود بخود چل گئی۔ ادھر چشمی صاحب جو پیچھے پیچھے آرہے تھے دھم سے گرے سب

سمجھے کہ بندوق نے اپنا کام کر دیا۔ لیکن چشتی صاحب صرف بے ہوش ہوئے تھے۔ ہوش میں آنے پر معلوم ہوا کہ بالکل بہرے ہو چکے ہیں۔ دھماکا ان کے کان کے قریب ہوا تھا۔

انجم نے مقصود گھدرے سے متنازعہ بہار کے متعلق پوچھا تو اس نے انگلیوں پہ گنوا کر کہا ایک ماہرن، وہ تیتر اور ایک چشتی صاحب :

ڈاکٹروں نے بتایا کہ فی الحال ان کی سماعت بیکار ہو چکی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ بہرا پن عارضی ہے۔

کھدائی میں کسی پرانی زبان میں لکھے ہوئے کتبے بھی نکلے جن کا ترجمہ ایک پروفیسر سے کرایا گیا۔ ایک کتبے میں لوگوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ پہلے خوب گناہ کریں۔ پھر پچاس برس کی عمر میں توبہ کر کے عبادت شروع کر دیں۔ دنیا سے بھی واقفیت ہو جائے اور دین سے بھی۔ اسی قسم کی بہت سی مفید باتیں شبطان نے اخبار میں چھپوائیں۔ پڑھنے والوں نے اشتیاق ظاہر کیا کہ کھدائی سے جو تختیاں اور کتبے برآمد ہوں ان سب کا ترجمہ کرایا جائے۔ چنانچہ شبطان کا ایک اور ترجمہ چھپا جو کچھ یوں تھا:۔

> اس عجوبۂ روزگار شہر کی داغ بیل یونانیوں نے ڈالی اور اصلی باشندوں میں بہت جلد گھل مل گئے چنانچہ بہت جلد یونانیوں کا نام و نشان تک نہ رہا۔ اس شہر کا ماضی نہایت شاندار تھا چنانچہ باشندوں کی نگاہیں ہمیشہ ماضی کی طرف رہتیں۔ ماضی بعید کی طرف اور زیادہ سے زیادہ ماضیٔ قریب کی طرف زندگی کی مشکلات سامنے آتیں تو وہ پرانی روایتوں کے ذکر سے ان کا مقابلہ کرتے۔ نئی آبادیوں پر کھنڈروں کو ترجیح دیتے، کھنڈروں

کو دیکھ کر پرانی باتیں یاد آنے لگتیں اور دل کو کمال درجے کا سکون حاصل ہوتا۔ باشندوں کو رنج والم سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ دن رات غمگین اور بیزار رہتے، سست الوجود تھے اس لئے اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں پچیس گھنٹے سوتے رہتے۔ یہ نیند عجیب تھی، چل پھر رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں مگر خوابیدہ ہیں چونکہ جذباتی تھے اس لئے دوسروں سے خواہ مخواہ کی توقعات رکھتے۔ انسانوں سے توقعات، غیر مرئی چیزوں سے توقعات۔ کوئی ان کے لئے کچھ کر دے۔ کوئی کہیں سے آ کر کچھ دے جائے۔ جب کچھ نہ بن پڑتا تو مذہب پر اتر آتے۔ باشندوں کو دعاؤں پر اس قدر عقیدہ تھا کہ کام دام چھوڑ کر بس دعائیں مانگتے رہتے۔ بارش، آندھی، زندگی، موت، گھڑدوڑ، سٹا، ہر چیز کے لئے مختلف دعائیں تھیں اور دل کھول کر مانگی جاتی تھیں۔

یہ مضمون چھپا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ حبشی صاحب نے تو بہت ہی پسند فرمایا اور مشورہ دیا کہ شیطان اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ مزید معلومات فراہم کر کے "ٹیکسلا سے پہلے" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھیں، بہت ممکن ہے کہ انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائے۔ مشورہ معقول تھا کچھ دنوں کے بعد اسی سلسلے میں ایک اور ترجمہ چھپوایا گیا جو یوں تھا:-

آب وہوا:- خوش قسمتی سے پہاڑوں کی ترائی میں خوب بھنگ اُگی تھی لہٰذا ہوائیں بھنگ کے بخارات سے بوجھل ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ بارشوں کے ساتھ خوب مستی وقلندری برستی تھی۔

فنونِ لطیفہ :۔ قوالیاں، مشاعرے، کبڈی اور دیگر فنونِ لطیفہ زوروں پر تھے۔

صنعت و حرفت :۔ باریک ململ کی دھوتیاں، نازک صراحیاں، اعلیٰ درجے کے تہمد، دیدہ زیب چلمیں دساور کو بھیجی جاتیں تھی۔

غذا :۔ باشندوں کی خوراک نہایت صحت بخش تھی۔ غذا کا جزو سرخ مرچیں اور بناسپتی گھی تھا۔ ان دونوں میں کبھی چاول یا سبزی کی آمیزش کر دیتے کبھی گوشت کی تہمت لگا دیتے۔ خوراک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر خمار چڑھنے لگتا اور نیند آجاتی۔ جب آنکھ کھلتی تو چیخیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا۔ ان ہی مرچوں اور گھی کا اثر سیاست پر تھا۔ ان ہی کا دخل شاعری اور ادب میں تھا۔ موسیقی میں بھی یہی کار فرما تھیں۔

لباس :۔ ایسا اعلیٰ اور موزوں تھا کہ اچھا بھلا انسان پہن لے تو الف لیلےٰ کا کردار معلوم ہونے لگے۔ اس کی سب سے خصوصیت یہ تھی کہ موسم کے تغیر و تبدل سے ہرگز نہیں بچاتا تھا۔ ہر وقت کی دھوپ سے چہرہ سنولا جاتا، پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اگلی نسل میں یہ تبدیلیاں مستقل ہو جاتیں۔

تہذیب و تمدن :۔ باشندے بڑے مہذب تھے، ہر وقت باتیں کرتے رہتے گفتگو کرتے وقت دل و دماغ کے مابین سلسلۂ آمد و رفت منقطع ہو جاتا اور یہ پتہ نہ رہتا کہ کیا کہہ رہے ہیں جب باتیں کر چکتے تو پھر باتیں شروع کر دیتے۔

تمدن :۔ تمدنی لحاظ سے تین طبقے مشہور تھے :۔

پہلا طبقہ :۔ یہ لوگ موقعے کے مطابق ہر چیز کے طرفدار بھی تھے اور مخالف بھی،

ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ مخالفین کو برابر برابر چھڑوا دیا جائے۔ اپنی رائے گول مول الفاظ میں دیتے کہ کہیں کوئی خفا نہ ہو جائے۔ اس طبقے کو ابن الوقت مدرسۂ فکر بھی کہا جاتا۔

دوسرا طبقہ:۔ اس جماعت کے ممبر یا تو گھروں سے بھاگے ہوئے تھے یا وہ تھے جو مدرسے میں بار بار فیل ہوئے۔ یہ SOCKER 6 کچھ نہیں کرتے تھے کسی نے ایک دن بھی ایمانداری سے کام نہیں کیا تھا۔ چونکہ خود زندگی کے ہر شعبے میں ناکامیاب رہے۔ اس لئے دنیا بھر کے دشمن تھے۔ یہ طبقہ ایسا نظام چاہتا تھا۔ جس میں محنت مشقت دوسرے لوگ کریں اور آسائشیں ان کو میسر ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ چند ملک ایسے بھی ہیں جہاں حالات ان کی توقعات کے مطابق ہیں لیکن انہیں سیاحت کا شوق تھا نہ کبھی گھر سے باہر نہیں گئے تھے ان کی معلومات سنی سنائی باتوں یا غیر ملکی پراپیگنڈے پر مبنی ہوتیں۔ کئی مرتبہ ان سے کہا گیا کہ دنیا بھر میں کہیں ایسا معاشی نظام نہیں ہے جس میں محنت مشقت سے جی چرانے والوں کی کھپت ہو سکے۔ اگر کوئی ایسی جگہ آپ کو معلوم ہے تو آپ وہاں چلے کیوں نہیں جاتے؟ لیکن یہ جہاں تھے وہیں ڈٹے رہے۔ یہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ، لوگوں کو بتاتے کہ اگر انسان کوشش کرے تو بتیس روپے کچھ آنے ماہوار میں زندگی گزار سکتا ہے لیکن خود دن بھر زہریلے مضامین لکھتے یا قہوہ خانوں میں بحثیں کرتے۔ ان کو کسی پر اسرار طریقے سے غیبی امداد ملتی تھی۔

باشندوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے وقت انہیں کبھی احساس

تک نہ ہوتا۔ کہ دیہاتی دیہات میں رہتے ہیں، شہروں میں نہیں۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ گاؤں میں جا کر کسی کی مدد کرتا، کسی ناخواندہ کو پڑھاتا، کوئی تعمیری کام کرتا اور کچھ نہیں تو اپنے آپ کو ہی سماج کا مفید رکن بناتا۔ ان کا خیال تھا کہ سارا قصور دوسروں کا ہے۔ وہ خود فقط تماشائی ہیں اور کسی غلط ملک میں آ پھنسے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ مردوں کی پگڑیاں اور عورتوں کے دوپٹے اچھالنا تھا۔ ایک اچھالتا دوسرا اٹھا کر جمپت ہو جاتا۔

آمدِ مذہب سے پہلے یہ مذہب کے پرستار تھے۔ بعد میں دہریئے بن گئے۔

تیسرا طبقہ :- ان کو فرسودہ اور قدامت پسند گردانا جاتا، اتنی لے دے ہوئی مگر ان حضرات نے اپنے نظریئے نہیں بدلے۔ ان کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ یہ ہمیشہ الٹا گنتے تھے مثلاً چار سو قبل از مسیح سے تین سو قبل از مسیح تک۔ یہ چاہتے تھے کہ سب لوگ حضرت آدم اور اماں حوّا کی طرح زندگی بسر کیا کریں، ہر نئی چیز سے انہیں نفرت تھی۔ ہر جدید نظریئے کے یہ جانی دشمن تھے۔

ان لوگوں کی دھوپ گھڑیاں تک سست تھیں۔ وہ چلتے ہوئے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہتے اور دوسرے کے کندھے پر کمان رکھ کر تیر چلانا ان کا شغل تھا۔

معاشرتی ترقی :- متعدد شہر کھود کھود کر نکالے گئے۔ آخر ایک مرتبہ ایک

عجیب شہر برآمد ہوا۔ جس کے متعلق ماہرین آثار جدیدہ نے اندازہ لگایا کہ یہ شہر بیسویں صدی عیسوی سے تعلق رکھے گا کھدائی میں سب سے نمایاں چیز کتابیں اور رسالے تھے۔ اعلےٰ گٹ اپ، شاندار تصویریں، دلآویز سرورق، پروفیسروں نے ترجمہ شروع کیا۔ اس ادب میں نہ جانے کیا ایسی بات تھی کہ جو ترجمہ شروع کرتا اس پر وحشت سوار ہونے لگتی۔ کمرہ بند کر کے دھاڑیں مار مار کر روتا اور آخر میں خودکشی کر لیتا۔ یا کپڑے پھاڑ کر ویرانوں میں نکل جاتا۔ حکومت نے فوراً شہر پر مٹی ڈلوا کر دبوا دیا۔ ساتھ ہی احکامات جاری کرا دیئے کہ آئندہ کوئی شخص کوئی شہر کھود کر نہ نکالے۔

اس مضمون کو بھی سراہا گیا۔

چشمی صاحب کے بہرے ہو جانے سے حالات ایک حد تک بدل گئے۔ کنبے کو کچھ دنوں تشویش رہی۔ لیکن پھر صبر کر لیا گیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ان سے سب کترانے لگے۔ انہیں طرح طرح کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ بہرہ، بے بہرہ، بحرا لکاہل۔ چونکہ دوسروں کی گفتگو کا اندازہ انہیں صرف ہونٹوں کی جنبش سے ہو سکتا تھا اس لیئے لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر اس طرح ہونٹ ہلاتے کہ آواز بالکل نہ نکلتی۔ بچوں کو موسیقی کا شوق چرایا۔ ایک طبلہ بجا رہا ہے، دوسرا شہنائی، تیسرا ڈھول، ساتھ ساتھ چشمی صاحب پر فقرے کسے جا رہے ہیں۔ دوست نظر بچا کر مذاق اڑاتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں ان کا ایک بھی دوست نہیں تھا۔ کسی کے دل میں ان کی عزت تھی نہ محبت۔ ان کی زندگی کے سارے راز لوگوں پر عیاں تھے۔ آج تک جو

قابلِ اعتراض حرکتیں انہوں نے کی نہیں ان کا سب کو علم تھا اور جو حرکتیں وہ آئندہ کرنا چاہتے تھے ان کا بھی۔ بیگم چشتی ان کے اندازِ گفتگو اور باتوں کے اتار چڑھاؤ کی نقلیں اتارتیں۔ انہیں کاہل، سُست اور کام چور کہتیں، جوانی میں بھی کبھی نہیں مسکرائے جب دیکھو منہ بنا ہوا ہے اور لوگوں پر تنقید ہو رہی ہے۔ دن بھر انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے رہتے ہیں نہ جانے ابھی کتنی دیر تک یہ عذاب باقی ہے۔

خبروں کا چشتی صاحب کو بے حد شوق تھا۔ پہلے انجم سے فرمائش ہوتی کہ ریڈیو کی خبریں سن کر کسی کاغذ پر لکھ کر بتا دیا کریں۔ لیکن خبروں کے بارے میں انجم کا نظریہ مختلف تھا اگر کتا آدمی کو کاٹ لے تو خبر نہیں لیکن اگر آدمی کتے کو کاٹ کھائے تو خبر ہے نتیجہ یہ نکلتا کہ ساری خبریں سن کر وہ نفی میں سر ہلا دیتیں۔

شبعان کی ڈیوٹی لگی وہ خبریں لکھتے ضرور مگر ان میں اصلاح کرتے جاتے۔۔ ہانگ کانگ سے خبر آئی ہے کہ دس ہزار چینیوں نے سارے چین کے برتن توڑ ڈالے یوگوسلاویہ کے صدر یوگا کی مشق کر رہے ہیں۔ بقر عید کے موقع پر قربانی کی کھالوں کے لئے اپیل کرتے ہوئے قاضی قدرت اللہ صاحب نے اپنی پوستین اتار کر یتیم خانے میں دے دی۔ یونان سے خبر آئی ہے۔ کہ دو سو باشندے یونانی دواخانوں میں علاج کرانے آرہے ہیں۔

لیکن مقصود گھوڑا نہایت سعادت مند ثابت ہوا۔ وہ ہر روز چشتی صاحب کے ہاں جاتا۔ ان کے پاس دیر تک بیٹھا رہتا۔ جب ان کی برائیاں کی جاتیں اور اس کی رائے لی جاتی تو ہو سکتا ہے اور پتہ نہیں کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

مقصود گھوڑا اور انجم اکٹھے دیکھے جانے لگے۔ پھر یکلخت شبعان انجم سے بدگمان ہو گئے

مقصود گھوڑے کے رومالوں میں سُرخی لگی ہوئی اور یہ سرخی لپ سٹک کی تھی۔ اس کی میز پر ایوننگ ان پیرس کی شیشیاں نظر آنے لگیں۔ یہ خوشبو شیطان انجم کو دیا کرتے۔ شیطان نے مقصود گھوڑے کو رقیب ضرور بنایا تھا۔ صرف اس لئے کہ جو کچھ ہو سب کے سامنے ہو۔ اس لئے نہیں کہ وہ چھُپ چھُپ کر ایسی حرکتیں شروع کر دے۔ مقصود گھوڑے نے ایک کامریڈ کو ڈبل کراس کیا تھا۔ دونوں کی خوب لڑائی ہوئی۔ شیطان نے انجم سے بھی نہایت غیر شاعرانہ باتیں کیں۔ انجم نے کہا کہ مقصود گھوڑا انہیں آزاد شاعری سکھایا کرتا ہے لیکن وہ نہ مانے۔ انجم خفا ہوگئی اور اس نے تصویروں کے نیگیٹو مانگے جو شیطان نے اتاری تھیں۔ شیطان بولے نیگیٹو لے لو، پورٹیو بھی لے لو، کیمرہ بھی لادوں گا شاید اس میں کچھ لگا رہ گیا ہو، تم میری زندگی میں یوں آئیں جیسے نخلستان میں چپکے سے اونٹ آجائے۔ میں تمہیں رضیہ سے بہتر سمجھتا تھا لیکن اب پتہ چلا ہے کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بالکل ایک سی۔ فرق ہے تو اتنا کہ کچھ شلوار قمیض پہنتی ہیں اور باقی کی غرارے خیر مجھے افسوس نہیں، کچھ تمہیں تجربہ تو ہوگیا۔ وہ کیا کہا ہے۔ شیکسپیئر یا ٹینی سن نے کہ محبت کر کے بھاگ جانا محبت نہ کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ لو یہ شیشی، یہ عطر ایوننگ اِن پیرس سے بدرجہا بہتر ہے۔ اسے آخری تحفہ سمجھو، ان سہانے اور ناقابلِ فراموش لمحوں کی یاد میں جو ہم نے ایک دوسرے سے دور رہ کر گزارے؛

آخر مقصود گھوڑے کی زندگی کا سب سے اہم دن طلوع ہوا۔ چند مشہور غیر ملکی سیّاح جو پہاڑوں کی مہم کے سلسلے میں قریب سے گزر رہے تھے، مدعو کئے گئے۔ ان کے ہمراہ غیر ملکی اخباروں کے نامہ نگار بھی تھے۔

اب صرف چند ہی دنوں میں ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک نوجوان نے

بے حد قدیم شہر دریافت کیا ہے۔ ایم۔ جی۔ اسپی کا نام بچے بچے کی زبان پر ہو گا۔ بین الاقوامی شہرت مقصود گھوڑے کا انتظار کر رہی تھی

سیاحوں نے کچی اینٹوں سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کو دیکھا تنگ گلیوں کا ملاحظہ کیا۔ اینٹوں کی ساخت، طرز تعمیر اور قرب وجوار کا جائزہ لے کر بتایا کہ یہ شہر ایک زرخیز وادی میں آباد تھا۔ اور ایک عظیم شاہراہ پر واقع تھا۔ اس کی تباہی کی وجہ یا تو کوئی زلزلہ ہو سکتی ہے اور یا آتش فشاں پہاڑ کا لاوا۔ ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے کھدائی شروع ہوئی۔ ایک مٹکا نکلا، سیاحوں نے محدّب شیشے سے اس کا معائنہ کیا اور بولے کہ یہ برتن دو ہزار سال پرانا ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز ہل رہی تھی۔ مٹی نکالی گئی تو ایک عجیب وغریب شے نکلی۔ بلیک اینڈ وائٹ سگرٹوں کا ڈبہ۔ سب ایک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سکندر اعظم کے حملے سے پہلے کی ایک زنگ آلودہ صندوقچی برآمد ہوئی۔ جس میں زنگ آلودہ قفل لگا ہوا تھا۔ قفل سکندر اعظم کے حملے سے پہلے کا نہیں تھا کیونکہ اس پر میڈ ان جاپان لکھا ہوا تھا۔

اگلے روز ایک نامہ نگار نے (جو مقصود گھوڑے کا وفادار دوست تھا) اخبار میں غیر ملکی سیاحوں کے اس رویے کی مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ ان کا فرض تھا کہ مزید تحقیقات کرتے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں بھی اس قسم کے سگرٹ ہوں۔ شاید جاپان ان دنوں بھی تجارتی ملک ہو۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے شیطان کو کباڑی بازار میں اکثر دیکھا جاتا تھا اور انہوں نے مقصود گھوڑے کے مالی سے بہت پرانے برتن بھی خریدے تھے۔ شیطان نے ہمیں بتایا کہ ایسے قدیم شہر تو وہ ایشیاء میں جگہ جگہ دریافت کر سکتے ہیں۔

"ہماری موجودہ زمانے کی آبادیوں سے برتن، گھڑے اور روزمرّہ استعمال کی کچھ چیزیں لے کر زمین میں دبا دو، اور پھر کھود کھود کر نکالتے جاؤ۔ دوسرے ملکوں کے لوگ فوراً انہیں نوادرات میں شامل کر لیں گے۔ ویسے اجنبیوں کے لیئے تو مشرق کا ایسا ویسا شہر بھی آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھتا ہے"۔

پھر عجیب تماشا ہوا۔ چشمی صاحب کو کسی نے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھ لیا۔ گت پر اُن کا سر مٹک رہا تھا پھر یہ بھی دیکھا کہ جب تقریر شروع ہوئی تو انہوں نے فوراً سٹیشن بدل دیا اور فلمی ریکارڈ سننے لگے۔ اس خبر سے گھر بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ اگلے روز بیگم چشمی نے جان بوجھ کر چشمی صاحب کے پیچھے جا کر چائے کی ٹرے فرش پر پٹخ دی تو وہ اچھل پڑے۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کا عارضی بہرہ پن کبھی کا دُور ہو چکا تھا۔ انہوں نے ساری باتیں بھی سُن لی تھیں۔

ہم شام کو اُن کے ہاں گئے تو وہ کنبے سمیت چار پی رہے تھے، خاموشی طاری تھی، معلوم ہُوا وہ اپنا وصیت نامہ دوبارہ ایڈٹ کرنا چاہتے ہیں۔ بیگم نے اس سارے عمل پر نوحہ کہا اور چشمی صاحب کے لیئے درازیٔ عمر کی دُعا مانگی۔ لیکن انہوں نے بات کاٹ کر کہا کہ ایسی بد دعائیں انہیں نہیں چاہئیں۔ اب ان کی آنکھیں کھل چکی ہیں سب کچھ روشن ہو گیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی عینک بھی اُتار کر پھینک دی ہے۔ اب وہ قدرتی نظاروں میں دلچسپی لیا کریں گے۔ صبح صبح آج پہلی مرتبہ انہوں نے طلوعِ آفتاب دیکھا۔ اس قدر مسرت ہوئی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ عنقریب وہ سب کچھ تج دیں گے۔

"میں اس ماحول اور ان لوگوں میں ہرگز نہیں رہنا چاہتا میں حج کرنے چلا

جاؤں گا۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ حج میں تو ابھی بہت دن ہیں۔

"اگر دن ہیں تب بھی میں چلا جاؤں گا۔ کل میں یہاں سے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ مقصود گھوڑے سے بہت خوش ہیں (غالباً تکیہ کلام کے سلسلے میں) رخصت ہوتے وقت خالد اُن سے دیر تک مصافحہ کرتے رہے۔ اُن کا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دباتے رہے۔ ہم نے اس خاص رویے کی وجہ پوچھی۔ خالد بولے "میں نے ہاتھ دبایا تو بہت زور سے تھا لیکن کمبخت انگوٹھی اُتری ہی نہیں۔"

اگلے روز ایکسپریس ٹرین پر لوگ ہار لے کر پہنچے، معلوم ہوا چشتی صاحب اس سے پہلی پسنجر ٹرین سے جا چکے تھے۔

دفعتہً مقصود گھوڑے کو دورہ اٹھا۔ فوراً ایک سونے کی انگوٹھی خرید لایا۔ شام کو جب انجم کے کالج سے آنے کا وقت ہوا تو نکڑ پر انتظار کرنے لگا۔ کچھ بھی ہو اب انگوٹھی انجم کی انگلی میں ہو گی۔ چشتی صاحب کی یہ آخری خواہش تھی۔ عین جب انجم کی سائیکل کے آنے کا وقت ہوا تو کہیں سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ مقصود گھوڑا درختوں سے میدان کی طرف بھاگا کتنی ہی دیر موٹر سائیکل آس پاس کہیں چکر لگاتی رہی اور مقصود گھوڑا بڑے انہماک سے اس کی آواز سنتا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو دیر ہو چکی تھی۔ اب انجم کے گھر جانا بے سود تھا۔ اگلے روز پھر قسمت آزمائی کے لئے لوٹا تو ایک تار منتظر ملا۔ تار میں ماموں کی آمد کی خبر تھی۔ شیطان نے مشورہ دیا کہ فوراً تجوریاں کھول کر دیکھی جائیں۔ اگر کچھ مل گیا تو کوئی غلط سلط خبر اڑا دی جائے گی۔ خالد نے خاص غیر ملکی نسخوں سے قفل کھولے سیکھے بعد دیگرے ساری

تجوریاں دیکھی گئیں۔ سب میں کارتوس رکھے تھے۔ ہر قسم اور ہر سائز کے کارتوس۔

اگلی صبح ماموں جان تشریف لے آئے۔ شام کو مقصود گھوڑا ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھا اپنے امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ اس کی تنہائی اور اس کے رومان انگیز خیالات سب منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ وہ انگوٹھی بھی جوہری کے ہاں منتقل ہو چکی تھی۔

شیطان کے کمرے میں ہم سب رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے، خالد کہہ رہے تھے۔ "آپ لوگوں کی زندگی میں میری وجہ سے جو خوشگوار یا دوسری تبدیلیاں آئیں یا جو ابھی آئیں گی، اُن کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں، کیونکہ میں اب ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ میں اب بزنس کرنے جا رہا ہوں! ہو سکتا ہے کہ توڑے دار بندوق کا دیر میں چلنا محض اتفاق نہیں تھا! ہو سکتا ہے کہ مقصود گھوڑے کے ماموں کو کسی نے بہانہ کر کے باہر بھیج دیا ہو اور پھر قصداً واپس بلا لیا ہو۔ ممکن ہے کہ مقصود گھوڑے کے رومالوں کی سُرخی پان کی سُرخی ہو۔ کیونکہ انجم کی لپ سٹک تقریباً سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ شاید وہ عطر کی شیشیاں خود مقصود گھوڑے نے خریدی ہوں، ہو سکتا ہے کہ عین وقت پر جو موٹر سائیکل آئی اس پر کوئی دانش مند بیٹھا تھا۔ سب کچھ ہو بھی سکتا ہے۔ اور نہیں بھی ہو سکتا۔ بہر حال اب میں عنقریب بزنس مَین کہلاؤں گا۔ اب میرے سامنے ایک شاندار زندگی ہے۔ سفر کرتے ہوئے کچھ عرصے کے بعد اگر آپ کو سیکنڈ کے ڈبے میں شرعی کوٹ اور تہمد نما پتلون پہنے کوئی ایسا شخص نظر آئے جس کی شکل مجھ سے ملتی ہو جو سگرٹ کو حقّے کے انداز میں پکڑ کر کش لگاتا ہو اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتا ہو، چاء کو طشتری میں ڈال کر شوں شوں شڑپ کر کے پیتا ہو، بعد میں ڈکار لیتا ہو۔ تو اس سے ضرور ملئے۔ شاید وہ میں ہی ہوں گا۔ اگر میں ہُوا تو میری شادی بھی ہو چکی ہو گی۔ میں آپ کو زبردستی

اپنے گھر لے جاؤں گا۔ مرغیوں کے شور اور بکری کی مَیں مَیں سے واضح ہو گا کہ میں سیٹل ہو چکا ہوں۔ آپ ایک فربہ خاتون سے بھی ملیں گے جو کسی زمانے میں اپنے کالج کی حسین ترین چھریری لڑکی تھیں، فلاسفی، انگلش یا کسی اور مضمون کی ایم اے تھیں ہم آپ کو بڑی اچھی اچھی باتیں سنائیں گے۔ اپنے رشتہ داروں کی ذرا ذراسی شکایتیں مقامی سیاست، مارکیٹ کا اتار چڑھاؤ، الیکشنوں کے قصّے، اپنے بچوں کے حالات؛ یہ بچہ بیمار تھا۔ یہ بچہ دانت نکال رہا ہے اسے نیلا تھوتھا عرق گاؤزبان میں ملا کر پلاتے ہیں۔ ہم غروبِ آفتاب کی طرف بیٹھ کئے بیٹھے رہیں گے۔ چاند نکلا تو سردی کے خیال سے اندر چلے جائیں گے۔ ریڈیو لگایا تو میاں کی ملہار پر بازار کے بھاؤ کو ترجیح دیں گے اگر آپ نے ہماری زندگی پر رشک یا ترس کھایا۔ تو آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔ اسی زندگی کے لئے میں جی رہا ہوں، اسی کے لئے آپ جی رہے ہیں۔ ہم سب جی رہے ہیں فقط مجھے رَوفی کے اس مقالے اور ڈگری کا انتظار رہے گا۔ روفی تم اسے چغتی صاحب کی زبانی لکھنا۔"

شیطان نے اٹھ کر چکنے ہاتھوں سے کاغذ کا ایک پلندہ نکالا۔ "چالیس صفحے کا یہ شاندار مقالہ "ٹیکسلا سے پہلے" میں نے بڑی محنت سے چغتی صاحب کی زبانی ہی لکھا تھا اسے ڈگری کے لئے بھیجوں گا ضرور۔ اور بھیجوں گا بھی بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے"۔

"لیکن وہ اس کا عنوان۔ ٹیکسلا سے پہلے"۔

"اب اس کا عنوان۔ "ٹیکسلا کے بعد" ہو گا"۔

زنانہ اُردو خط وکتابت

شوہر کو

سرتاجِ من سلامت

کورنشات بجالا کر عرض کرتی ہوں کہ منی آرڈر ملا۔ یہ پڑھ کر کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ از حد تشویش ہے۔ لکھنے کی بات تو نہیں مگر مجھے بھی تقریباً دو ماہ سے ہر رات بدخوابی ہوتی ہے آپ کے متعلق بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ صبح کو صدقے کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اس پر کافی خرچ ہو رہا ہے۔

آپ نے پُوچھا ہے کہ میں رات کو کیا کھاتی ہوں۔ بھلا اس کا تعلق خوابوں سے کیا ہو سکتا ہے وہی معمولی کھانا۔ البتہ سوتے وقت ایک سیر کڑھا ہوا دودھ کچھ خشک میوہ اور آپ کا ارسال کردہ سوہن حلوہ۔ حلوہ اگر زیادہ دیر رکھا جائے تو خراب ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپکے بتائے ہوئے ضروری کام کے متعلق لکھدوں کہ کہیں باتوں میں یاد نہ رہے آپ نے تاکید فرمائی ہے کہ میں فوراً بیگم فرید سے مل کر مکان کی خرید کے سلسلہ میں ان کا آخری جواب آپ کو لکھ دوں۔ کل اُن سے مل گئی۔ شام کو تیار ہوئی تو ڈرائیور غائب تھا۔ یہ غفور دن بدن سُست ہوتا جارہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی بھی کمزور ہونے لگی ہے۔ اس مرتبہ آتے وقت اس کے لئے ایک اچھی سی عینک لیتے آئیں۔ گھنٹوں کے بعد آیا تو بہانے تراشنے لگا۔ کہ تین دن سے کار مرمت کے لئے گئی ہوئی ہے۔ چاروں ٹائر بیکار ہو چکے ہیں۔ ٹیوب پہلے سے چھلنی ہیں۔ یہ کار بھی جواب دیتی جارہی ہے۔ آپکے آنے پر نئی کار لیں گے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو اس کار کو منگالیں، خیر تانگہ منگایا، راستے میں ایک جلوس ملا۔ بڑا غل غپاڑہ مچا ہُوا تھا۔ ایک گھنٹے ٹریفک بند رہا۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر رحیم خاں کے صاحبزادے کی برات جارہی ہے۔ برات نہایت شاندار تھی۔ تین آدمی اور دو گھوڑے زخمی ہوئے۔

راستے میں زینب بوا مل گئیں۔ یہ ہماری دور کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ احمد چچا کے سُسرال میں جو ٹھیکدار صاحب ہیں نا اُن کی سوتیلی ماں کی سگی بھتیجی ہے۔ آپ ہمیشہ زینب بُوا اور رحمت بُوا کو ملا دیتے ہیں، رحمت بُوا میری ننھیال سے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کبھی باجی قدسیہ کو ساتھ لاکر ہمارے ہاں چند مہینے رہ جائیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ باجی قدسیہ بھی اپنے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تایا نعیم کے ساتھ ہماری شادی پر آئی تھیں۔ تایا نعیم کی ساس ان کی دادی کی مُنہ بولی بہن تھیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے دوپٹہ بدل چکی تھیں۔ یہ سب اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپکو اپنے عزیز واقارب یاد نہیں رہتے۔ کیا عرض کروں آج کل زمانہ ایسا زمانہ آگیا ہے۔ کہ رشتہ دار کو رشتہ دار کی خبر نہیں۔ میں نے زینب بُوا کو گھر آنے کے لئے کہا، وہ اُسی شام آگئیں۔ میں نے بڑی خاطر کی۔ خواہش ظاہر کرنے پر آپ کے ارسال شدہ روپوں

میں سے دو سو انہیں ادھار دے دیئے۔

ہاں تو میں بیگم فرید کے ہاں پہنچی، بڑے تپاک سے ملیں، بہت بدل چکی ہیں جوانی میں مسز فرید کہلاتی تھیں۔ اب تو بالکل رہ گئی ہیں۔ ایک تو بیچاری پہلے ہی اکہرے بدن کی ہیں۔ اس پر طرح طرح کے فکر، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتی ہیں۔ کہنے لگیں اگلے ہفتے برخوردار نعیم کا عقیقہ ہے۔ اس سے اگلی جمعرات کو نورچشمی بتول سلمہا کی رخصت ہو گی ضرور آنا۔

میں نے حامی بھر لی اور مکان کے متعلق ان سے آخری جواب مانگا۔ پہلے کی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں نہیں کرتیں۔ آواز میں بھی وہ کرارا پن نہیں رہا۔ انہیں تو یہ بتول لے کر بیٹھ گئی۔ عمر کا بھی تقاضا ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دو ڈھائی سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔ نیا جوڑا سلوانا ہو گا۔ ویسے تو ان سردیوں کے لئے سارے کپڑے نئے بنوانے پڑیں گے۔ پچھلے سال کے کپڑے اتنے تنگ ہو چکے ہیں۔ کہ بالکل نہیں آتے۔ آپ بار بار سیر اور ورزش کو کہتے ہیں۔ بھلا اس عمر میں مستانوں کی طرح سیر کرتی ہوئی اچھی لگوں گی۔ ورزش سے مجھے نفرت ہے۔ خواہ مخواہ جسم کو تھکانا۔ اور پھر پسینہ نہ آج تک کی ہے۔ نہ خدا کرائے۔ کبھی کبھی کاربین زنانہ کلب چلی جاتی ہوں۔ وہاں ہم سب بیٹھ کر نٹنگ کرتی ہیں۔ واپس آتے آتے اس قدر تکان ہو جاتی ہے کہ بس۔

آپ ہنسا کرتے ہیں کہ نٹنگ کرتے وقت عورتیں باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اس لئے کہ کسی کام میں تو نٹنگ لگی رہیں۔

آپ نے جگہ جگہ خط میں شاعری کی ہے اور الٹی سیدھی باتیں لکھی تھیں۔ ذرا سوچ تو لیا ہوتا کہ بچوں والے گھر میں خط جا رہا ہے۔ اب ہمارے وہ دن نہیں رہے کہ عشق و عاشقی کی باتیں ایک دوسرے کو لکھیں۔ شادی کو سات برس گذر چکے ہیں، خدارا ایسی باتیں آئندہ مت لکھئے توبہ توبہ اگر کوئی پڑھ لے تو کیا کہے۔

ان دنوں میں فرسٹ ایڈ سیکھنے نہیں جاتی۔ ٹریننگ کے بعد کلاس کا امتحان ہوا تھا۔ آپ سُن کر خوش ہونگے کہ میں پاس ہو گئی۔

پچھلے ہفتے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ننو کے لڑکے کو بخار ہوا۔ یُوں تپ رہا تھا کہ چنے رکھو اور بھُون لو۔ میں نے تھرمامیٹر لگایا تو نارمل تھا۔ دوبارہ لگایا تو نارمل سے بھی نیچے چلا گیا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ پھر گھڑی لے کر نبض گننے لگی۔ دفعۃً یُوں محسُوس ہُوا۔ جیسے لڑکے کا دل ٹھہر گیا ہو کیونکہ نبض رُک گئی تھی بعد میں پتہ چلا کہ دراصل گھڑی بند ہو گئی تھی۔ یہ فرسٹ ایڈ بھی یونہی ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

ڈاکٹر میری سٹوپس کی کتاب ارسال ہے۔ اگر دکاندار واپس لے لے تو لوٹا دیجئے۔ یہ باتیں ہم مشرق کے رہنے والوں کے لئے تھوڑا ہی ہیں۔ اس کی جگہ بہشتی زیور کی ساری جلدیں بجوا دیجئے۔ ایک کتاب "گھر کا حکیم" کی بڑی تعریف سنی ہے۔ یہ بھی بھیج دیجئے۔

چند نئی فلمیں دیکھیں کافی پسند آئیں۔ ہیرو کا انتخاب بہت موزوں تھا۔ موٹا تازہ لمبے لمبے بال، کھوئی کھوئی نگاہیں، کھُلے گلے کا کرتہ، گانے کا شوق۔ کسی کام کی بھی جلدی نہیں، فرصت ہی فرصت آپ بہت یاد آئے شادی سے پہلے میں آپکو اِسی رُوپ میں دیکھا کرتی تھی کاش کہ آپکے بھی لمبے لمبے بال ہوتے ہر وقت کھوئی کھوئی نگاہوں سے خلا میں تکتے رہتے، کھُلے گلے کا کرتہ پہن کر گلشن میں گانے گایا کرتے۔ نہ یہ کمبخت دفتر کا کام ہوتا اور نہ ہر وقت کی مصروفیت، لیکن خواب کب پُورے ہوئے ہیں۔

اِن فلموں میں ایک بات کھٹکتی ہے، ان میں عورتوں کی قوالی نہیں ہے۔ فلم بناتے وقت نہ جانے ایسی اہم چیز کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیت بیحد معمولی ہیں۔ مثلاً ایک گانا بھی ایسا نہیں ہے۔ جس میں راجہ جی، مورے راجہ یا ہو راجہ آتا ہو۔ یہ سادہ الفاظ گیت میں جان

ڈال دیتے ہیں۔

ایک بہت ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔ زینب بُوا نے شبہ سا ڈال دیا ہے کہ آپ کے لفافوں پر پتہ زنانہ تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے ممکن ہے کہ آپ کے دفتر میں کوئی سکریٹری یا سٹینو وغیرہ آگئی ہو اور مصروفیت کی بنا پر پتہ اس سے لکھواتے ہوں۔ یہ لڑکی کس عمر کی ہے؟ شکل وصورت میں کیسی ہے؟ غالباً کنواری ہوگی؟ اس کے متعلق مفصل طور پر لکھئے۔ اگر ہو سکے تو اس تصویر بھی بھیجئے۔

باقی سب خریت ہے اور کیا لکھوں، بس بچے ہر وقت آپ کو یاد کرتے ہیں۔ اصغر روز پوچھتا ہے کہ ابا میری سائیکل کب بھیجیں گے۔ آپ نے آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اب تو ننھی کی بسم اللہ بھی قریب آگئی ہے۔ میری مانیے تو واپس یہیں تبادلہ کرا لیجئے۔ بھاڑ میں جائے یہ ترقی اور ایسا مستقبل تھوڑی سی اور ترقی دے کر محکمے والے کہیں آپ کو اور دُور نہ بھیج دیں۔

آپ بہت یاد آتے ہیں ننھے کی جرابیں پھٹ چکی ہیں ننھی کے پاس ایک بھی نیا فراک نہیں رہا۔ بڑا ہو پردیس کا صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ امی جان کی اُونی چادر اور کمبلوں کا انتظار رہے۔

ہر وقت آپ کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں صحن کا فرش جگہ جگہ سے اُکھڑ رہا ہے۔ مالی کام نہیں کرتا۔ اس کی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

آتے وقت چند چیزیں ساتھ لائیے: بچوں کے جوتے اور گرم کوٹ، ننھے کی جرابیں اور کنٹوپ، ننھی کا فراک، دو چمڑے کے صندوق، زینب بُوا کے لئے اچھا سا تحفہ۔ بلی کے گلے میں باندھنے کے لئے ربن اور اور گتے کا خوبصورت سا کالر کچھ سوہن حلوہ اور ننھی کا سویٹر۔ ننھی کے کان میں پھنسی تھی؛ چچا جان سول سرجن بلانے کو کہتے تھے، میں نے منع کر دیا۔ کیونکہ کل تعویز آجائے گا۔

یہاں کی تازہ خبریں یہ ہیں۔ کہ پھوپھی جان کے بھینس اللہ کو پیاری ہوئی۔ سب کو بڑا افسوس ہوا۔ اچھی

بھلی تھی دیکھتے دیکھتے دم توڑ دیا۔ میں پرسہ دینے گئی تھی۔ تایا عظیم کا لڑکا کہیں بھاگ گیا ہے۔ احمد چچا کا جس بینک میں حساب تھا۔ وہ بینک فیل ہو گیا ہے۔ اور ہاں پھوپھا جان کی ساس جو اکثر بہکی بہکی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اب بالکل باؤلی ہو گئی ہیں۔ بقیہ خبریں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

سرتاج کو کنیز کا آداب۔ فقط

(ایک بات بھول گئی منی آرڈر پر مکان کا نمبر ضرور لکھا کیجئے۔ اس طرح ڈاک جلدی مل جاتی ہے)

امی جان کے نام

مری پیاری امی مری جان امی

بعد ادائے آداب کے عرض یہ ہے کہ یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے۔ اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ صورت احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت سے ہیں والا نامہ آپ کا صادر ہوا۔ دل کو از حد خوشی حاصل ہوئی۔ چچا جان کے خسر صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر دل کو از حد قلق ہوا۔ جب سے یہ خبر سنی ہے چچی جان دھاروں دھار رو رہی ہیں۔ خلیفہ جی پرسہ دینے کو پہنچے تو کسی سے اتنا نہ ہوا کہ ان کی دعوت ہی کر دیتا۔ میں نے سوچا اگر ذرا سی اڑکی ہو گئی تو خاندان بھر میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ فوراً خادمہ کو لے کر باورچی خانہ میں پہنچی، اس نے جھپاک جھپاک آٹا گوندھا۔ لیکن سالن قدرے تیز آنچ پر پک گئے۔ چنانچہ پھل پھلواری سے خلیفہ جی کی تواضع کی۔ بہت خوش ہوئے تائی صاحبہ نے خوان بھجوا کر حاتم کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی دوسرے روز ناشتہ پر بھی بلوایا۔ اوچھے کے ہوئے تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔ یہ تائی صاحبہ بھی ہمیشہ اسی طرح کرتی رہتی ہیں۔ رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہیں۔

الفت بیا آئی تھیں۔ تائی صاحبہ کا فرمانا ہے کہ یہ بچپن سے بہری ہیں۔ بہری وہری کچھ نہیں

فقط وہ سُنتی نہیں ہیں کیا مجال جو آگے سے کوئی ایک لفظ بول جائے۔

گو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن آپ کے ارشاد کے مطابق ہم سب ممانی جان سے ملنے گئے وہاں پُہنچے تو سارا کنبہ کہیں گیا ہُوا تھا۔ چنانچہ ہم چڑیا گھر دیکھنے چلے گئے۔ ایک نیا جانور آیا ہے۔ زیبرا کہلاتا ہے۔ بالکل گدھے کا سپورٹس ماڈل معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہُوا جو دیکھ لیا۔ ورنہ ممانی جان کی طعن آمیز گفتگو سننی پڑتی۔

پڑھائی خوب زوروں سے ہو رہی ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں مس سیّد آئی تھیں جنہیں حال ہی میں ولایت سے کئی ڈگریاں ملی ہیں۔ بڑی قابل عورت ہیں۔ انہوں نے "مشرقی عورت اور پردہ" پر لیکچر دیا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مس سیّد نے شنائل کا ہلکا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ قمیص پر کلیوں کے سادہ نقش اچھے لگ رہے تھے۔ گلے میں گہرا سُرخ پھول نہایت خوبصورتی سے ٹانکا گیا تھا۔ شیفون کے آبی دوپٹے کا کام مجھے بڑا پسند آیا۔ بیضوی بُوٹے جوڑوں میں کاڑھے ہوئے تھے۔ ہر دوسری قطار کلیوں کی تھی۔ ہر چوتھی قطار میں دو پھُول کے بعد ایک کلی کم ہو جاتی تھی دوپٹے کا پلّو سادہ تھا لیکن بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مس سیّد نے بھاری سینڈل کی جگہ لفٹی پہن رکھی تھی کانوں میں ایک ایک نگ کے ہلکے پھلکے آویزے تھے۔ تراشیدہ بال بڑی اُستادی سے پرم کئے ہوتے تھے۔ جب آئیں تو کوٹی کی خوشبو سے سب کچھ معطّر ہو گیا۔ لیکن مجھے ان کی شکل پسند نہیں آئی۔ ایک آنکھ دوسری سے کچھ چھوٹی ہے۔ مسکراتی ہیں تو دانت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ بنتی بہت ہیں ویسے بھی عمر رسیدہ ہیں۔ ہوں گی ہم لڑکیوں سے کم از کم پانچ سال بڑی۔ ان کا لیکچر نہایت مقبول ہوا۔

آپ یہ سُن کر پھولی نہ سمائیں گی کہ آپ کی پیاری بیٹی امور خانہ داری پر کتاب لکھ رہی ہے۔ مجھے بڑا غصّہ آتا تھا۔ جب لوگوں کو یہ کہتے سنتی تھی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں گھر کا کام کاج نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ میں نے یہ آزمودہ ترکیبیں لکھی ہیں جو ملک کے مشہور زنانہ رسالوں میں چھپیں گی۔ نمونے کے

طور پر چند ترکیبیں نقل کرتی ہوں۔

لذیذ آرنج سکواش تیار کرنا

آرنج سکواش کی بوتل لو۔ یہ دیکھ لو کہ بوتل آرنج سکواش ہی کی ہے۔ کسی اور چیز کی تو نہیں ورنہ نتائج خاطر خواہ برآمد ہونگے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مہمانوں اور گلاسوں کی تعداد ایک ہونی چاہیے۔ گلاسوں کو پہلے صابن سے دھلوا لینا اشد ضروری ہے۔ بعدازیں سکواش کو بڑی حفاظت سے گلاس میں انڈیلو اور پانی کی موزوں مقدار کا اضافہ کرو۔ مرکّب کو چمچے سے تقریباً نصف منٹ ہلاؤ نہایت رُوح افزا آرنج سکواش تیار ہوگا۔

موسم کے مطابق برف بھی استعمال کیا جاسکتا ہے (لیکن برف کو صابن سے دھلوا لینا نہایت ضروری ہے)

انڈا اُبالنا

یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر مشق ہو جائے تو ذرا مشکل نہیں لگتا۔ ایک انڈا لو (بہتر ہوگا کہ انڈا مرغی کا ہو) بیشتر اس کے کہ عمل شروع کیا جائے۔ یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ انڈا خراب تو نہیں۔ اس کا سہل اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ انڈے کو ایک کونے سے تھوڑا سا توڑ کر تسلی کر لی جائے۔ اب انڈے کو پانی میں ڈبو کر پانی اور انڈا دیگچی میں ڈالو۔ دیگچی کو چولہے پر رکھ کر گرم کرو اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد پانی میں اُنگلی ڈال کر دیکھتی رہو کہ اُبال آنا شروع ہوا ہے یا نہیں سُوں سُوں کی آواز پر آگ بجھا دو اور ہاتھ یا کسی اور چیز کی مدد سے جلدی سے انڈا دیگچی سے باہر نکال کر ٹھنڈا کر لو۔ اب انڈا بالکل تیار ہے۔ اور کھایا جا سکتا ہے۔

مزیدار فروٹ سلاد تیار کرنا

مہمانوں کے یکلخت آجانے پر ایک ملازم کو جلدی سے بازار بھیج کر کچھ بالائی اور ایک ٹین پھلوں کا منگاؤ اس کے آنے سے قبل ایک بڑی قاب کو صابن سے دھلوا لینا چاہیے۔ ورنہ بعض اوقات فروٹ سلاد میں اور طرح کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اب ٹین کھولنے کا اوزار لے کر ٹین کا ڈھکن کھولنا شروع کرو۔ اور خیال رکھو کہ کہیں انگلی نہ کٹنے پائے۔ بہتر ہوگا کہ ٹین اور اوزار نوکر کو دے دو۔ اب پھلوں کو ڈبے سے نکال کر حفاظت سے قاب میں ڈالو اور بالائی کی ہلکی ہلکی تہہ جماؤ۔ نہایت مزیدار اور مفرح فروٹ سلاد تیار ہے نوش جان کیجئے۔

میز پوش سینا۔

جس میز کے لئے پوش درکار ہو۔ اُس کا ناپ لو۔ بہتر ہوگا کہ کپڑے کو میز پر پھیلا کر لمبائی کے مطابق وہیں قینچی سے قطع کر لیا جائے۔ اب ہاتھ یا پاؤں سے چلنے والی سینے کی مشین منگاؤ سوئی میں دھاگا پرو کر میز پوش کے ایک کونے سے سلائی شروع کر دو اور سیتی چلی جاؤ۔ حتیٰ کہ وہی کونا آجائے جہاں سے بخیہ شروع کیا تھا۔ اب میز کو استعمال کے لئے تیار سمجھو اگر سیتے وقت سارے کپڑے کے دو چکر لگ جائیں تو دُگنا پائیدار میز پوش تیار ہوگا۔ ضرورت کے مطابق بعد میں کسی سے بیل بوٹے کڑھوائے جا سکتے ہیں۔

اِستری پھیرنا۔

(نوٹ: استری بڑا پرانا لفظ ہے سنسکرت میں بار بار استری کا ذکر آتا ہے)

اپنے قد سے تقریباً دو فٹ نیچی میز منگاؤ۔ استری میں دہکتے ہوئے کوئلے ڈالو اور ہاتھ پھیر کر دیکھتی رہو کہ گرم ہوگئی ہے یا نہیں جب ہاتھ پھیرنا مشکل ہو جائے۔ تو سمجھ لو کہ استری تیار ہے اور پھیری جا سکتی ہے۔ اب استری کو کپڑے پر پھیرو۔ کپڑے کی تہہ درست کرنا نہ بھولنا چاہیے۔ ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے دیتی جاؤ (کپڑے پر) جب کپڑا اکڑا ہونا شروع ہو جائے۔ تو سمجھ لو کہ مکمل استری ہوگئی۔ دوسرا کپڑا پہلے استری شدہ کپڑے پر پھیلا کر یہ عمل دہرایا جا سکتا ہے۔ جب ایک جانی پہچانی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیلنے لگے تو استری کرنا یکلخت بند کر دو۔

کپڑے ڈرائی کلین کرنا

مناسب کپڑے چُن کر ایک سمجھ دار ملازم کے ہاتھ ڈرائی کلین کی دُکان پر بھجوا دو۔ بھیجنے سے پہلے ایک فہرست ضرور تیار کر لو۔ بہتر ہوگا کہ صرف وہی کپڑے بھیجو جنہیں بعد میں پہچان سکو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کپڑے واقعی ڈرائی کلین کئے گئے۔ ایک بڑی آزمودہ ترکیب ہے کپڑوں کو سونگھ کر دیکھو، اگر پٹرول کی بُو آ رہی ہو تو سمجھ لو ٹھیک ہے۔ اب کپڑے ڈرائی کلین ہو چکے ہیں اور انہیں فوراً استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

سچ بتانا امی جان، آپ کو یہ ترکیبیں پسند آئیں؟ ایسے اور بہت سے نسخے بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ جنہیں اگلے خط میں بھیجوں گی۔

میں علی الصبح اُٹھتی ہوں۔ آپ کا ارسال شدہ ٹائم پیس اتنے زور سے بجتا ہے کہ رات کو اُسے رضائی میں لپیٹ کر ایک کونے میں رکھنا پڑتا ہے۔ عید پر جو خالہ جان نے موٹاپے کا طعنہ دیا تھا۔ اس کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہوں۔ فالتو چیزوں کا استعمال آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں، نشاستے سے پرہیز کرتی ہوں۔ کپڑوں تک میں سٹارچ نہیں لگنے دیتی۔

ایک خوشخبری دینا تو بھول ہی گئی۔ آپ کی پیاری بیٹی اس سال فارسی میں کالج میں دوئم آئی ہے۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ لونڈی کس لائق ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں کلاس میں دیر سے پہنچتی تھی پہلا گھنٹہ فارسی کا ہوتا تھا۔ اور فارسی میں صرف دو لڑکیاں تھیں بجز اور میں۔ شاید یہ اطلاع میری سہیلیوں میں سے نہیں بلکہ رشتہ داروں میں سے کسی نے پہنچائی ہو گی۔

اب خط ختم کرتی ہوں، میری طرف سے بزرگوں کی خدمت میں آداب بچوں کو بہت بہت پیار۔ ہم عمروں کو سلام علیک۔

دیکھئے وہ کون سا مبارک دن ہوتا ہے۔ کہ میں اپنی امی کو جھک کر آداب کروں اور امی جان مجھے کلیجے سے لگائیں اور سدا لگائے رکھیں۔ آمین ثم آمین! فقط

ناچیز، آپ کی بیٹی

منگیتر کو

جناب بھائی صاحب۔

آپ کا خط ملا، میں آپ کو ہرگز خط نہ لکھتی لیکن پھر خیال آیا کہ آپ کی بہن میری سہیلی ہیں اور کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ کہ کبھی ایک غیر مرد کو خط بھیجوں گی۔

اُمید کرتی ہوں کہ آئندہ خط لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ آپ ایک شریف گھرانے کی ایشیائی لڑکی سے مخاطب ہیں ۔ احتیاطاً تحریر ہے۔ میرا آپ کو خط لکھنا اس امر کا شاہد ہے کہ ہم لوگ کس قدر وسیع خیالات کے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ آپ رشیدہ اور حمیدہ کو جانتے ہیں۔ کلثوم اور رفعت سے بھی واقفیت رہ

چکی ہے۔ ثریا اور اختر کو خط لکھا کرتے تھے۔ آپ کو کلب میں ناچتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ اور ایک شام کو آپ چمکیلی سی پیلے رنگ کی چیز چھوٹے سے گلاس میں پی رہے تھے۔ اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں۔ ہمیں یہ ہوا نہیں لگی۔ نہ اس روش پر چلنے کا ارادہ ہے۔ ہمارے ہاں جہاں مذہب، شرافت اور خاندانی روایات کا خیال ملحوظ ہے۔ وہاں اعلیٰ تربیت اور بلند خیالی بھی ہے۔

میں بی۔ اے (آنرز) میں پڑھتی ہوں۔ شام کو مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے مجھے تانگے میں کالج سے نکلتے دیکھا تھا اور میں نے برقعے کا نقاب اُلٹ رکھا تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ اوّل میں ہمیشہ کالج کار میں جاتی ہوں دوسرے یہ کہ میں نقاب نہیں اُلٹا کرتی۔ ہمیشہ برقعہ میرے ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

جی ہاں مجھے ٹھوس مطالعہ کا شوق ہے۔ ابا جان کی لائبریری میں فرائیڈ۔ مارکس۔ گراؤچو مارکس ڈکنز، آگاتھا کرسٹی، کارلائل، پیٹر چینی، تھورن سمتھ اور دیگر مشہور مفکروں کی کتابیں موجود ہیں میں نے سائیکالوجی پڑھنی شروع کی۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ سب کچھ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ فلاسفی پڑھی تو محسوس ہُوا۔ جیسے یہ سب درست ہے۔ سوشل سائنس پڑھی تو لگا کہ واقعی یونہی ہونا چاہیے تھا آخر ہمیں ایک نہ ایک روز تو جدید تہذیب کے دائرے میں آنا تھا۔ زمانے کو بیسویں صدی تک بھی تو پہنچنا ہی تھا۔ میرے خیال میں میں کافی مطالعہ کر چکی ہوں۔ چنانچہ آجکل زیادہ نہیں پڑھتی۔

آپ نے پوچھا ہے کہ موجودہ ادیبوں میں مجھے کون کون پسند ہیں۔ سو ڈپٹی نذیر احمد مولانا راشد الخیری اور پنڈت رتن ناتھ سرشار میرے محبوب مصنفین ہیں۔ شاعروں میں نظیر اکبر آبادی مرغوب ہیں۔ خواتین میں ایک صاحبہ بہت پسند ہیں۔ انہوں نے صرف وہ ناول

لکھے ہیں ۔ان میں جدید اور قدیم زیورات و پارچہ جات۔ بیاہ شادی کی ساری رسوم اور طرح طرح کے کھانوں کے ذکر کو اس خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے۔ کہ ناول کہاں ہے اور یہ چیزیں کہاں؟

ایک اور خاتون ہیں جو باوجود ماڈرن ہونے کے ترقی پسند نہیں ہیں ان کے افسانے ان کی امنگیں، ان کی دنیا سب کچھ صرف اپنے گھر کی فضا اور اپنے خاوند تک محدود ہے۔ مبارک ہیں ایسی ہستیاں، ان کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا پھر پتہ چلا کہ ان کا رنگ مشکی ہے اور عینک لگاتی ہیں۔

آپ کی جن کزن کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے کلب میں دیکھا تھا۔ ذرا ان سے پوچھئے کہ وہ خود وہاں کیا کر رہی تھیں۔

یہ جن حمید صاحب کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہی تو نہیں جو گورے سے ہیں جن کے بال گھنگھریالے ہیں۔ اور داہنے ابرو پر چھوٹا سا تل ہے۔ گاتے اچھا ہیں۔ روٹھتے بہت جلد ہیں۔ جی نہیں میں انہیں نہیں جانتی۔ نہ کبھی ان سے ملی ہوں۔

میری حقیر رائے میں تو آپ نے آرٹس پڑھ کر بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کی بہن نے لکھا ہے کہ اب آپ کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اگر یہی ارادہ تھا۔ تو پھر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔ عمر میں گنجائش ہو تو ضرور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جایئے اور ملازمت کی کوشش کیجئے۔ کیونکہ ملازمت ہر صورت میں بہتر ہے۔ اس کے بغیر نہ پوزیشن ہے نہ مستقبل یہاں ڈپٹی کمشنر صاحب کی بیوی ساری زنانہ انجمنوں کی سکریٹری ہیں اور تقریباً ہر زنانے جلسے کی صدارت وہی کرتی ہیں۔ دوسرا فائدہ ملازمت کا یہ ہے کہ انگلستان یا امریکہ جانے کے بڑے موقعے ملتے ہیں۔ مجھے یہ دونوں ملک دیکھنے کا از حد شوق ہے۔

آپ نے موسیقی کا ذکر کیا ہے اور مختلف راگ راگنیوں کے متعلق میری رائے پوچھی ہے۔ جی ہاں مجھے بھی تھوڑا بہت شوق ہے۔ جے جے ونتی سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ جب دلی سے بھٹنڈہ آتے وقت میں نے جے جے ونتی ریلوے اسٹیشن کو دیکھا تو مجھے بھی پسند نہیں آیا۔ میاں کی ملہار سے آپ کی مراد غالباً خاوند کی ملہار ہے۔ جی نہیں میں نے یہ نہیں سُنی۔ ویسے ایک خاندان کے افراد بھی میاں کہلاتے ہیں۔ شاید یہ ملہار اُن کی ہو۔ آپ کا فرمانا ہے کہ ٹوڈی صبح کی چیز ہے۔ لیکن میں نے لوگوں کو صبح و شام ہر وقت ٹوڈی بچہ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے سُنا ہے۔

بھوپالی کے متعلق میں زیادہ عرض نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مجھے بھوپال جانے کا اتفاق نہیں ہُوا البتہ جوگ اور بہاگ کے بارے میں اتنا جانتی ہوں کہ جب یہ ملتے ہیں تو سوزِ عشق جاگ اُٹھتا ہے (ملاحظہ ہو "جاگ سوزِ عشق جاگ")

جی ہاں مجھے فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی ہے۔ مصوری، بُت تراشی، موسیقی، فوٹوگرافی اور کروشئے کی بہت سی کتابیں ابّا جان کی لائبریری میں رکھی ہیں۔ میں اچھی فلمیں کبھی نہیں چھوڑتی ریڈیو پر اچھا موسیقی کا پروگرام ہو تو ضرور سنتی ہوں۔ خصوصاً دوپہر کے کھانے پر۔ سیاسیات پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ اس کے متعلق اپنی رائے اگلے خط میں لکھوں گی۔

آپ کو میری سہیلی کے بھائی نے میرے متعلق باتیں بتائی ہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اسحٰق بھائی ہمارے ہاں آتے ہیں لیکن بس پندرہ بیس منٹ کے لئے۔ اشفاق بھائی اور انور بھائی ہمارے ساتھ پہاڑ پر ضرور گئے تھے۔ لیکن ان کی کوٹھی ہم سے ایک میل دُور تھی۔ پہاڑ کے دوسری طرف۔ لطیف بھائی اور کلیم بھائی فقط اپنی بہنوں کو چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ میں نے جنّت کے بھائی کے ساتھ سفر کیا۔ رحیم بھائی یونہی سٹیشن پر مل گئے تھے۔ میں چھٹیوں

پر گھر آ رہی تھی، انہیں کوئی کام تھا۔ وہ اپنے ڈبے میں بیٹھے رہے میں اپنے ڈبے میں آپ جمیل بھائی اور مسعود بھائی سے پوچھ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن مجھ سے خفا ہیں اور خط نہیں لکھتیں۔ شکایت تو الٹی مجھے ان سے ہونی چاہیے انہوں نے رفی کو وہ بات بتا دی جو میں نے انہیں بتائی تھی۔ کہ اُسے نہ بتانا۔ خیر بتانے میں تو اتنا حرج نہ تھا۔ لیکن میں نے اِن سے تاکیداً کہا تھا۔ کہ اس سے یہ نہ کہنا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ اس سے نہ کہنا۔

پتہ نہیں یہ کرن والی کون سی بات ہے۔ جس پر انہوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ رفی تک نہ پہنچے۔ مجھے تو یاد نہیں ویسے میری عادت نہیں۔ کہ دانستہ طور پر کوئی بات کسی کو بتاؤں۔ اگر بھولے میں منہ سے نکل جائے تو اور بات ہے۔

خط گھر کی بجائے کالج کے پتے پر بھیجا کیجئے۔ اور اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی زنانہ نام لکھا کیجئے۔ یوں معلوم ہو جیسے کوئی سہیلی مجھے خط لکھ رہی ہے۔

باقی سب خیریت ہے۔ فقط

آپ کی بہن کی سہیلی

(اور اس خط کا کسی سے بھی ذکر مت کیجئے تاکیداً عرض ہے)

سہیلی کو

پیاری سہیلی بنتیلی۔

اوئی دل پھر کر لیا ہے۔ ایسا بھی کیا کبھی خیر بتلا کے دو لفظ ہی بھیج دیا کرو، وہی معاملہ ہوا کہ آنکھیں ہوئیں اوٹ تو دل میں آیا کھوٹ۔

شاید تمہیں پتہ نہیں کہ ہیں پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ بُوا میرا تو وہاں بالکل دل نہیں لگا لوگ قدرتی نظارے قدرتی نظارے کی رٹ لگاتے ہیں۔ میرا تو جی ہفتے میں اچاٹ ہو گیا۔ نہ کوئی ڈھنگ کا سینما ہال، نہ اللہ ماری کوئی کام کی کپڑوں یا زیوروں کی دُکان۔ دو مہینے میں صرف آٹھ جوڑے سلوا سکی۔ اور صرف ایک جوڑی سونے کے آویزے پسند آئے۔ اس آنے جانے میں نگوڑا نیا گرم کوٹ بھی نہ سِل سکا۔ پیٹرزوں میں دہی پچھلے سال بنوایا ہُوا کوٹ پہننا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری گرمیوں میں ایک بھی نئے ڈیزائن کا جوڑا نہیں سلوا سکی۔ کسی نئی فلم میں ہیروین کے کپڑے دیکھوں تو کچھ بنواؤں بھی۔

ایک بات بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گی۔ کیونکہ نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں۔ وہ جو رشید ہے نا۔ اب تم مجھے چھیڑو گی۔ اے ہٹو۔ پہلے سُن بھی لو۔ اس کے چچا کالج میں پروفیسر بن کر آئے ہیں۔ ہوں گے کوئی پینتالیس چھیالیس برس کے، میں اگلی سیٹ پر بیٹھتی ہوں، چنانچہ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی۔ حالانکہ میں نے اِتنی سی بھی لفٹ نہیں دی سوائے اس کے میں غور سے ان کی آنکھوں کو دیکھا کرتی تھی (آنکھیں اچھی ہیں)۔ پروفیسروں کو کون غور سے نہیں دیکھتا۔ کبھی کبھار ان سے علیحدگی میں سوال پوچھ لئے تو کیا ہُوا۔ کُل تین یا چار مرتبہ اُن کے ساتھ چائے پی۔ دو بھی ان کے بلانے پر عید پر انہوں نے چھوٹے چھوٹے تحفے دیئے۔ جو ان کا دل رکھنے کے لئے قبول کرنے پڑے۔ صرف ایک دو دفعہ ان کے ساتھ پکچر دیکھی۔ بس کیا تھا۔ شاعری پہ اتر آئے۔ کہنے لگے تم اب تک کہاں تھیں میری زندگی میں پہلے کیوں نہ آئیں۔ حالانکہ ان کی زندگی کے شروع کے حصے میں تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ شکل و صورت معمولی ہے۔ گنجے بھی ہیں۔ سُنا ہے، کئیوں سے وعدہ خلافی کر چکے ہیں۔ پانچ چھ سال کے بعد بڑے بوڑھوں میں کہلائیں گے تعجب ہے

کہ اس عمر میں بھلا کوئی کیا وعدہ کر سکتا ہے۔

ناہید نے تو سب کے سامنے ان کی خبر لی۔ انہیں جھوٹا، ہٹ دھرم، مکار اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خیر سے ہاکی فٹ بال کے ریفری بھی ہیں۔ اور اس قسم کے کلمات کے عادی ہو چکے ہیں۔ دراصل ناہید بندی نے بھی آڈ ریکھا نہ تاؤ، کھٹ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالکل بلا سوچے سمجھے۔ جیسے کہ بعض لڑکیاں اکثر کرتی ہیں۔

ایک شام کو ان کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ سینما گئی۔ وہاں رشید اگلے درجے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے چچا کو کیا سوجھا کہ بھتیجے کو بلا کر پاس بٹھا لیا۔ اور مجھ سے اسطرح باتیں کرتے رہے۔ رشید کو خواہ مخواہ آگ لگ گئی۔ رشید کے چچا کی اِس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا۔ انہوں نے نہ صرف میرا مستقبل کا پروگرام تباہ کر دیا۔ بلکہ ایسی اچھی شام برباد کر کے رکھ دی۔ آج کل رشید کی مجھ سے لڑائی ہے۔ کل میں نے فون کیا تو طعنے دینے لگا۔ بولا تم بے حد خطرناک ہو۔ عجب الٹی منطق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی عورت بھی خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ مرد ہی ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ دونوں جائیں بھاڑ میں سنا ہے۔ رشید زیبو کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور اس کا چچا سلی کے پیچھے۔

زیبو تو تمہاری ہم جماعت تھی۔ بیچاری بڑی بنتی ہے۔ میں تو اُسے تب سے جانتی ہوں۔ جب اس کے متعلق چھوٹی سی افواہ تک نہیں اڑتی تھی۔ پتہ نہیں کس بات پر اتراتی ہے۔ اُجڑا اُجڑا حلیہ، دبلی پتلی اتنی کہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے دو بار دیکھنا پڑتا ہے پچھلے سال کسی سیکنڈ لفٹنٹ سے واقفیت تھی۔ اس سال بھی سنا ہے کسی اور سیکنڈ لفٹنٹ کے ساتھ سیکنڈل رہا۔ بار بار اسے سیکنڈ لفٹنٹ ہی ملتا ہے پہلا لفٹنٹ بھاگ جاتا

ہو گا کیا بتلاؤں ان دنوں اتنی بدل چکی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ پچھلے ہفتے ایک پارٹی پر ملاقات ہوئی میں نے نئے بندے اور نیا ہار پہن رکھا تھا۔ پھوٹے منہ سے ان کے بارے میں ایک لفظ نہ نکلا۔ حالانکہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اِدھر میں کئی مرتبہ جھوٹ موٹ اس کی چیزوں کی تعریف کر چکی ہوں ملمع کی ہوئی چوڑیوں کو بار بار بجاتی تھی ایسی اکل کھری ندیدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سنا ہے رشید اسے خوابوں کی ملکہ کہتا ہے۔ ضرور خوابوں میں ڈرتا ہو گا۔

بتی عزیب بائیس برس کی ہو چکی ہے۔ اور اب تک کوئی نہیں ملا۔ میں نے تو کئی مرتبہ کہا کہ گزٹ پڑھا کرو۔ آج کل ترقی ملنے پر ادھیڑ عمر کے لوگ اکثر نئی شادی کر بیٹھتے ہیں ایسے کئی مل جائیں گے۔

سُنا ہے اس کے لئے پیچھے ایک رشتہ آیا تھا۔ کسی بڑے زمیندار کا جس کے پاس دو درجن گائیں بھینسیں تھیں اور جو دس کلو دودھ ملا کر پیا کرتا تھا۔ پھر جہیز کے معاملے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔

ان صاحبزادی کو بھی پر لگ رہتے ہیں۔ کیا تو جیسے زبان تھی ہی نہیں۔ کیا اب کتر کتر چلتی ہے۔ فرماتی ہیں میں تو سُرخی اس لئے لگاتی ہوں کہ اور لڑکیوں میں نمایاں معلوم نہ ہوں۔ ایک اور فقرہ ملاحظہ ہو، کہتی ہیں — تمہارا دل کیا ہے، برف کا تودا ہے، اتنی جلدی پگھل جاتا ہے۔ یہ سب رشید کے چچا کا اثر ہے۔ مجھے ان پروفیسر صاحب پر غصہ ہے۔ تو اس بات کا کہ ساری خرافات مجھ ہی کو سُناتے رہے ابا جان سے کچھ بھی نہیں کہا جیسے کہ خاندانی لوگوں میں دستور ہے۔ گنجے ہیں تو کیا ہوا۔ مرد اکثر گنجے ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر آنکھوں کی طرف دیکھتے

رہو۔ تو صرف چالیس برس کے لگتے ہیں۔ خیر دفع کرو ان سب کو۔

بلّو کی منگنی ہونے والی ہے۔ میں نے چھیڑا کہ بلّو کا منگیتر پبلشر ہے۔ اس لئے انگوٹھی پر جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ ضرور لکھوائیں۔

عفّو کی بات پکی ہو گئی ہے، نہیں اُس نے منگیتر کو نہیں دیکھا۔ لیکن سُنو گی تو خوش ہو گی کہ چھ سو روپیہ ماہوار پاتا ہے۔ اکلوتا ہے۔ بہن بھائی کے جھنجھٹ سے پاک ہے عفّو کے والدین نے اچھی طرح یقین کر لیا ہے کہ شراب نہیں پیتا۔ اور کیا چاہیئے! اور ہاں لڑکے کی والدہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ عفّو نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ ان کا ارادہ حج کے بعد وہیں رہ جانے کا ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو۔

اچھا بہن تم اپنی سُناؤ، کیا کیا مصروفیتیں ہیں۔ تمہاری خاموشی سے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ دُور ہو تو کیا تل تل رتّی رتّی سب جانتی ہوں۔ اللہ وہ دن لائے کہ اپنی پیاری سہیلی کے ہاتھ رنگے ہوئے دیکھوں۔ خدا سہیلی دے تو ایسی جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔

حمّو تو تمہیں یاد ہو گی اس کی شادی پر ہم سب گئے تھے۔ سُنا ہے لڑکے نے اعتراض کیا کہ نہ تو رسوم ادا کی جائیں اور نہ باجا گاجا ہو۔ خاموشی سے سب کچھ ہو جائے۔ توبہ کیسا ہونق لڑکا ہو گا۔ شادی ہو رہی ہے یا کوئی چوری کر رہے ہیں۔ رسمیں ساری ہوئیں، مانجھے بٹھانا کنگنا باندھنا، مہندی لگانا، مسالا پسوانا، پانی بھروانا۔ تمہیں خوشی ہو گی کہ مہر تیس ہزار مقرر ہوا ہے۔ اور ڈیڑھ سو روپے جیب خرچ لکھا گیا ہے۔ حمّو کتنی خوش نصیب ہے۔ باقی کی رسمیں بھی ادا کی گئیں۔ چوتھی کھیلنا، دلہن کی جوتی دولہا کے کندھے پر لگانا، آرسی مصحف کرنا، دولہا کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا، دولہا کو زعفران کے بہانے مرچیں

کھلا دینا، دولہا کے جوتے چرا لینا، پھر دولہا کو اُلٹی چارپائی سے گرا دینا۔ اس کی شیروانی پلنگ سے سی دینا، میراثنوں کا بیہودہ گانے گانا۔ بڑا لطف رہا۔ دولہا بھی ایک چغد نکلا۔ جنم نہ دیکھا بوریا سپنے آئی کھاٹ، سُنا ہے کہ نکاح کے فوراً ہی بعد کہیں فرار ہو گیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈھونڈ کر لائے۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکے کیسے ہو گئے ہیں۔ یہی رسومات تو قوموں کے زندہ رہنے کی نشانیاں ہیں۔ دولہا نے مہر میں بھی مین میخ نکالی کہ بیس ہزار کا جو جہیز لڑکی کو دے رہے ہیں۔ یہ اپنے پاس رکھئے اور تیس ہزار کی رقم کو کم کر کے مہر دس ہزار کر دیجئے۔ لاحول ولا قوۃ!

شادی میں کچھ لڑکے بھی تھے۔ ہمیں چھیڑنے لگے۔ ڈانٹا تو بولے۔ سنگار کیوں کرتی ہو۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ ہم کپڑے اور زیور صرف ایک دوسری کو دکھانے کے لئے پہنتی ہیں۔ موئے لڑکوں کو اس سے کیا۔

حمو کی رخصت ہو گئی۔ خدا کرے کہ بنّے بنّی میں ہمیشہ بنی رہے۔ لیکن آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ افواہ ہے کہ اس کی ساس نندیں بڑی ظالم ہیں پر کا کوا اور رائی کا پہاڑ بنانے کو ہر دم تیار ہیں۔ پر بہن یہ مرحلہ تو ہر لڑکی کو طے کرنا ہے۔

رشید کے چچا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق ایک لطیفہ سُنا کہ رنڈوے ہیں مگر کوئی کہہ رہا تھا کہ بیوی زندہ ہے۔ خیر ہمیں اس سے کیا۔

ادی کتنا لمبا خط لکھا ہے۔ تواب خوش ہو یا اب بھی رُوٹھی رہو گی۔ خط لکھو مفصل سا ہو۔ کس کس کی نسبت ٹوٹی ہے۔ کس کس کے گھر شکر رنجی ہوئی ہو۔ یا ہونے کا امکان ہے۔ ہماری جاننے والیوں میں کوئی سُسرال سے لڑ کر آئی ہے۔ میرے متعلق کسی سے کوئی بات تو نہیں سُنی ان دنوں کس کس کے سکینڈل چل رہے ہیں۔ کوئی دنیا

مزید حماقتیں

فلمی گانا پسند آیا؟ غرارے یا جمپر کا کوئی نیا ڈیزائن — ساری باتیں مفصل لکھنا۔

اُمید ہے کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکی ہوگی۔ کبھی آکر مل ہی جاؤ صرف چالیس پچاس میل کا تو فاصلہ ہے۔ فقط۔

تمہاری دُور افتادہ سہیلی

برساتی

میں علی الصبح اُٹھا اور سامان باندھنا شروع کر دیا۔ آج میں اڈنبرا کو چھوڑ کر لندن جا رہا تھا۔ پانچ سو میل موٹر چلانا تھی۔ کار میں سامان رکھ کر پڑوسیوں سے علیک سلیک کی اور پروفیسر کے ہاں پہنچا، وہ ناشتے پر میرا منتظر تھا۔

"ایسے موقعے مجھے اداس کر دیتے ہیں۔" وہ بولا۔ "جوانی میں اپنے بچوں کو رخصت کیا کرتا تھا۔ اب بڑھاپے میں شاگردوں کو۔ ہم سکاٹ ویسے بھی جذباتی ہیں۔"

اس میز پر ہم نے کتنی مرتبہ لمبی لمبی بحثیں کی تھیں۔ دُنیا کے ہر موضوع پر۔

پروفیسر کہہ رہا تھا۔ "پینسٹھ برس کی زندگی میں کوئی تجربہ ایسا نہیں جو مجھے نہ ہوا ہو۔ لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مسرت پہنچائی وہ ہے صبح صبح چائے کی پیالی اور ایک سگریٹ۔ اس کے بعد دن بھر جو کچھ ہوتا ہے سب خرافات میں شامل ہے۔ لیکن زندگی کچھ ایسی بُری بھی نہیں، ہو سکتا تھا کہ یہ میرے والدین شادی نہ کرتے اور میرا وجود ہی دنیا میں نہ ہوتا۔ اچھا ہُوا کہ یہ تماشہ دیکھ لیا۔ میں زیادہ باتیں تو نہیں کر رہا ہوں؟۔ یہی وقت ہے

جب میں بول سکتا ہوں، میری بیوی باہر گئی ہوئی ہے۔" چلتے وقت پروفیسر نے نصیحت کی
"حدِ نگاہ کبھی محدود نہ رہے۔ ہمیشہ پہاڑیوں کے اُس پار دیکھنا۔"

میں نے شہر کا ایک چکر لگایا، پھر یونہی خیال آگیا کہ ایَن سے ملتا چلوں۔ ویسے کل اسے خدا حافظ کہہ چکا تھا۔ یونیورسٹی میں اس سے ملا، وہ بہت خوش ہوئی۔

"تمہیں ڈنبار میں اتار دوں گا۔ وہاں سے بس لے لینا۔"

ہم دونوں روانہ ہوئے۔ آبادی سے باہر نکل کر میں نے موٹر روکی اور پیچھے مڑ کر اڈنبرا کے خطِ فلکی کو دیکھا۔ نوکدار مینار، مخروطی گنبد، پہاڑیاں، جیسے قرونِ وسطی کا کوئی شہر۔

"تم تو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پھر کبھی یہاں نہ آؤ گے۔"

" آؤں گا۔ لیکن زندگی کے یہ لمحے دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

ہم دونوں خاموش تھے۔ ایَن مجھے سگریٹ سلگا کر دیتی۔ دونوں مسکراتے پھر اُداسی چھا جاتی۔

سورج نکل آیا تھا۔ سکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں پر سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا۔ کہیں کہیں heather کے سُرخ قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم سمندر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔

ڈنبار آگیا۔

"میں بیرک سے ٹرین میں چلی جاؤں گی۔"

بل کھاتی ہوئی سڑک، نشیب و فراز، سرسبز پہاڑیاں اور سمندر۔۔

بیرک آگیا۔

"اچھا بس نیوکاسل تک، وہاں میں خود تمہیں ٹرین میں بٹھا دوں گا۔"

سکاٹ لینڈ کی حدود ختم ہو چکی تھیں۔ نیلی جھیلوں اور رنگین پہاڑوں کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ رابرٹ برنز اور اس کے نغمے، اُونچے پہاڑوں کی دُھند اور شہابیوں کی دلسوز دھنیں سب پیچھے رہ گئے تھے۔

نیو کاسل آیا تو آین بھی واپس سکاٹ لینڈ چلی گئی۔

رخصت ہوتے وقت ہم بالکل خاموش تھے۔

"یہ برساتی تم نے نئی لی ہے؟"

میں نے پہنی ہوئی برساتی کو دیکھا۔ واقعی نئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید جون نے بغیر پوچھے اسے ڈرائی کلین کرا دیا۔

ٹرین چلنے لگی۔ آین کہہ رہی تھی "اپنی جرابیں مت پھینکنا۔ مرمت کے لئے مجھے بھیج دینا کام پر ناشتہ کئے بغیر کبھی مت جانا۔ لوگوں سے لڑنا مت۔"

اب میں تیزی سے لندن کی طرف جا رہا تھا۔ برساتی کی آستینوں کو دیکھا۔ پھر کالر اور پیٹی کو۔ کیا یہ وہی برساتی ہے؟ ایسی برساتیاں تو جگہ جگہ دکانوں میں ملتی ہیں۔

کچھ دُور جا کر موٹر روک لی، سامنے چشمہ بہہ رہا تھا۔ ایک پتھر پہ بیٹھ کر غور سے برساتی کو دیکھنے لگا۔ اس کے کالر پر کسی نے نام لکھا تھا۔ یہاں سُرخ نشان تھے۔ یہاں سبز دھبے۔ اس جگہ موم لگا ہوا تھا۔ اور اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ برساتی کہاں گئی جو میری رفیق تھی؟ جس سے طرح طرح کی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ دھندلی صبح میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ جب میں پہلے پہلے اڈنبرا آیا۔ گاڑی پہنچی تو ابھی اندھیرا تھا۔ میں سٹیشن کے ہوٹل میں ناشتہ کر رہا تھا۔ بیرے نے پردہ ہٹایا تو کھڑکی میں سے عجیب نظارہ دکھائی دیا۔ زمین پر دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دُھند سے فصیلیں اور بُرجیاں

ابھر رہی تھیں۔ اڈنبرا کا قلعہ پریوں کا محل معلوم ہو رہا تھا۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں اوورکوٹ خریدنے گیا۔ یہاں نوعمر طبقہ برساتی پہنتا ہے اور ادھیڑ عمر کے لوگ اوورکوٹ۔ بوڑھے برساتی اوورکوٹ اور چھتری تینوں استعمال کرتے ہیں۔ ایک سبز رنگ کی برساتی پہ میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ اسے پہنا، پیٹی کو کس کر آئینے میں دیکھا تو خوب چُست نظر آنے لگا۔ فوراً اوورکوٹ کا ارادہ ترک کر دیا اور برساتی خرید لی۔

اور وہ دن جب ایَن سے ملاقات ہوئی، اس مغرور لڑکی کو میں نے کئی مرتبہ یونیورسٹی میں دیکھا تھا ہمیشہ اکیلی ہوتی، سب سے الگ تھلگ، پاس سے گزرتے وقت ہم دونوں منہ پھیر لیتے۔

یونیورسٹی کے Rector کا انتخاب ہو رہا تھا۔ امیدوار کئی تھے لیکن اصل مقابلہ سرالگزینڈر فلیمنگ اور آغا خان کے درمیان تھا۔ سب کو یقین تھا کہ آغا خان یہ دوڑ ضرور جیت جائیں گے لیکن بالکل ذرا سے فرق سے فلیمنگ منتخب ہو گئے۔

دوپہر کو اُن کا ایڈریس تھا۔ اڈنبرا کی پُرانی رسم ہے کہ ریکٹر کی تقریر کو صرف ایک شخص سُنتا ہے۔ خود ریکٹر۔

بڑے ہال میں خوب ہنگامہ مچا، ہم قسم قسم کی چیزیں لے کر پہنچے، سیٹیاں، ڈھول، باجے بگلیں، کبوتر، رسّے، چھتریاں۔

لیکچر شروع ہُوا تو کئی طلبا نے چھتریاں لگائیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ اس گیلری سے رسّہ پھینکا گیا جسے دوسری طرف باندھ دیا گیا۔ ایک لڑکا اس سے لٹک کر ہال عبور کرنے لگا۔

ڈھول بجے، کبوتر چھوڑ دیئے گئے، باہر نکلنے کا راستہ نہ ملا۔ اس لئے وہ اندر ہی اُڑتے رہے۔ میں نے ایک بطخ چھوڑی جو سیدھی ایک لڑکی کے سر پہ جا بیٹھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایَن تھی۔

فلیمنگ کہہ رہے تھے۔ "پنسلین کے پہلے تجربے کتوں اور بھیڑوں پر کئے گئے۔
بھوں، بھوں، بھوں۔ دیر تک ہال میں بھونکنے اور بھین بھین کی آوازیں آتی رہیں۔
میرے سر پر ایک پیاخا پھٹا۔ اسے ایّن نے پھینکا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے بطخ مانگ
کر ایّن کے سر پر رکھ دی۔

فلیمنگ کی آواز آئی۔ "لوئی پاسچر نے اپنی ساری عمر جراثیم کے پیچھے گزار دی۔"

نعرے لگنے لگے۔ "سبحان اللہ کیا زندگی تھی کہ جراثیم کے پیچھے گزری۔"

ایّن نے پھر ایک پٹاخا پھینکا، میں نے فوراً ایک بطخ اس کے سر پر رکھ دی۔

فلیمنگ نے الکحل کی تخمیر کا ذکر کیا تو جیسے حاضرین کو نشہ چڑھ گیا۔ وہیں لوٹنے لگے۔ ایک
صاحب بیہوش ہو گئے۔ انہیں سٹریچر پہ لٹایا گیا۔ دروازے کے قریب چھلانگ مار کر اٹھے
اور واپس آ بیٹھے۔

یہ ہنگامہ ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ پورچ میں ایّن ایک بڑا سا اشتہار پڑھ رہی ہے۔
شام کو نئے ریکٹر کے اعزاز میں رقص ہو رہا تھا۔

"کیا ارادہ ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ضرور چلوں گی۔"

رات کو ہم رقص پر گئے۔ میرے پروفیسر نے مجھے فلیمنگ سے ملایا۔ پُرشفقت چہرہ،
سفید بال، ہاتوں میں بھولاپن۔ یہ وہی عظیم شخص ہے، بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن
جتنی جانیں اس نے بچائی ہیں، آج تک کسی نے نہیں بچائیں۔

سکاٹش دھنوں پر رقص ہوتا رہا۔ آخر میں سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر Auld
Lang Syne گایا۔ باہر نکلنے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایّن نے شام کا ہلکا پھلکا سا

لباس پہن رکھا تھا۔ بڑی سخت سردی تھی۔ میں نے برساتی اُتار کر اسے پہنا دی۔

آسمان پہ نامعلوم سی روشنی تھی اور چاروں طرف سنّاٹا۔ مخروطی بُرجیاں اور نکیلے مینار تاروں کو چھو رہے تھے۔ مجھے یہ گلیاں بہت مانوس سی معلوم ہوئیں۔ رات کے اندھیرے میں سب بستیاں ایک سی لگتی ہیں۔

پھر یونیورسٹی کے طلباء نے قندیلوں کا جلوس نکالا۔ ایّن اور میں ہزاروں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بڑی بڑی قندیلیں لئے قلعے سے روانہ ہوئے۔ اندھیری رات تھی۔ سڑکیں خالی تھیں، نیچے اُترتی ہوئی سڑک کے دونوں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔ قندیلوں سے موم پگھل پگھل کر برساتی پر گرتا رہا اور نشان پڑتے رہے۔

مگر اب نہ یہ نشان ہیں نہ دوسرے، سب دُھل چکا ہے۔ اس سے اب وہ خوشبو بھی نہیں آرہی جو ایّن کو پسند تھی۔ اور میں لندن جا رہا ہوں۔ اس شہر کی مشینی زندگی سے مجھے وحشت ہوتی ہے، پندرہ میل اس طرف نکل جاؤ، دس میل مخالف سمت میں چلے جاؤ لندن ختم ہی نہیں ہوتا۔ جہاں شراب خانوں میں محبوبہ کو سامنے بٹھا کر لوگ فٹ بال، غیر ملکی پالیسی، بزنس کتوں اور گھوڑدوڑ کی باتیں کرتے ہیں۔ کل سے پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ لندن میں دھواں ہوگا۔ دھند ہوگی اور ہر وقت کی بارش لیکچروں اور امتحانوں کے چکر سے مدتوں نجات نہیں ملے گی۔ کل سے زندگی جامد ہو جائے گی۔ ایک سپاٹ چار دیواری میں بند ہو جائے گا۔

اس جمود سے میں پہلے بھی کئی بار آشنا ہوا تھا۔ ایسے گھٹے گھٹے سکون سے سب سیاح آشنا ہوتے ہیں۔ جب قدم بوجھل ہو کر زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ شاہراہوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نظر بندی اب کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ گھٹا کبھی نہ چھٹے گی۔

میں نے پھر برساتی کو دیکھا۔ یہ وہ تو نہیں جو ان اجنبی آسمانوں اور ان جانے خطوں میں میری رفیق تھی۔ جس کے قرب میں طرح طرح کے پیغام تھے۔ نئے نئے ملک چمکتی ہوئی سڑک اور آزادی۔!

اس کالر کے نیچے ہسپانوی سینوریتا کے سرخ ہونٹوں کے نشان تھے۔

ایک دھند سی چھاگئی، چشمے کا شور دھیما ہوتا گیا، دھوپ پھیکی پڑتی گئی۔ وہ سب نقوش ذہن میں ابھرنے لگے۔ میں اور میرا دوست رودبار انگلستان عبور کر رہے ہیں۔ ہم ہسپانیہ جائیں گے۔ میں اب وہ شرارتی اور بے چین لڑکا تھا۔ جس نے سکول سے بھاگ کر ایک باغ میں واشنگٹن ارونگ کی کتاب الحمرا کی کہانیاں، پڑھی تھی، جسے اندلس نے مسحور کر دیا۔ جس کے خوابوں میں وہ سہانی فضائیں بس گئیں۔

رودبار انگلستان کو عبور کر کے ہم پیرس پہنچتے ہیں۔ فرانسیسی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن یہ الفاظ بار بار سننے میں آتے ہیں۔ شوں دا شیں، فوں فاں، ساں سیں۔

رات کے کھانے کا بل آتا ہے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ دو ہزار کچھ سو فرانک!

دو تین ایسے کھانے اور رہے تو ساری سیر یہیں ختم ہے لیکن حساب لگاتے ہیں۔ تو کل ڈھائی پونڈ بنتے ہیں۔ بڑی فرصت ہوتی ہے۔

صبح اٹھ کر میں ڈائری دیکھتا ہوں، آج کے ضروری کام یہ ہیں۔

۱۔ حجامت

۲۔ کالر کا بٹن

۳۔ صابن

۴- نپولین کا مقبرہ

۵- سوماں

۶- ورسیلز کے محلات

چنانچہ سیدھے حجام کے ہاں پہنچتے ہیں، دکان پر لکھا ہے۔

"یہاں حجامت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔

اور انگریزی بولی جاتی ہے۔"

یوں تو سب حجّام باتونی ہوتے ہیں لیکن فرانسیسی حجّام کی باتیں سُن کر اخبار خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آدھ گھنٹے میں صرف وہ ایک کام کی بات کرتا ہے۔ "جرمن بہت بڑے پڑوسی ہیں۔ جب کبھی یورپ میں جنگ ہوتی ہے تو اکھاڑے کے لئے ہمارا ملک چنا جاتا ہے۔ لڑتے دوسرے ہیں لیکن دیکھا دیکھی ہمیں بھی شریک ہونا پڑتا ہے۔ جب جنگ ختم ہوتی ہے تو جیتتا کوئی اور ہے۔ آپ کے سر میں مالش کروں؟"

نپولین کا مقبرہ جہانگیر کے مقبرے سے ملتا جُلتا ہے۔ زبردست ہجوم ہے۔ شور مچا ہُوا ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں، اونگھ رہے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں سودا بیچ رہے ہیں۔ لیکن مقبرے سے کسی کو دلچسپی نہیں، اور نہ غالباً نپولین سے۔

دوپہر کو دو ہزار ایک سو کچھ فرانک کا لنچ کھا کر ورسیلز کے محلات دیکھتے ہیں، یہ جگہ ایک بہت بڑا ہوٹل معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں لوئی چہاردہم یاد آجاتا ہے جو اس عمارت میں ستر برس رہا۔ آخری دنوں میں کافی سٹھیا گیا تھا۔ ہسپانیہ سے جنگ کا اعلان کرتے وقت اس نے یہیں وہ شیخ چلیانہ فقرہ کہا تھا۔ "اب ہسپانیہ اور ہمارے درمیان کوئی پیرا نیز حائل نہیں رہے۔" تیرہ برس تک لڑائی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرف

کے سپاہیوں کی عمروں میں تیرہ برس کا اضافہ ہو گیا۔ انگریز پہاڑوں میں رہے جہاں ہمیشہ سے تھے۔ بلکہ آج کل بھی وہیں ہیں۔

پیرس کو غور سے دیکھا تو فرانسیسیوں کی رومان پسندی کے قصے بے بنیاد معلوم ہوئے یہ لوگ اکثر جوڑوں میں باہر نکلتے ہیں لیکن آپس میں کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے سے کچھ بیزار سے معلوم ہوتے ہیں۔ بچوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ یا تو یہ لوگ شادیاں نہیں کرتے یا سخت قسم کے فلاسفر ہیں۔ عورتیں چھوٹے قد کی ہیں۔ چہرے پر میک اپ اس قدر ہوتا ہے کہ بجائے خدوخال کے صرف میک اپ کے فرق سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ وہی ہے یا کوئی اور۔ وہ سب رنگ رلیاں جنہیں فرانس سے منسوب کیا جاتا ہے شاید انقلاب فرانس سے پہلے ہوتی ہوں گی۔ ان دنوں یہ لوگ کسی پیچیدہ مسئلے پر ہر وقت غور کرتے رہتے ہیں۔

جب ہم پیرس کا مشہور عریاں رقص دیکھنے جا رہے تھے تو مجھے جوئیا کا فقرہ بار بار یاد آ رہا تھا۔ کہ بھلا ڈاکٹروں کو عریاں رقص سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ جوئیا سچ کہتی تھی۔ لیکن ہمیں محض روایتاً جانا پڑا۔ جیسے مشرق سے ہر آنے والے کے متعلق اہل یورپ کو یقین ہوتا ہے کہ اگر یہ شخص تاج محل میں باقاعدہ رہا نہیں تو اس نے دیکھا ضرور ہو گا اسی طرح یورپ سے آنے والوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ انہوں نے پیرس کے وہ ناچ ضرور دیکھے ہوں گے۔

سٹیج پر لڑکیوں کو دیکھتے ہی بوڑھے دوربینیں نکالتے، یہ دوربینیں کرائے پر ملتی ہیں۔ لیکن صرف مردوں کو۔

پیرس سے روانہ ہوئے جون آف آرک کے گاؤں سے ہوتے ہوئے تورز پہنچے

دریا کو عبور کر کے اس میدان کو دیکھا جہاں آٹھویں صدی میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔ عرب فرانس فتح کرتے ہوئے پیرس سے صرف ۷۰ میل رہ گئے تھے۔ یہ لڑائی دنیا کی اہم ترین لڑائیوں میں سے تھی۔ عربوں کی شکست نے یورپ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

سان سبستیان پر ہسپانوی سرحد عبور کر کے سمندر کے کنارے رات بسر کی اگلے دن برگوس کے ایک ہوٹل میں کھانے کا انتظار کر رہے تھے کہ یکلخت پچاس ساٹھ خواتین و حضرات ساتھ آ بیٹھے۔ کسی کی شادی خانہ آبادی ہو رہی تھی۔ ہمیں بھی براتیوں میں شریک کر لیا گیا۔

ہر ہسپانوی آدھا بل فائیٹر ہوتا ہے اور آدھا کواکزاٹ۔ فرانسیسی انعام لئے بغیر نہ ٹلے گا۔ لیکن ہسپانوی رقم لے کر منہ بنائے گا۔ اسے مٹھائی یا سگریٹ دو تو خوشی سے قبول کر لے گا کہ اُسے ہم رتبہ سمجھ کر تحفہ دیا گیا ہے۔

راستے میں موٹر کھڑی دیکھ کر ایک بیل گاڑی والا رُک گیا کہ کسی مدد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھوں اور گندمی رنگت والے ہسپانوی ہمیں اجنبی نہ سمجھتے، بلکہ کئی بار ایسا ہوا کہ خود ان لوگوں نے ہم سے راستہ پوچھا۔

گاؤں میں کھانے کے لئے رُکتے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہمیں زبان نہیں آتی، دکاندار ہمیں باورچی خانے میں لے جاتا۔ گوشت، مچھلی، سبزیاں، انڈے۔ ہم اشارہ کرتے اور وہ جلدی سے پکا دیتا۔

سیدھے سادے شریف لوگ، غریب، مہمان نواز، سفیدی کئے ہوئے گھر جو دھوپ میں چمکتے ہیں۔ مکانوں کے دریچے اتنے کشادہ اور سجے ہوئے کہ خواہ مخواہ اندر جھانکنے کو جی چاہتا ہے۔

میڈرڈ کی شاندار سنگِ مرمر کی بنی ہوئی عمارتوں، بڑی بڑی جھیلوں اور وسیع باغات کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہاں خانہ جنگی ہوئی تھی۔ مشہور آرٹ گیلری پرادو میں ہم نے پورا دن صرف کیا۔ ٹیشان، وان ڈیک، ال گریکو، روبنز، رافیل، گویا، ماریلو اور دوسرے فن کاروں کی تصویروں پر ہسپانوی فخر کرتے ہیں اور بر فخر بجا ہے۔

صبح صبح فرانکو کا مراقش باڈی گارڈ گلیوں سے گزر رہا تھا۔ خوبصورت وجیہہ شہسوار قدیم عربی یونیفارم۔ انہوں نے کئی مرتبہ فرانکو کی جان بچائی۔ ملکی خانہ جنگی میں فرانکو کی فتح مراقش کے قبیلوں کی مرہونِ منت تھی۔

ہسپانوی موسیقی کی اداس دھنیں سُن کر مجھے بدوؤں کے قافلے یاد آگئے۔ جنہیں میں نے صحراؤں میں دیکھا تھا۔ بدوؤں کا مقولہ ہے کہ آبادیوں میں صرف بزدل رہتے ہیں۔ بدو بستیوں میں محض اس لئے آتے ہیں کہ اگلے سفر کی تیاری کر سکیں۔ خیمے کے گرد گھاس اُگنے سے پہلے وہ کوچ کر جاتے ہیں۔

خانہ بدوشی عربوں کی تاریخ کا اہم جزو رہی ہے۔ نہایت المناک جزو۔

ہوٹل کی چھوٹی سی دکان میں صندلی رنگت اور سیاہ بالوں والی حسینہ نظر آتی۔ خواہ مخواہ اس سے پوچھنے کو جی چاہتا کہ آج تاریخ کیا ہے؟ اس وقت کیا بجا ہے؟ باہر کیسا موسم ہے؟

میرے دوست نے اس سے آویزے خریدے اور انہیں پہننے کے سلسلے میں ترکیب استعمال دریافت کی۔ اس نے مسکرا کر اپنا ایک آویزہ اتارا اور یہ نیا آویزہ پہن کر چہرہ ہمارے سامنے کر دیا۔

میرے دوست نے نعرہ لگایا۔ "بونو"۔ (یہ لفظ نیا نیا سیکھا تھا)

اس کی رنگت گلابی ہو گئی۔ شرما کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ بونو کے یہاں وہی معنے ہیں جو ہمارے ہاں 'اُف مار ڈالا' کے ہیں۔ لیکن حیرت ہوئی کہ مغربی ممالک میں لڑکیاں شرماتی بھی ہیں۔

اُندلس تخیل سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اندلس کے سحر کو کوئی چیز اتنی اچھی طرح واضح نہیں کرتی جتنا کہ وہاں کا حُسن۔

اُندلسی عورتیں پھُولوں سے زیادہ حسین ہیں، ان کی ہر ادا میں عجیب شانِ دلربائی ہے پُرتمکین، قابلِ ستائش، گہری جھیلوں سے زیادہ گمبھیر، خاموش، جیسے کوئی رازسدا ان کی پُراسرار اور سرکش روح میں پوشیدہ رہتا ہے۔ ایسا بیش بہا بھید جسے عاشق یا خاوند تک نہیں پا سکتے۔ سادگی ایسی کہ ان کی موجودگی میں ان کا قرب تک محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن بعد میں رواں رواں کسی آتشیں جذبے سے مغلوب ہو جاتا ہے جب یہ محبت کرتی ہیں تو محبوب کو اپنی شدید چاہت اور لا اُبالی پن سے متحیّر کر دیتی ہیں۔ لیکن انُہیں کبھی دکھاوے کی محبت نہیں ہوتی۔

غرناطہ ایک وسیع وادی میں پھیلا ہُوا ہے، پہاڑیوں پر الحمراء کا قصر اور جنت العریف کے باغات ہیں۔ ایک طرف نیچی پہاڑیوں پر پرُانا شہر البیرزن آباد ہے جہاں خانہ بدوش رہتے ہیں۔ عقب میں سیرا نویدا کی برفانی چوٹیاں ہیں جہاں سے الحمرا کے فوّاروں کو پانی ملتا ہے۔

اور پہاڑ سے دُور اُفق پر ایک دھندلی سی چیز نظر آتی ہے۔ افریقہ کا ساحل۔

ان باغوں میں یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی کسی کے قدموں کی آہٹ سنی ہے، ابھی ابھی کوئی گیا ہے۔ یہ نامعلوم سی خوشبو اس کے پیراہن کی ہے۔ کسی نے پھولوں کو

چھو لیا تھا، یہ ٹہنیاں اب تک ہل رہی ہیں۔

الحمراء اب بھی پریوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ ہر ستون، ہر محراب، در و دیوار کے خوشنما نقوش چپہ چپہ سحر زدہ ہے۔ لیکن اس ویرانی میں زندگی کے آثار صرف فوّاروں کی صدائیں ملتے ہیں۔ یہ چشمے کبھی خاموش نہیں ہوئے۔ عربوں کے زمانے سے اب تک رواں ہیں۔ گزرتے ہوئے وقت کے مدّو جزر انسانی زندگی کی کم مائیگی، فلسفہ تعمیر و تخریب۔ سب ان فوّاروں میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں۔

وہ کیسا منحوس طلسم تھا جو سدا اس قصر پر مسلّط رہا۔ یہ قصر جواب بھی دنیا کی حسین ترین چیزوں میں سے ہے۔ ان سرخ فصیلوں کے اندر جو ارضی جنّت ہے۔ وہ اس قدر غم انگیز کیوں ہے۔

ہوا کا جھونکا آیا اور خوشبوئیں بکھیرتا چلا گیا۔ خوش الحان پرندوں کے چہچے سنائی دیئے اور فوّاروں کی صدا۔ دل میں اُداسی کی تہیں جمتی چلی گئیں۔ وہ اُداسی جو حُسن سے مربوط ہے۔

سی نور انتونیو ہمارا گائیڈ تھا۔ ایسی نورانی شکل کہ ولی اللہ معلوم ہوتا۔ یورپ میں چالیس پینتالیس برس کی عمر کے بعد اکثر آدمی ولی اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُس کا والد، دادا سب گائیڈ تھے۔ اسے فخر تھا کہ اس کا ایک بزرگ واشنگٹن آرونگ کا گائیڈ رہ چکا تھا۔ چنانچہ اس تصنیف میں بیشتر روایات اور قصے انتونیو کے بزرگ کے بتائے ہوئے تھے۔

"لیکن اب یہ نسل ختم ہو جائے گی، میں لاولد ہوں۔" وہ ٹھنڈا سانس بھر کر کہتا۔

اُسے موسیقی، ادب اور تاریخ سے خاص لگاؤ تھا۔ سامنے دیواروں پر عجیب سے خطوط بنے ہوئے ہیں، عرب یہاں ٹرگنومیٹری پڑھاتے تھے۔ قصر کے بڑے دروازے باب العدل پر جو کنجی کی شبیہ ہے۔ یہ صوفیوں کا نشان ہے۔ وہ کنجی جس سے خداوندوں کے قفل کھولتا ہے۔ ہسپانوی باغوں کی ایک رات ــــ کی مشہور دھن دراصل الحمراء کے چشموں کی صدا کا تاثر ہے۔ فرانسیسی الحمرا کو بارود سے اُڑانے لگے تھے۔ لیکن وقت پر پتہ چل گیا۔ تب سے ہمیں ان سے نفرت ہے۔ آپ بالکل ہسپانوی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی کچھ کر بیٹھیں اور بھاگنا پڑے تو چھپنے کے لئے سیدھے یہاں چلے آئیے، کسی کو پتہ تک نہ چلے گا۔"

وطن کی بہت سی باتیں یہاں ہیں۔ کسی سے کچھ پوچھو تو چار پانچ آدمی ویسے ہی ساتھ آن کھڑے ہوتے ہیں۔ رات کو لوگ خوشبو لگا کر گلیوں میں بغیر کسی مقصد کے دیر تک گھومتے رہتے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک ہوٹل کھلے ہوئے ہیں اور ریکارڈ بج رہے ہیں لیکن یہاں ایک چیز ایسی ہے جو ہمارے ہاں نہیں ـــ محبوبہ کے دریچے کے نیچے کھڑے ہو کر گانا گایا جا سکتا ہے (اگرچہ اس کی اجازت ہماری فلموں میں ہے) لیکن ہسپانوی محبوبہ جواباً ہرگز نہیں گائے گی۔ محبوبہ کے والدین تب تک خاموش رہیں گے۔ جب تک عاشق سنجیدگی سے گا رہا ہے۔ لیکن اگر وہ بات کرنے کی کوشش کرے تو شور مچ جائے گا۔ اور محبوبہ کو اندر بُلا لیا جائے گا۔

یہ رقص خاص فرمائشی چیز ہے۔ پبلک کے لئے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے کم از کم پانچ سو پیسیٹے (تقریباً چھ پونڈ) دینے پڑتے ہیں ان لوگوں کو شراب بھی پلانی پڑتی ہے۔ تین پاونڈ اور ـــ گویا مجرا کرانا ہے۔

شام کو ہم البیرزن گئے، سیڑھیاں طے کر کے غاروں میں اُترے مدھم سی روشنی میں سگریٹ کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی خوشبو آرہی تھی۔

شراب کا دور شروع ہوا گٹار بجنے لگی۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی چنچل لڑکی بار بار مجھ سے اجنبی زبان میں سوال پوچھ رہی تھی۔ ایک جام مجھے بھی زبردستی دیا گیا۔ جسے میں نے اس لڑکی کو دے دیا۔ اس نے فوراً اسے اپنے جام میں انڈیل لیا۔ گھڑی دیکھنے کے بہانے اس نے میری کلائی تھام لی۔

وہ ناچنے اُٹھی تو دوسری آبیٹھی وہ بھی پریشان کرنے لگی۔ دفعتاً پہلی نے اُسے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا، موقعہ پاتے ہی وہ پھر آبیٹھی۔ اب باقاعدہ چھینا جھپٹی شروع ہو گئی بڑی مشکل سے اُنہیں چھڑایا گیا۔ پہلی لڑکی کے رخسار پر لمبا نشان تھا۔ جیسے خنجر کا زخم ہو۔

"یہ خانہ بدوش لڑکیاں بڑی تند خو ہوتی ہیں" انتونیو نے میرے کان میں کہا۔ "جدھر مائل ہو جائیں تو جان تک لڑا دیتی ہیں۔ ذرا محتاط رہیے، یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کہاں مقیم ہیں"

"اُسے کوئی غلط پتہ بتا دیجیے"

اب اصل رقص شروع ہوا۔ یہ خانہ بدوشوں کا قدیم رقص ہے۔ اس میں ایک داخلی کشمکش موجود ہے۔ جیسے رُوح کی ساری جدوجہد جسم میں منتقل ہو گئی ہو۔ زندگی، محبت، جذبہ تخلیق کے بنیادی حقائق کا اظہار اس رقص میں پورے خلوص سے نمایاں ہے"

یہ اظہار غیر ارادی ہوتا ہے۔ جس میں حزن ہے۔ بیتابی ہے۔ مگر بلا کی جاذبیت بھی ہے۔ رقاصہ تنہا کھڑی ہوئی اس پھول کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ جو شعاعوں کی تمازت،

تھکن اور نیند کے احساس سے مغلوب ہو چکا ہو۔ اس کے گورے بازو پانی میں تیرتے ہوئے کنول کے لمبے ڈنٹھل ہیں۔

یکایک وہ کانپتی ہے اس کے دل کو کسی شدید جذبے نے چھوا ہے ایک لہر کے بعد دوسری آتی ہے، بشدتِ احساس سے اس کا جسم لرزنے لگتا ہے۔

اب وہ صبح کے دھندلکے میں کھلے ہوئے پھول کی طرح لگ رہی ہے۔ پھول جو سورج کی پرستش کے لئے خاموش کھڑا ہے۔ جس کی پنکھڑیوں سے شبنم کے قطرے ڈھلک رہے ہیں۔

وہ بیدار ہو رہی ہے زندگی نے دفعتاً اُسے بازو سے آن پکڑا۔ اس کا سر پیچھے جھک جاتا ہے۔ اس کے بازو کسی غیر مرئی شئے کو آغوش میں لے لیتے ہیں۔ اس کے ہونٹ ایک ان جانے بوسے کی لذت سے بوجھل ہو جاتے ہیں — آہستہ آہستہ وہ آنکھیں کھولتی ہے۔ پلٹ کر وہ اس کا تعاقب کرتی ہے۔ اس کی رُوح بے چین ہے، وہ تیزی سے سانس لے رہی ہے۔ اس کرب سے نجات پانے کے لئے وہ تگ و دو کرتی ہے رقص کی ایک ایک جنبش سے یہ جدوجہد عیاں ہے۔

آخر ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہے — اب وہ آزاد ہے۔

فرطِ انبساط سے اس کا رُواں رُواں پھڑک رہا ہے۔ مجیرے بجتے ہیں۔ تار تھرتھراتے ہیں گویّے کی لے کے ساتھ وہ ترنگ میں ناچ رہی ہے۔

یہ وجدانی حالت زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ رقاصہ پر ایک نئی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زندگی کی مضبوط گرفت نے اسے دبوچ لیا ہے۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہے، اعضا تھکے تھکے سے ہیں۔ وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر آہیں ہیں۔ اس کی آنکھیں

غمگین ہیں۔

اب وہ ایک کونے میں بےحس و حرکت کھڑی ہے۔ خاموش، تنہا۔

گٹار سسکی بھر کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رقص تمام ہوتا ہے۔

غرناطہ سے اشبیلیہ تک جگہ جگہ دھوپ میں چمکتے ہوئے سفید صاف ستھرے گاؤں آتے ہیں۔ زیتون، نارنگیوں اور کھجوروں کے درخت۔ ہر گاؤں میں ملتا سا ورگنبددار عمارتیں ہیں جو کبھی مسجدیں تھیں۔ اب تک طرزِ تعمیر وہی پرانا ہے۔

عربوں کو درختوں سے ہمیشہ محبت رہی۔ عبدالرحمٰن اوّل نے کھجور کا پہلا پودا شام سے منگوا کر قرطبہ میں بویا تو وطن یاد آیا اور اس نے وہ نظم کہی جو اب تک پڑھی جاتی ہے۔

اشبیلیہ میں پلاؤ کھایا۔ نارنجاس (نارنگیاں) آئیں تو چاقو ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے۔ برساتی غائب تھی۔ فوراً کمرے میں پہنچے۔ وہاں نہیں ملی، صندوق کھولے، کارپٹ دیکھا۔ ہوٹل والوں سے پوچھا لیکن نہیں ملی۔

غرناطہ فون کیا۔ برساتی کا حلیہ بتایا جواب ملا۔ آپ تحفے خریدتے وقت برساتی ایک دکان پر چھوڑ آئے تھے، ایک بڑھیا اسے پہنچا گئی ہے۔ لیکن آپ کی برساتی سبز نہیں سبزی مائل ہے اور اس کی جیب میں دستانے ہیں اور بیس پیسے بھی آج شام تک اشبیلیہ پہنچ جائے گی۔

شام سے پہلے برساتی مل گئی۔ لاری والے نے کرایہ نہیں لیا۔ غرناطہ والے ادا کر چکے تھے۔

اشبیلیہ کی سب سے مشہور عمارت القصر ہے جو ہو بہو الحمراء کی نقل ہے، غرناطہ

کبھی مسجد کا مینار تھی۔ اب گرجے کا مینار ہے۔ اس میں سیڑھیاں نہیں ہیں پہاڑی سڑک والی چڑھائی ہے ہمیں بے حد فرقت زدہ گائیڈ ملا، شاید اس کی محبوبہ اس سے بیزار تھی یا vice versa اس نے ہمیں ڈون جوآن کی قبر دکھائی جو گرجے کی سیڑھیوں کے عین نیچے ہے گرجے میں جانے والا کتبے کے اُوپر سے گزرتا ہے۔ مرحوم کی آخری خواہش کے مطابق۔ کتبے پر لکھا ہے۔ "یہاں دنیا کا سب سے بڑا گنہ گار سو رہا ہے۔ اسے پاؤں تلے روند دیجئے۔"

ڈون جوآن چلتے چلتے بھی سکور کر گیا۔ ایسا کتبہ کسے نصیب ہوتا ہے؟

ایک گرجے میں کولمبس کی ہڈیاں دفن ہیں۔ لیکن جنوبی امریکہ والے کچھ اور کہتے ہیں۔ دراصل کولمبس اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ متعلقہ ممالک میں سے ہر ایک نے اسے اپنے ہاں دفن کیا ہے۔

"یہ وہ سیگرٹ فیکٹری ہے جہاں مشہور رقاصہ کارمن ملازم تھی۔" گائیڈ ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔

"اور وہ دکان کہاں ہے جہاں باربر آف سویلیہ کام کرتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

ہم بُل فائیٹنگ کے اکھاڑے کے سامنے کھڑے تھے۔

"سردیوں میں بُل فائیٹنگ نہیں ہوتی۔ کیونکہ سارے بُل فائیٹر آرام کرتے ہیں۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"اور غالباً بیل بھی آرام کرتے ہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

اس کا نام کارلوز بار بُلا تھا۔ اندلس میں ایسے نام اب تک ہیں جو باشندوں کی نسل کو ظاہر کرتے ہیں۔ رکارڈو ڈی مڈینز (مدینہ کا رچرڈ) کارلوز الحرّدز (چارلس الحُر)

گائیڈ کی افسردگی مجھ سے نہ دیکھی گئی اور ہم پلاؤ کھانے لوٹ آئے۔

ہم نظاروں کے رنگین کارڈ خریدتے۔ پوسٹ کارڈ خریدنا پڑتا۔ اس لئے کچھ اوٹ پٹانگ کارڈ بھی آجاتے۔ چنانچہ گرجوں وغیرہ کے نظارے جُولیا کو ارسال کئے جاتے۔ جُولیا سخت مذہبی قسم کی لڑکی تھی، کٹر رومن کیتھولک شہری سکرٹ پہنتی یعنی ٹخنوں تک نیچی۔ جمعے کو گوشت سے پرہیز تھا، جمعرات کو انڈوں سے، بدھ کو مچھلی سے، تو اتوار کو سینما سے۔ تقریباً ہر روز اس کا کسی چیز سے روزہ ہوتا لیکن ماشاء اللہ تھی خوش خوراک، ایک ہی دن میں ہفتے بھر کی کسر نکال لیتی۔

اشبیلیہ میں سال کی آخری رات تھی۔ میں تیار ہُوا تو دیکھا کہ میرا دوست سویا پڑا ہے اسے جگایا۔

"کوٹ کی جیب میں بٹوہ ہے۔ تم اکیلے ہو آؤ۔ میں تھکا ہُوا ہوں۔"

پڑوس کی رقص گاہ میں بڑی رونق تھی، جدھر نظر جاتی۔ ادھیڑ عمر کے مرد عورت دکھائی دیتے۔ یورپ میں یہ بڑی مصیبت ہے۔ کسی اچھی جگہ جاؤ فقط بنے سنورے بوڑھے بوڑھیاں نظر آتے ہیں۔ شاید یہ زندگی کا قانون ہے، جب خون میں حرارت اور طبیعت میں جولانی ہوتی ہے تو کوئی نہیں پوچھتا۔ سارے کام اُلٹے ہوتے ہیں اور جیب خالی ہوتی ہے۔ جب حالات بہتر ہونے لگتے ہیں تو دل بُجھ جاتا ہے اور مسرتوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ ہر چیز ذرا دیر میں ملتی ہے۔

واپس لوٹا تو ہوٹل والے نے روک لیا۔ "آج تو جگہ جگہ جشن ہوں گے۔ اگر آپ آج سو گئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔"

"تو اُوپر سے برساتی منگا دیجئے۔"

برساتی پہن کر میں باہر نکلا۔ وادی الکبیر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ بڑی سہانی رات تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ سنزالدہ کو آج روشن کیا گیا تھا۔ اس خوشنما مینار کو دیکھتا رہا۔ اتنی بلندی سے مؤذن کی آواز نیچے نہیں پہنچتی ہوگی۔ پھر چمکتے ہوئے تاروں نے یاد دلایا کہ عرب مسجد کے بلند میناروں سے رصدگاہ کا کام لیتے تھے۔

اونچی عمارات کا سلسلہ ختم ہوا تو کنج آئے جہاں الاؤ روشن تھے۔ شور مچا ہوا تھا، ہجوم میں ایک گویے نے تان اٹھائی اور اس طرح مرکی لگائی کہ استاد فیاض خاں یاد آگئے۔

یہاں BOLERO ہو رہا تھا۔ اس رقص میں ہنگامہ زیادہ ہے، لوگ دائرے میں کھڑے ہو کر تالیاں بجا بجا کر تال دیتے ہیں۔ ایک طرف سے لڑکا نکلتا ہے۔ مخالف سمت سے لڑکی۔ وہ لڑکے کی موجودگی سے بظاہر بے خبر ہے۔ لڑکا طرح طرح کے جملوں سے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سینوریتا کے ہاتھوں میں castanets ہیں جنہیں وہ کبھی تال دینے کے لئے بجاتی ہے۔ کبھی والہانہ انداز میں تو کبھی محض تھرانا۔

متواتر چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر وہ لڑکے کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن کچھ اس انداز سے جیسے حملہ کر رہی ہو۔ لڑکے کے قدم زمین پر جمے رہتے ہیں لیکن وہ بدن کی جنبش سے وار بچا جاتا ہے۔ لڑکی بالکل چھوتی ہوئی برابر سے گزر جاتی ہے۔

"اولے تاہ" ہجوم چلاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ان کے آباؤاجداد "واللہ" کہہ کر داد دیا کرتے تھے۔

وہ سر کو بار بار جھٹکتی ہے۔ سیاہ زلفیں بکھر جاتی ہیں۔ بالوں میں ٹنکے ہوئے پھول گر

جاتے ہیں، بل کھاتا ہوا جسم مچلنے لگتا ہے۔ گٹار کے نغمے کا زیر و بم نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے
لڑکا پھر چھیڑتا ہے، وہ آتی ہے۔ یہ دامن بچا جاتا ہے۔

"اولے!" ہجوم داد دیتا ہے۔

رقص کا اختتام اسی طرح ہوتا ہے جیسے ہونا چاہیئے۔ لڑکے کی مدافعت گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتی ہے۔ نسوانی جادو اپنا کام کر جاتا ہے۔ اب لڑکی اپنے لباس اور چوڑیوں سے کھیل رہی ہے اور وہ دیوانہ وار اس کے گرد طواف کر رہا ہے۔

گانے، تالیوں اور سازوں کے شور میں شراب کا دور چلتا ہے، ایک نیا جوڑا اٹھنے لگتا ہے۔ جہاں اس رقص میں خمار و مستی ہے وہاں محبت کے تمام حربوں کی ترجمانی بڑے خلوص سے ہوتی ہے۔ اس رقص کے کچھ حصے بُل فائیٹنگ سے بہت ملتے ہیں بالکل اسی کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ بیل حملہ کرتا ہے اور بُل فائیٹر وار بچا جاتا ہے۔

میری باری آئی۔ تب تک میرے چند دوست بن چکے تھے۔ سینوریتا فلادیا کی فرمائش پر میں نے سیاہ کوٹ اور بو اُتار کر اس کی بہن کے حوالے کئے۔ کالر کھول کر اور بال پریشان کر کے میدان میں کود پڑا۔

ٹک ٹکاٹک ٹکاٹک ٹِک ٹک۔ فلادیا کے Castanets بجے۔ ٹپ ٹپاٹپ ٹپاٹپ ٹپ ٹِپ۔ میں نے ایڑیوں کو فرش پر مارا۔

میں سفید قمیض سیاہ چست پتلون پہنے، ٹھوڑی نیوڑھائے، پنجوں کے بل تنا ہوا کھڑا تھا بالکل بُل فائیٹر کے انداز میں۔

دہنا کندھا اور دہنا پاؤں آگے کر کے میں فلادیا کی طرف پنجوں پر گھوما۔

چھناانن، چھن، چھن۔ اس کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ ایک اچٹتی نگاہ ڈالتی

ہوئی وہ اتنے قریب سے گزری کہ میرے بال اور بھی پریشان کر گئی۔ گو بے نے پھر استاد فیاض خاں کی طرح انترہ اٹھایا۔ فلاویا نے دونوں بازو پھیلائے میرے چہرے کا ہالہ بنا کر انگلیاں یوں نچائیں جیسے بلائیں لیتے ہیں۔ بالکل یہی میں نے کیا۔ آگے بڑھا، لیکن وہ تڑپ کر بازوؤں کے حلقے سے نکل گئی۔

"او لے۔ او لے"

لے اب چلنتر میں تھی، رقص تیز ہوتا گیا۔

الاؤ بجھنے لگے، چاندنی پھیکی پڑ گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو چاند کھجوروں کے جھنڈ میں غروب ہو رہا تھا۔

ایک امریکن نے ہم سے کہا کہ وہ ہمیں شہر تک اپنی کار میں چھوڑ آئے گا۔ فلاویا کی بہن کے کہنے پر ہم سب کار میں بیٹھ گئے۔ ایک لڑکی امریکن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کسی مذاق پر اس نے ہسپانوی زبان میں کچھ کہا۔ جس کے معنے تھے۔ میں سینوریتا ہوں مجھے کچھ نہ کہنا۔ ہم سب ہنسنے لگے۔ اتفاق سے امریکن کی کہنی پھر اُسے چھو گئی۔ اس نے پھر وہی فقرہ دہرایا۔ اتنے میں فلاویا نے اپنی بہن سے کچھ کہا۔ جس میں سینوریتا کا لفظ دو مرتبہ آیا۔

امریکن جو غالباً مدہوش تھا طیش میں چلایا۔ "سِن یا یا یا سن لیا۔ تم بھی سینوریتا ہو اور سینوریتا کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

فلاویا غصے سے لال بھبوکا ہو گئی۔

"کار روکئے، میں اترنا چاہتی ہوں"۔

کار رکی، فلاویا اتری، میں بھی اتر گیا۔ ہم کافی دور مضافات میں تھے

"تم ناحق اتر گئے۔ اجنبی ہو ضرور راستہ بھول جاؤ گے۔"

"لو یہ برساتی پہن لو۔ سردی ہے"۔ بڑے اصرار سے میں نے اُسے برساتی پہنائی۔
ہم وادی الکبیر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، رات ختم ہو چکی تھی صبح کا اجالا
پھیل رہا تھا۔

"پتہ نہیں میری بہن گھر پہنچ کر کیا کیا نکتہ چینی کرے گی"۔

"تو پھر میں شام کو تمہاری گلی میں SERENADE کرنے نہ آؤں؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "ضرور آنا۔ میں سیاہ مینٹلا پہن کر بالوں میں پھول لگا کر دریچے میں
انتظار کروں گی"۔

"لیکن تم اپنے نازک سے پنکھے سے چہرہ چھپا لوگی"۔

"تمہیں سب پتہ ہے۔ اچھا نہیں چھپاؤں گی"۔

جب اس کا گھر آیا تو مشرق میں روشنی پھیل چکی تھی۔

"تو پھر تم آؤ گے"۔

"نہیں فلاویا، اب ملاقات نہیں ہوگی۔ میں آج قرطبہ جا رہا ہوں"۔

وہ کچھ دیر خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے برساتی کو سُرخ ہونٹوں سے
بار بار چُوما۔

"میں تمہیں ہر نئے سال کی رات کو یاد کیا کروں گی"۔

قرطبہ ویرانی کی تصویر ہے، محزون، المناک، قرطبہ ایک مردہ شہر ہے جس میں روحیں
بستی ہیں۔ پُرانے محلوں میں، کھنڈروں کے آس پاس، کھجور کے درختوں کے نیچے، دریا
کے کنارے۔ دہشت ناک خاموشی ہے۔ جیسے اجل کو رخصت ہوئے زیادہ دیر
نہیں ہوئی۔

یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شہر ہے جسے یورپ کے ایامِ جہالت میں ایک فرانسیسی راہبہ نے "دنیا کا ہیرا" کہا تھا۔

میں وادی الکبیر کے پُل پر کھڑا ہوں۔ سامنے مسجد قرطبہ کا مینارہ ہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کا محل۔ سرُوں کا بنایا ہُوا یہ پُل اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ اب بھی اتنی حسین و جمیل ہے۔ مدینتہ الزہرا کے کھنڈر اس کی گزشتہ عظمت کے گواہ ہیں۔

یہ شہر ایک زبردست تہذیب کا منبرہ ہے۔

دسویں صدی میں یہاں ڈھائی لاکھ مکان تھے۔ دس لاکھ باشندے یہاں بستے تھے۔ لندن کو یہ آبادی کہیں اُنیسویں صدی میں نصیب ہوئی۔ یہاں میلوں تک پختہ سڑکیں تھیں، جن پر رات کو روشنی ہوتی تھی، اس زمانے کے سات سو سال بعد تک لندن کی کسی سڑک پر ایک لیمپ تک نہ تھا۔ قرطبہ میں ستر لائبریریاں تھیں خلیفہ الحکم کی لائبریری میں پانچ لاکھ کتابیں تھیں۔ المنصور نے باون لڑائیاں لڑیں اور ہر مرتبہ فتحیاب ہوا۔ عیسائی یورپ کے تمام ممالک اپنے سفیر یہاں بھیجنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

"ڈوزی" لکھتا ہے کہ ان دنوں اندلس میں تقریباً ہر شخص پڑھ لکھ سکتا تھا۔ عیسائی یورپ میں صرف گنے گنائے پادری یہ دعوے کر سکتے تھے۔ اندلس کی عورتیں آزاد تھیں اور بغیر نقاب کے بلا روک ٹوک باہر نکلتیں۔ ان میں سے بیشتر نے حکومت کے ذمہ دار عہدے سنبھال رکھے تھے۔

آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی تک دُنیا بھر میں عربی بولنے والے ہی وہ واحد لوگ تھے جنہوں نے تہذیب و تمدن کی شمع تھامے رکھی۔ یہ روشنی منتقل ہو کر مغربی یورپ پہنچی اور تحریکِ احیائے علوم کا باعث بنی۔

ہسپانیہ کے عرب بڑے مہذب تھے۔ بارھویں صدی میں مراقش سے کاغذ سازی کی صنعت ہسپانیہ میں آئی، تیرھویں صدی میں اسے ہسپانیہ سے اٹلی لایا گیا، یورپ پر عربوں کا یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

سولہویں صدی تک پیرس کی یونیورسٹی میں طب کے طلباء کو بارہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں یہ سب عربی کتابوں کے ترجمے تھے۔

یونانی ادب ہم تک عربوں کی وساطت سے پہنچا۔

اب بھی ابن رشد Averroes کا ذکر فلسفے کی ہر کتاب میں ہوتا ہے۔ اشبیلیہ کا ابن قمر Avenzoar عظیم شاعر، فلسفی، نثر نگار، سیاستدان ابن حزم۔ اور مشہور سرجن ابوالقاسم جس کی تقلید یورپ میں صدیوں تک ہوئی۔

یہاں سوشلزم صحیح معنوں میں رائج تھا۔ المنصور پہلے کلرک تھا، ترقی کر کے حکمران بن گیا۔ یہاں مفتوحہ عیسائی مطمئن تھے، ہر شہر میں ان کے گرجے تھے۔ ان کے لئے قانون ان کا اپنا تھا۔ ان کے جج اپنے تھے۔ ہسپانیہ کے سفیر اکثر عیسائی ہوا کرتے۔ عبدالرحمان سوئم کا حفاظتی دستہ بارہ ہزار عیسائیوں پر مشتمل تھا۔

نفاست اور نستعلیق پن میں مسجد قرطبہ کا مقابلہ قدیم یونانی عمارات سے کیا جا سکتا ہے۔ کوئی اور طرز تعمیر ایسا نہیں جو ایسے لطیف تاثرات پیدا کرتا ہو۔

گاتیر جب یہاں آیا تو ستونوں اور خوشنما محرابوں کے جھنڈ کو دیکھ کر اُسے عرب کے نخلستان یاد آئے اور وہ محبت جو عربوں کو درختوں سے رہی ہے، اُسے یوں محسوس ہوا جیسے راتوں رات سنگِ مرمر کا جنگل کا جنگل اُگ آیا ہے۔ نو سو نازک ستون (جو کبھی بارہ سو تھے) جنہیں تاریخ، روم اور بازنطینی سلطنت سے دیا گیا۔ ہر ستون سے دو محرابیں اٹھتی

ہیں، پھر اُوپر دو محرابیں۔ ان محرابوں پر سُرخ نقوش ہیں، جدھر نظر جاتی ہے ستونوں کی قطاریں اور محرابوں کے حاشئے نظر آتے ہیں۔ ستون اتنے نازک ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تیز ہوا چلی، تو سب کچھ گر پڑے گا۔ یقین نہیں آتا کہ بارہ سو سال سے یہ عبادت گاہ جوں کی توں کھڑی ہے۔ عیسائی فاتح اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے تباہ نہیں کیا۔ لیکن اس میں گرجا تعمیر کر دیا۔ ہمَن کو اس حسین عمارت کے شکستہ قلب میں یہ گرجا ایسا لگا جیسے ایک استغراق و دعا میں ایک گستاخ قہقہہ۔

ان دونوں ہر دروازے پر ایک چھوٹا سا گرجا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ فرانکو مسجد کو پرانی حالت پر لانا چاہتا ہے۔ مدینۃ الزہرا بھی از سرِ نو تعمیر ہو گا۔

"یہاں وہی ہوا جو سینٹ صوفیہ میں ترکوں نے کیا۔ میں رومن کیتھولک ہوں۔ لیکن میری خواہش ہے کہ یہاں سے گرجے ہٹا دیئے جائیں۔ ستون دوبارہ نصب کئے جائیں۔ ہسپانوی رگوں میں عربوں کا خون ہے۔ یہ مسجد ہماری قومی یادگار رہے۔" گائیڈ کہہ رہا تھا۔

قرطبہ سے دس میل دور مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات ہیں جسے ہسپانیہ کا پامپی آئی کہا گیا ہے۔ اسے خود بربروں نے تباہ کیا۔ فرانکو کے انجینئر اسے دوبارہ تعمیر کر رہے ہیں۔

ہسپانیہ سے ہم اداس ہو کر لوٹے۔

سان سبستیاں پر فرانس میں داخل ہوئے تو میرا دوست لین پول کی کتاب کے یہ فقرے سنا رہا تھا۔ ہسپانیہ سے عرب کیا گئے سونے کی چڑیا اُڑ گئی۔ مستعار شدہ روشنی سے یہ ملک کچھ دیر جگمگایا، پھر اسے ہمیشہ کے لئے گہن لگ گیا۔

واپس اڈنبرا پہنچا، برفباری ہو رہی تھی، یخ کر دینے والی سردی تھی اور تند ہوا جو غالباً سیدھی قطب شمالی سے آ رہی تھی۔ ایک ہم وطن نے فون کیا۔ "سنا ہے آپ ہسپانیہ گئے تھے"۔

"جی ہاں"۔

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"کب؟"

"کل جمعہ ہے آپ میرے ساتھ نماز پڑھیے"۔

میں گیا، نماز کے بعد انہوں نے فرمایا۔ "میں بھی ہسپانیہ دیکھنا چاہتا ہوں، بڑا اچھا اسلامی ملک ہے"۔

میں نے انہیں بتایا کہ ہسپانیہ اسلامی ملک نہیں ہے تو انہوں نے فوراً ارادہ تبدیل کر دیا۔

ہر روز بارش ہوتی، ہر روز لیکچر ہوتے۔ دن رات بجلی کی روشنی میں پڑھائی ہوتی۔ لیکن یہ خوشی تھی کہ تین مہینے کے بعد ایسٹر کی چھٹیاں ہوں گی۔ شام کو تھک کر آتا تو نقشے دیکھتا اور نئے سفر کا پروگرام بناتا۔ ایک ایک دن گننے کے بعد انتظار ختم ہوا اور تعطیل شروع ہوئی۔

میں پھر رودبار انگلستان عبور کر رہا تھا۔ برساتی کی دونوں جیبیں نقشوں اور گائیڈ کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس مرتبہ میں سیدھا FRENCH RIVIERA پہنچا۔

نیس میں خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں دن بھر بحیرۂ روم کے ساحل پر

بیٹھا لہریں گنتا رہا۔

برطانیہ یورپ کے اس حصّے سے بہت مختلف ہے۔ وہاں مٹیالے رنگوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس نظر آتے ہیں۔ غذا کے جزو وہی ہیں لیکن باورچی خوب ستیاناس کرتے ہیں۔ لوگ پھیکے، بدمزہ کھانے کو چٹخارے لے لے کر کھاتے ہیں۔ فش اینڈ چپس کے ساتھ انگریز تلخ اور کسیلی بیئر کے گھڑے کے گھڑے پی جاتے ہیں۔ ناگوار اور تیز قسم کی دھنوں پر لڑکیاں آدھی رات تک پریڈ کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ رقص کر رہی ہیں۔ لیکن یہاں دیدہ زیب چست لباس ہیں، کلاسیکی موسیقی، لذیذ غذا اور خوش رنگ شراب۔ وہاں اگر کوئی کہے کہ سٹیشن تک صرف پندرہ منٹ کا راستہ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اگر سرپٹ بھاگتے ہوئے گئے تب پندرہ منٹ میں پہنچو گے۔ یہاں سو گز چلنے میں آدھ گھنٹہ لگتا ہے۔ وہاں ہر چیز کی جلدی ہے۔ انگریز کا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ وہ زمین دوز ریل میں چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہا ہے۔ بار بار گھڑی دیکھتا ہے۔ بھاگ کر بس پکڑتا ہے۔ پھر ایک ٹرین میں سوار ہوتا ہے اور اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد چپ چاپ آدھے میل لمبے کیو میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ فلم یا میچ دیکھنے یا کھانا کھانے کے لئے۔ ممکن ہے کہ سڑک پر دوڑتے ہوئے انگریز کو دفتر پہنچنے کی جلدی ہے۔ یا شاید اس نے کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے وہ دونوں کہیں شراب پئیں گے یا کتوں کی دوڑ پر شرط لگائیں گے، یا وہ محض اس لئے بھاگ رہا ہے کہ باقی سب انگریز بھی بھاگ رہے ہیں۔

لیکن یہاں کسی چیز کی جلدی نہیں۔ یہاں اگر کسی نے پانچ منٹ بچا بھی لئے تو بیکار ہے۔ بھلا وہ ان پانچ منٹوں کا کرے گا کیا۔

وہاں افراتفری سی رہتی ہے۔ بسوں اور ٹرینوں میں مرد بیٹھے ہوئے ہیں عورتیں

کھڑی ہیں۔ اکثر مرد جیب سے اخبار نکال کر چہرے کے سامنے کر لیتے ہیں۔ وہ عورتوں کو کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے ہیں اکثر کسی عورت کو جگہ دینے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا، مرد بڑے تعجب سے میری طرف دیکھتے۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ "تمہیں کام پر جانا ہے، بار بار اٹھ کر اپنی جگہ لڑکیوں کو بٹھاتے رہے تو تھک جاؤ گے۔"

ایک دن ایک بوڑھا جو فلسفی معلوم ہوتا تھا۔ بولا۔ "سر والٹر ریلے! شولری کے دن بیت چکے، اب عورت مرد برابر ہیں۔ بلکہ یہاں سولہ سترہ لاکھ عورتیں فالتو ہیں۔ ہمارا اُن کا مقابلہ ہے۔ اگر تم چوکنے نہ رہے تو کسی دن ایک عورت کرسی سے تمہیں اُٹھا کر تمہارا کام خود سنبھال لے گی۔"

یہاں ملتے وقت مرد جھک کر عورت کا ہاتھ چومتے ہیں۔ آداب محفل پر بڑی سنجیدگی سے عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں غربت ہے۔ سستی ہے اور بے زاری ہے۔

کرائے کی کرسی پر میں دن بھر سمندر کے کنارے بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اور لوگ مجھے دیکھتے رہے۔

مانٹی کارلو کا مشہور قمار خانہ دُور سے مسجد معلوم ہوتی ہے۔ سبز مینار اور گنبد۔ لیکن رات کو کچھ اور ہی سماں ہوتا ہے۔ ہر روز انسانی رجائیت کے اس مندر میں لوگ اُمیدیں لے کر آتے ہیں۔ لیکن اس کا وجود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ زیادہ لوگ ہارتے ہیں۔

Cannes میں دکانوں پر بڑی بڑی ہستیوں کی نہایت عجیب و غریب تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ریٹا ہیورتھ سمندر میں نہاتے ہوئے۔ بھویں غائب ہیں، اور

میک اپ اترا ہوا، چہرے پر طرح طرح کے نشان۔ کوئی قسم کھائے تب بھی اعتبار نہیں آتا کہ سامانِ آرائش سے آتنی کایا کلپ ہو سکتی ہے۔ فاروق نے سمندر میں غسل صحت کرتے ہوئے بکینی سوٹ پہنا ہوا ہے۔ اس برائے نام لنگوٹ میں فرہی پوری شان و شوکت سے نمایاں ہے۔

کھانے کی میز پر سامنے ایک ادھیڑ عمر کی خاتون پہلی شام کو دیکھتی رہتی ہیں دوسری شام کو مسکراتی ہیں۔ میں پاس جا بیٹھتا ہوں۔ ان کے ساتھ ان کی لڑکی بھی ہے۔

"آپ کونسی زبان سمجھتے ہیں؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا

"وہی جو آپ بول رہی ہیں۔"

"معافی چاہتی ہوں، بغیر تعارف کے مرد سے عورت کا بات کرنا، آداب کے خلاف ہے لیکن آپ تنہا بیٹھے تھے سوچا کہ اجنبی ہوں گے۔ چنانچہ میں نے بلا لیا۔"

ان کا جی باہر جانے کو چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر ضبط کیا۔ آخر کہہ ہی دیا۔ "ہم دونوں اکیلی ہیں، اسی طرح ہمارا باہر نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ ہمیں نائٹ کلب لے چلیں تو ہم مشکور ہوں گے۔ یہ میری بیٹی ہے۔ ہیلن ان سے گفتگو کرو۔"

ہیلن حسین تھی۔ لیکن بے حد اُداس۔ مادام کا خاوند جنوبی فرانس کا مشہور ڈاکٹر تھا دونوں سیر کرنے نیس آئی تھیں۔

رقص کرتے ہوئے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہیلن اب رو دے گی۔

"ٹرائے کی ہیلن اداس کیوں ہے؟"

پھر ایک غم آمیز مسکراہٹ لبوں پر آئی۔ "جی نہیں اُداس تو نہیں ہوں۔"

واپسی پہ مادام نے ایک طرف لے جا کر بتایا کہ ہیلن عارضۂ عشق میں بُری طرح

مبتلا ہے اور غلطی سے ایک ایسے لڑکے پر عاشق ہوگئی ہے جو بیک وقت چھ لڑکیوں پر عاشق ہے۔ تین سے منگنی کرا چکا ہے، دو سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور افواہ ہے کہ اُس کا ایک بچہ بھی ہے۔ سخت نامعقول قسم کا آدمی ہے، کام وام کچھ نہیں کرتا دن بھر ڈنڈے بجاتا ہے۔

"میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ میری مدد کرو گے؟"

"فرمایئے۔"

"اُس کی توجہ اُدھر سے ہٹا دو۔ مہینوں کے بعد یہ آج مُسکرائی ہے۔ محض اسی لئے اسے یہاں کھینچ کر لائی ہوں کہ کسی طرح اُسے بھول جائے۔"

"مادام۔ مجھے اپنے غم ہی نہیں چھوڑتے۔ اور پھر میں یہاں صرف چند دنوں کے لئے ہوں"۔

"مجھے مایوس مت کرو۔ میرا خاوند اور میں نہایت غمگین ہیں۔ ہماری مدد کرو"۔

مادام رونے کی تیاریاں کرنے لگی۔

"اچھا!۔ اچھا!" میں نے جلدی سے کہا۔

اگلے دن ہم تینوں سیر کو گئے۔ موٹر بوٹ لے کر اُن جزیروں کی سیر کی جہاں Dumas کے کردار قید رہے تھے۔ پھر مت سے اونچی چوٹی پر چڑھ گئے۔ موسم صاف تھا۔ دور سمندر میں ایک دھبہ نظر آ رہا تھا۔

"ہیلن وہ دیکھو جزیرہ کارسیکا۔ نپولین کا وطن۔ یہاں عربوں کی اولاد اب تک آباد ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ نپولین کی رگوں میں بدوؤں کا خون تھا۔"

فرانس کے سب سے بڑے ہیرو کے متعلق یہ سُن کر ہیلن نے احتجاج کیا۔

"بھئی نپولین ہمارا ہی تھا۔ لیکن مورخ کہتے ہیں کہ اُس کے خون میں آمیزش تھی"۔
شام کو نائٹ کلب میں مادام ہم دونوں کو چھوڑ کر خود بوڑھوں کی محفل میں جا بیٹھی۔

"کیا وہ اب بھی تم سے ملتا ہے"؟

"نہیں بات تک نہیں کرتا"۔

"اور تمہیں اب بھی پسند ہے"؟

"ہاں"۔

اس کے رخسار پر راکھ کا چھوٹا سا ذرہ تھا جسے میں نے انگلی سے ہٹا دیا۔ اس کی آہیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔

"ناچنا ہے تو سیدھی طرح ناچو، ورنہ جاؤ اپنی امّی کے پاس"۔

"پہلے میں اُسے بھلا لوں۔ پھر"

"اچھا جلدی کرو۔ تمہیں آدھ گھنٹہ دیتا ہوں۔ پھُرتی سے بھُلا دو"۔

وہ ہنسنے لگی۔ ہیلن کو بشاش دیکھ کر مادام کی باچھیں کھل گئیں۔ "یہ مدتوں کے بعد ہنسی ہے۔ اسے باہر لے جاؤ سمندر کے ساحل پر"۔

ہم سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ پھر اس عاشق جانباز کا ذکر چھڑ گیا۔

"تم نے جس انداز سے اس کی تعریفیں کی ہیں۔ میں بھی اس پر عاشق ہو گیا ہوں اب ہم دونوں رقیب ہیں، آؤ سمندر میں کنکر پھینکیں، جو دُور پھینکے گا وہی جیتے گا"۔

ہم کنکر پھینکنے لگے۔

"تم جان بوجھ کر ہار رہے ہو" وہ مچل گئی۔

"نہیں! میں اس بُتِ طنّاز کو جیتنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں"۔

"کہاں ہے بچھر؟ دکھاؤ اپنا ہاتھ۔"

میں نے دوسرا ہاتھ دکھایا

"تم وائلن بجاتے ہو؟"

"کیوں"؟

"یہ تو آرٹسٹ کی انگلیاں ہیں۔"

"تمہیں وائلن پسند ہے"؟

"بہت۔ اُس کا وائلن بجانا ہی تو مجھے پسند آگیا تھا۔"

"شاید تمہیں علم نہیں کہ وائلن کے تار بلّی کے پوست سے بنتے ہیں اور اس کے گز میں گھوڑے کی دم کے بال ہوتے ہیں۔ غالباً تمہیں جانور پسند ہیں"۔

"ہاں"۔

"تبھی اُسے پسند کرتی ہو۔ چلو واپس چلیں"۔

"نہیں۔ یہاں بیٹھیں گے"۔

ہم برساتی بچھا کر بیٹھ گئے۔

"یہ لہریں کتنی اچھی لگ رہی ہیں، خصوصاً ان کا جھاگ"۔

"ان لہروں کے پیچھے تم سے بڑے مگرمچھ تیر رہے ہیں"۔

مگرمچھ سے ڈر کر اس نے میرا بازو تھام لیا۔

"مجھے سپاہی بہت پسند ہیں۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ مسافر ہوتے ہیں اور چھوڑ کر چلے جاتے ہیں"۔

"مگر جو سپاہی نہیں ہوتے وہ کہیں بھی نہیں جاتے ہمیشہ وہیں کے وہیں رہتے

ہیں"۔

"لیکن سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں"۔

"انہیں ہونا بھی چاہیئے"۔

"اپنے وطن میں تمہاری کوئی محبوبہ ضرور ہوگی۔ ہے نا؟"

"میرا وطن ہر جگہ ہے۔ میرا وطن کرۂ ارض ہے اس لئے کہ میں کسی دوسرے سیارے تک نہیں پہنچ سکتا"۔

"اور محبوبہ؟"

"سپاہی کی محبوبہ نہیں ہوتی۔ اور اتنی چھوٹی لڑکیوں کو ایسے وقت باہر نہیں ہونا چاہیئے"۔

"تم مجھے چھوٹی سی لڑکی سمجھتے ہو۔ میں اُنیس برس کی ہوں"۔

"میں بھی انیس برس کا ہوں"۔

"انیس برس"؟

"انیس برس اور تقریباً ڈیڑھ سو مہینے"۔

ہم ریت پر چلنے لگے۔ وہ جس طرف ہوتی میں برساتی اُسی بازو میں تھام لیتا۔

"یہ برساتی ہم دونوں کے درمیان ہمیشہ رہتی ہے"۔

اگلی شام کو ہم پھر وہیں بیٹھے تھے۔ ہیلن بولی۔ "کل ہم دونوں میٹنوں چلیں گے"۔

"نہیں۔ اب مجھے اٹلی جانا ہے"۔

وہ خاموش ہوگئی

"اگر تم اُداس ہوئیں تو میں سمجھوں گا کہ تم بدستور اُس پر عاشق ہو"۔

"نہیں - بخدا اب مجھے اس کی آتنی بھی پرواہ نہیں - سچ مچ -"

"ہیلن - صرف چند دنوں میں تمہاری پہلی محبت تمام ہوئی - شاید یہ جذبہ اتنا شدید نہ تھا - یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے - اب تم خوب ہنسو کھیلو اور اگلی مرتبہ کسی کام کے آدمی سے محبت کرنا بلکہ بہتر یہی ہوگا کہ خود کسی پر عاشق نہ ہونا، دوسروں کو بے شک عاشق ہونے دینا - ورنہ میں جہاں بھی ہوا خفا ہُوا جاؤں گا۔"

"مگر تم کہاں ہوگے؟"

میں نے ملکِ خُدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست کا ترجمہ کرکے سنایا جو اچھی طرح نہ ہوسکا - ہیلن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا -

"تم فرانس پھر آؤ گے نا؟"

"شاید" کہہ کر میں نے 'وارث شاہ تیرے ساڈے حشر میلے' کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کی لیکن نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے -

"تمہارا بازو کہاں ہے؟ یہ برساتی پھر کہیں سے آگئی۔"

"ہیں، ہیلن او - برساتی - یہ ازلی خون ہے۔"

فرنچ ریویرا سے اٹلی کو سڑک بحیرہ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے ایک طرف چمکدار نیلا سمندر ہے دوسری طرف باغوں سے لدی ہوئی پہاڑیاں جن کی چوٹیوں پر قدیم رومن وضع کے مکان بنے ہوئے ہیں - یہ ساحل پھولوں سے پٹا پڑا ہے - جگہ جگہ ستونوں سے لپٹی ہوئی بیلیں - سیب اور شفتالو کی نوخیز کلیاں، نارنگیوں کے کنج اور سرو کے درخت

دھوپ میں نیلے پیلے آبی سُرخ سفید گلابی پھُول چمکتے ہیں، سمندر سے ہوا کے

خنک جھونکے آتے ہیں تو پودے جھومتے ہیں۔

ایک لمبی سی سُرنگ آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ ایک ہم سفر بھی ہے۔ ہم باتیں کرنے لگے کہ بحیرۂ رُوم نے دنیا کی تاریخ میں کتنا اہم حصّہ لیا ہے۔ اس کے کناروں پر تہذیبیں اُبھری اور مٹی ہیں۔ یہ دُنیا کا حسین ترین خطّہ ہے۔ میرا پروفیسر کہا کرتا تاکہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق پر ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لئے یا تو پہاڑ ہونے چاہئیں یا سمندر کا ساحل اور یا پھر صحرا۔ میدان بالکل بیکار ہیں۔

وہ اُداس ہو گیا۔" یہ علاقہ کبھی علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ دنیا بھر کو ہم نے جینا سکھایا۔ آرٹ۔ ادب۔ رزم۔ سیاست۔ ہم ہر بات میں میرِ کارواں تھے۔ لیکن اب اس تیز مشینی دور میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان ملکوں میں اب سوائے افلاس، غلامی اور سیاسی بے چینی کے اور کچھ نہیں رہا۔"

میں نے موضوع بدل دیا اور اسے اپنی سیاحت کے قصّے سنائے۔ دجلہ و فرات کی وادی پر ہوائی جہاز سے اُڑتے وقت عجب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں، صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوں تو بلندی سے پُرانے شہروں، نہروں اور سڑکوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ اس اجاڑ ویرانے میں کبھی گنجان آبادی تھی۔ بحیرۂ قلزم سے بحیرۂ روم جاتے ہوئے میں نے وہ خلیج بھی دیکھی تھی جہاں مدّوجزر سے بڑی نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ پانی کی سطح نیچی ہوتی ہے تو اِس کنارے سے اُس کنارے تک ایک پایاب راستہ بن جاتا ہے غالباً اسی جگہ سے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر گزرے ہوں گے، پھر فرعون کے گزرتے وقت پانی پُرانی سطح پر آ گیا۔

میں اس علاقے میں بھی رہ چکا تھا۔ جہاں آتش پرستوں کے پیغمبر زرتشت نے

خنک جھونکے آتے ہیں تو پودے جھومتے ہیں۔

ایک لمبی سی سُرنگ آئی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ ایک ہم سفر بھی ہے۔ ہم باتیں کرنے لگے کہ بحیرۂ رُوم نے دنیا کی تاریخ میں کتنا اہم حصّہ لیا ہے۔ اس کے کناروں پر تہذیبیں اُبھری اور مٹی ہیں۔ یہ دُنیا کا حسین ترین خطّہ ہے۔ میرا پروفیسر کہا کرتا تا کہ فنونِ لطیفہ کی تخلیق پر ماحول کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس کے لئے یا تو پہاڑ ہونے چاہئیں یا سمندر کا ساحل اور یا پھر صحرا۔ میدان بالکل بیکار ہیں۔

وہ اُداس ہو گیا۔ "یہ علاقہ کبھی علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ دنیا بھر کو ہم نے جینا سکھایا۔ آرٹ۔ ادب۔ رزم۔ سیاست۔ ہم ہر بات میں میرِ کارواں تھے۔ لیکن اب اس تیز مشینی دور میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان ملکوں میں اب سوائے افلاس، اخلاقی اور سیاسی بے چینی کے اور کچھ نہیں رہا۔"

میں نے موضوع بدل دیا اور اسے اپنی سیاحت کے قصّے سنائے۔ دجلہ و فرات کی وادی پر ہوائی جہاز سے اُڑتے وقت عجب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں، صبح اور سہ پہر کو جب سائے لمبے ہوں تو بلندی سے پرانے شہروں، نہروں اور سڑکوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ اس اجاڑ ویرانے میں کبھی گنجان آبادی تھی۔ بحیرۂ قلزم سے بحیرۂ روم جاتے ہوئے میں نے وہ خلیج بھی دیکھی تھی جہاں مدّوجزر سے بڑی نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ پانی کی سطح نیچی ہوتی ہے تو اِس کنارے سے اُس کنارے تک ایک پایاب راستہ بن جاتا ہے غالباً اسی جگہ سے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر گزرے ہوں گے، پھر فرعون کے گزرتے وقت پانی پُرانی سطح پر آگیا۔

میں اس علاقے میں بھی رہ چکا تھا۔ جہاں آتش پرستوں کے پیغمبر زرتشت نے

تبلیغ شروع کی۔ وہاں اتنی سردی ہوتی ہے کہ آگ کے بغیر جینا مشکل ہے۔ اس خطے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور مذہب نہیں ہو سکتا لیکن صحرا کے باشندوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ رات دن آگ جلا کر بیٹھے رہیں زیادتی ہے۔

"لیکن عیسائیت یہاں سے پھیلی اور دُنیا بھر نے اسے قبول کیا۔ اگرچہ وہ عیسائی جو مذہب کی پرواہ نہیں کرتے سر وج پر ہیں۔ اس لئے کہ روحانیت کی جگہ مادّیت نے لے لی۔ سارے مذہب انسان کو سیدھا رکھنے کے لئے ظہور میں آئے۔ اُسے دہشتناک چیزوں سے ڈرایا گیا۔ خوشنما چیزوں کا للہچ دیا گیا۔ لیکن اب انسان کو ڈر ہے نہ کوئی لالچ۔ اسی دنیا میں اُسے ہولناک چیزیں بھی مل جاتی ہیں اور طربناک بھی دانتے نے دوزخ کی جو تفصیل دی ہے اُسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی ہوگی جیل خانوں، ہسپتالوں اور جنگ کے میدان میں ایسے نظارے عام ہیں۔ شاید بہشت کو بیان کرنے کے لئے اسے تخیّل پر زور ڈالنا پڑا ہو۔ لیکن بیسویں صدی میں تو ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں بہشت کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔"

جنوا پر اُسے اُترنا تھا۔ کولمبس اسی شہر کا باشندہ تھا۔

"کولمبس کو تو آپ جانتے ہوں گے؟" اُس نے پوچھا

"ان کے متعلق سُنا بہت کچھ ہے، کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ویسے میرے جاننے والوں میں سے کئی کولمبس کی طرح ہیں۔ کہیں جا رہے ہوں تو منزل معلوم نہیں ہوتی، پہنچ کر یہ خبر نہیں کہ کہاں پہنچے ہیں۔ واپس آکر یہ علم نہیں کہ کہاں گئے تھے۔"

وہ ہنس پڑا۔

جہاں فرانسیسی ہمیشہ آئن سٹائن کی تھیوری پر غور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اطالوی

مسکراتے ہیں، ہنستے ہیں گاتے ہیں (یہ گانا صرف دور سے بھلا معلوم ہوتا ہے) بے تکلف لوگ ہیں اگر کسی کی زلفیں پسند آگئیں تو اسے ہاتھ سے چھو کر بتائیں گے کہ یہ زلفیں اچھی ہیں بڑے اطمینان سے کسی کے کندھے پر، کہنی یا بازو رکھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ شاید اس توقع پر کہ دوسرا شخص بھی ان کے کندھے پر کہنی ٹیک دے یا غالباً بغلگیر ہو جائے۔ لیکن اگر وہ ہاتھ ہٹا دے تو بجائے معافی مانگنے کے حیران ہوتے ہیں۔

اطالوی رویرا ایش بحیرۂ روم کے ساحل کی آب و ہوا کے جھونکے نظر آتے ہیں۔ میرا پروفیسر کہا کرتا کہ یہ ایسی آب و ہوا ہے جو پندرہ سے ساٹھ سال کے مرد کو سائنٹ ملنے پر اکساتی ہے۔ پروفیسر ایام جوانی میں یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ "آج کل کے نوجوان کیسے ہو گئے ہیں۔ جب میں جوان تھا تو آس پاس کی سب لڑکیاں شام ہی سے گھروں میں قفل لگا لیا کرتی تھیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی کہ میں اپنے دل میں یہ مصرعہ پڑھتا۔ ننگ پیری ہے جوانی میری۔

فلارنس کے گائیڈ نے جلدی جلدی بہت کچھ پڑھ کر سنایا۔ "فلارنس ہی ایسا منفرد شہر ہے جس کی خاک سے بے شمار عظیم آدمی اٹھے۔ دنیا بھر میں یہ فخر سوائے ایتھنز کے کسی اور شہر کو میسر نہیں ہوا۔ مائیکل اینجلو، بوٹی چیلی، بوکیکیو، دانتے، گلیلیو، لیونارڈو ڈاونچی اور میڈیچی فیملی کے افراد۔ یہاں نشاۃ ثانیہ نے جنم لیا۔ میڈیچی فیملی نے فنکاروں کی سرپرستی کی۔ یہاں چمڑے اور شیشے کا کام نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی میڈیچی فیملی کا ہاتھ ہے۔ اس پل پر دانتے نے بیٹرس کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ سامنے میڈیچیوں کا مقبرہ ہے۔"

ہمارا امریکن ساتھی ضبط نہ کر سکا۔ "آج یا تو میڈیچی فیملی رہے گی یا میں۔"

اگلے روز گائیڈ ہمیں مائیکل اینجلو کا ڈیوڈ دکھانے لے گیا۔ وہاں سے آرٹ گیلریاں۔

"یہ سب میڈیچی فیملی کی فیاضی کا نتیجہ ہے۔" وہ بولا۔

امریکن چلایا۔ "میڈیچی فیملی میرے اعصاب پر سوار ہوگئی ہے۔ خدایا اس فیملی نے میری زندگی تباہ کردی، اپنے وطن پہنچ کر میں راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھوں گا میرے پڑوسی یہ چیخیں سنیں گے۔ میڈیچی فیملی! میڈیچی فیملی!"

فلارنس کے لئے یہ فارمولا استعمال ہوسکتا ہے:۔

فلارنس + میڈیچی فیملی = صفر

فلارنس ـ میڈیچی فیملی = ایک خوشنما شہر

کاش کہ وہاں کے گائیڈ اسے استعمال کیا کریں۔

وینس میں ایک موٹر بھی نظر نہیں آتی۔ سڑکوں کی جگہ نہریں ہیں جن میں شکارے چلتے ہیں۔ یہاں کی مال روڈ ایک اچھا خاصا دریا ہے۔ وینس سمندر میں ٹاپوؤں کا ایک جھنڈ ہے جس پر بڑی صناعی سے لکڑی اور پتھر بچھا کر مکانوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

سنگِ مرمر کا یہ شہر کبھی عجوبۂ روزگار تھا۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہاں پہلی ری پبلک وجود میں آئی۔ سب سے پہلا اخبار یہاں جاری ہُوا۔ سب سے پہلا پبلشر بھی یہیں آباد تھا۔ ڈاک کا انتظام پہلے پہل یہیں سے شروع ہُوا۔

یہ رسوائے عالم کنیز آنو دا کا شہر ہے یہاں شیکسپیئر کی ڈیسڈیمونا رہتی تھی۔ اس کا مُور عاشق اوتھیلو (جس کا اصلی نام غالباً عطاء اللہ ہوگا) اس سے ملنے ضرور آتا ہوگا۔

ساں مارکو کے چوک میں کوئی ڈیڑھ ہزار کبوتر ہر وقت موجود رہتے ہیں، یہ کبوتر

بڑے بے تکلف ہیں۔ سر یا کندھے پر اس طرح آ بیٹھتے ہیں کہ لٹھوں سے بھی تو نہیں اُترتے۔

سان کارکو کوئی بہت دُور پہنچے ہوئے بزرگ تھے جو شاید شہید ہوئے ہوں گے کیونکہ اس زمانے میں پہنچے ہوئے بزرگوں کے انتقال کا یہی فیشن تھا۔

ڈوگے محل میں وہ پل ہے جسے بائرن نے آہوں کا پل کہا ہے، لیکن یہ آہیں عاشقوں کی نہ تھیں (جیسا کہ لڑکے لڑکیاں سمجھتے ہیں) بلکہ مجرموں کی تھیں۔

میں ایک جگہ کھڑا اسوال نکال رہا تھا کہ اتنے لیرّوں کے کتنے روپے ہوئے، دو لڑکیاں آئیں۔

"آپ نیپس میں ہمارے ساتھ تھے۔"

"جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔"

"دو اطالوی ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے کل سے پریشان کر رکھا ہے قریب نہیں آتے۔ بس دُور سے گھورتے رہتے ہیں۔"

"تو ابھی اُنہیں بلا لاتا ہوں۔ تعارف کردوں گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "ہم ان سے ملنا تو نہیں چاہتے۔ بس کسی طرح یہ دفع ہو جائیں۔"

"دکھائیے کہاں ہیں۔"

"وہ رہے۔"

دو پستہ قد لمبے لمبے بالوں والے موٹے تازے نوجوان چوروں کی طرح کھڑے تھے۔

"اب ہم ان کا تعاقب کریں گے۔"

ہم تینوں ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ لڑکیوں نے اپنا تعارف کرایا۔ ایک کا نام سوسن تھا یہ ڈچ تھی۔ دوسری غزالہ علافیتی الجیریم کی تھی۔ دونوں جینیوا میں اقوام متحدہ کے کسی دفتر میں کام کرتی تھیں۔

"بطور غزالہ کے تمہاری آنکھیں ہرن کی سی ہونی چاہئیں اور تمہیں تیز بھاگنا چاہیئے"۔

ہم نے رفتار تیز کر دی۔ اطالوی فوراً فرار ہو گئے۔

"ہمیں اطالویوں سے بہت ڈر لگتا ہے، یوں گھورتے ہیں جیسے ابھی کھا جائیں گے۔ تبھی ہم نے رات کو شکارے کی سیر نہیں کی۔ بڑا جی چاہتا ہے لیکن رات کو ڈرتے باہر نہیں نکلتے"۔

"آج شام کو میرے ساتھ چلئے"۔

آٹھ بجے سان مارکو کے چوک میں پہنچا تو وہاں صرف سوسن تھی۔

"غزالہ کہاں ہے؟"

"اس کے سر میں سخت درد ہے"۔

میں سمجھ گیا۔ تین کا ہندسہ اچھا نہیں ہوتا، اس لئے غزالہ ریٹائر ہو گئی۔

ہم شکارے میں نکلے۔ رات کا وینس دن کے وینس سے اس قدر مختلف ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ چاندنی میں دھلی ہوئی عمارتیں، سبزی مائل سمندر، پانی میں روشنیوں کا جھلملاتا ہوا عکس جیسے لاکھوں ستارے ٹوٹ رہے ہوں۔

سوسن کو بائرن پسند تھا۔ وہ نظمیں سنانے لگی۔

"اگر تم مجھے ساتھ نہ لاتے تو میں کبھی یہ چاندنی اور سنگِ مرمر کا طلسم نہ محسوس کر سکتی۔ شاعر ادیب، صنّاع، معمار۔ ہر فن کار اپنے دل میں چھپی ہوئی کسک کا اظہار

چاہتا ہے۔ جب معمار نے سمندر کی لہروں پر سنگِ مرمر سے مختلف نقشیں ترتیب دیں تو اس کا پیغام وینس کی صورت میں ظاہر ہوا۔"

اگلے دن ہم اکٹھے سیر پر نکلے۔ گرجے میں طرح طرح کی چیزیں رکھی ہیں، یونانی مندروں کے ستون، مسجد کا چھوٹا سا گنبد۔ گائیڈ ہمیں بتا رہا تھا کہ وینس کے باشندے آرٹ کے اتنے دلدادہ تھے کہ جہاں کسی ملک میں کوئی نفیس چیز دیکھتے تو اسے اُٹھا کر فوراً وینس بھیج دیتے۔ آرٹ کی خاطر لڑائی یا چوری کسے سے بھی گریز نہ کرتے۔ ہر سال یہاں ایک طویل جشن منایا جاتا۔ آٹھ مہینوں تک خوب رنگ رلیاں ہوتیں۔

"بقیہ چار مہینے باشندے کیا کرتے ہوں گے"؟ ایک طرف سے آواز آئی۔

"آرٹ کے نمونے چرانے نکل جاتے تھے"۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

دوسری شام کو سوسن کے سر میں سخت درد ہوا۔ چنانچہ غزالہ ساتھ گئی۔ اس نے پہلے تو بائرن کی شان میں گستاخانہ جملے کہے کہ اطالویوں کی طرح تعاقب کیا کرتا اور شادی شدہ خواتین کے پیچھے تو تیر کی طرح جاتا تھا۔ پھر یہ خوشخبری سنائی کہ وینس کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں۔ لکڑی گل چکی ہے۔ پُل ہلتے ہیں، مکان آہستہ آہستہ بیٹھ رہے ہیں۔ یہ شہر سخت خطرے میں ہے۔

"دو تین دنوں تک تو شہر تباہ نہیں ہو رہا؟ میں پرسوں جا رہا ہوں"۔

"نہیں ابھی کئی سال لگیں گے۔ پتہ نہیں اطالوی اپنے شہروں کا ذکر کرتے وقت مرنے کا حوالہ کیوں دیتے ہیں۔ فلارنس دیکھئے اور مر جائیے۔ نیپلز دیکھ کر مریئے۔ میرے خیال میں اس شہر کے لئے یہ فقرہ ہونا چاہیئے۔ وینس سونگھئے اور مر جائیے"۔

کشتی چلانے والے کو جو ترنگ آئی اس نے گانا شروع کر دیا، اس کا منہ

میرے دہنے کان سے تقریباً بارہ انچ کے فاصلے پر تھا لہٰذا فوراً سگریٹ دے کر چُپ کرایا۔

دو سگرٹوں کے بعد بھی جب وہ باز نہ آیا تو میں نے عز اکر سے جگہ بدل لی۔

روم میں جگہ جگہ رومیو ملتے ہیں۔

کلیسائے پطرس روم میں ہے بھی اور نہیں بھی۔ سٹیشن روم کا لگتا ہے لیکن ڈاکخانہ واٹیکن کا ہے۔ واٹیکن تیرہ ایکڑ جگہ کا نام ہے جو خود مختار ہے اور بیش قیمت تحائف سے پٹا پڑا ہے۔ یورپ بھر کے شاہی مرید اپنے پیرِ اعلیٰ یعنی پوپ کو بڑی قیمتی چیزیں بھیجتے رہے ہیں۔ سیاح اکثر سوچتے ہیں کہ اگر اطالوی اپنے گرجوں سے سونے چاندی کے بیہ تحفے نکال لیں تو اٹلی کا افلاس آج دُور ہو سکتا ہے۔

کولوزیم ایک قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے یہاں کتنے انسانوں کا خون بہا ہوگا لیکن رات کو یہ جگہ اور طرح کی معلوم ہوتی ہے۔ گمان تک نہیں ہوتا کہ کبھی یہاں لاکھوں خون کے پیاسے تماشائی جمع ہوتے ہوں گے اور جان لیوا مقابلوں میں شریک ہونے والوں کی یہ پکار اس عمارت میں گونجتی ہوگی۔ "اے شہنشاہ ہم جو کہ بہت جلد مرنے والے ہیں تجھے سلام کرتے ہیں۔"

سات پہاڑیوں کا پُرانا روم تباہ ہو چکا ہے۔ کہیں کہیں کھنڈر رہ گئے ہیں۔ موجودہ شہر زیادہ پُرانا نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے ہر تاریخی عمارت کے ساتھ دو ندہبی میوزیم اور چھ گرجے بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔

وہ میزاب بھی رکھی ہے جس پر حضرت عیسٰی نے آخری کھانا کھایا۔ وہ سیڑھیاں بھی ہیں جن کو طے کر کے وہ صلیب تک پہنچے۔ لوگ ان سیڑھیوں پر گھٹنوں کے بل چڑھتے

ہیں اور دیکھنے والا ڈرتا رہتا ہے کہ یہ اب گرے اب گرے۔

اٹلی کو اپنے آرٹ پر سدا فخر رہا ہے۔ 'دنیا کی تخلیق' نقاشی کی زبردست مثال ہے مائیکل اینجلو نے حضرت آدم و حوا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی تصویر بھی بنائی ہے۔

واٹیکن میں متبرک چیزوں کے علاوہ برہنہ مجسمے بھی ملتے ہیں۔ برہنہ تصویریں اور مجسمے بنانا بڑا مشکل سمجھا جاتا تھا۔ انہیں وہی آرٹسٹ بنا سکتے تھے جو علم الابدان کے ماہر ہوں جو اس علم سے ناواقف تھے وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے انہیں کپڑے پہناتے تھے۔

تین دن میں گائیڈوں سے بچتا رہا۔ پیازہ وینیسیا میں کھڑا تھا کہ ایک گائیڈ نے مجھے آ لیا۔

"وہ دیکھئے۔ اُس بالکنی سے مسولینی ہجوم کو مخاطب کیا کرتا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"جب ہٹلر روم میں آیا تو بجلی کا ایک لیمپ بھی نہ جلا۔ لوگ مشعلیں ہاتھ میں لئے پھر رہے تھے۔ سارا شہر تاریک تھا، صرف مشعلوں کی روشنی تھی۔ ایسی رات پھر روم میں کبھی نہ آئے گی۔"

"روم میں کیا کسی شہر میں نہ آئے گی سوائے اڈنبرا کے۔"

"جولائی کا مہینہ جولیس سیزر کے نام پر ہے۔"

"بالکل درست ہے۔"

"اور اگست شہنشاہ آگسٹس کے نام پر۔"

اگلی صبح اٹھا تو میری توبہ ٹوٹ چکی تھی۔ میں دوسرے سیاحوں کے ساتھ بس میں بیٹھا ہوا تھا اور گائیڈ ہمیں ہدایات دے رہا تھا ایک جگہ بس رُکی۔

"اتر یئے"! گائیڈ نے ہمیں حکم دیا۔

ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے امریکن نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "اب یہ کیا دکھائے گا؟"
"حضرت موسیٰ کا مشہور مجسمہ" وہ بولی۔

بوڑھے نے کھڑکی سے ڈیڑھ سو سیڑھیاں دیکھیں جنہیں ہم سب کو طے کرنا تھا۔ اور سگار کا کش لگا کر بولا۔ "تم دیکھ آؤ۔ میرے خیال میں حضرت موسیٰ کے بغیر میرا گزارا ہو سکتا ہے۔"

نیپلز کے سٹیشن پر کمولا منتظر تھا۔ بازو پھیلائے آیا اور مشرقی انداز میں لپٹ گیا۔

"امی کو۔ امی کو" (میرے عزیز دوست) اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دوران جنگ میں وہ اطالوی فوج میں تھا۔ افریقہ کے صحرا میں گرفتار ہوا۔ دو تین مرتبہ میں نے اس کا علاج کیا۔ پھر اتفاق سے میرا تبادلہ قیدیوں کے کیمپ کے ہسپتال میں ہو گیا جہاں وہ بھی تھا۔ اس سے دوستی ہو گئی۔ جنگ کے بعد اس نے اٹلی سے خط وکتابت جاری رکھی۔ نیپلز پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کاؤنٹ ہے نصف سے زیادہ شہر کا مالک ہے۔

اس نے ایسی خاطر مدارت کی کہ الف لیلیٰ کی راتیں یاد آگئیں۔ جنوں اور پریوں پر دوبارہ اعتقاد ہو گیا۔ نیپلز کی خوشنما خلیج کے کنارے چاندنی رات میں ایک مشہور فنکار نے پیانو پر مون لائٹ سوناٹا بجایا۔ آدھی آدھی رات تک بادبان والی کشتیوں میں سمندر کی سیر ہوتی، پھر محفلِ رقص و سرود جمتی۔ رات کو تین بجے سو کر صبح اٹھتا تو بالکل وہی بیزار خود ہوتا جو علی الصبح شوہر بیمار کا ہوتا ہوگا۔ ضیافتوں پر مجھے اطالوی لڑکیوں سے ملایا جاتا۔

ایک لڑکی کا نام Mariza تھا۔ ہم نے کمولا کے کان میں کہا۔ "تم اتنے دن مشرق بیمار رہے اور مریضہ کے معنے نہ آئے۔ یہ لفظ بیماروں کے لئے استعمال ہوتا

ہے۔"

دوسری سے تعارف ہوا۔ روز آلبا۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح تھا۔

"اس کے معنے تو ٹھیک ہیں نا؟" کموّلا نے کان میں پوچھا

ایک نہایت مرنج ومرنجان اور بیزار قسم کا آدمی ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ہم رقص کر رہے تھے اُس کی نگاہیں ہم پر تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اُلجھن سی ہونے لگی۔

"کون ہے یہ؟"

"روز آلبا کا منگیتر۔ تم اس کی ذرا پرواہ نہ کرو۔ یہ ہمیشہ یونہی رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے۔ روز آلبا اسے جوتی کی نوک پر نہیں لیتی۔"

وہ کاؤنٹس سے پوچھ رہی تھی کہ میرا قیام کتنا ہے۔ پانچ چھ روز سُن کر اس نے افسوس میں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ بھلا پانچ چھ دنوں میں کیا ہو سکتا ہے۔

کموّلا، کاؤنٹس، روز آلبا اور میں۔ چاروں اگلے روز باہر گئے۔ وسوویس پہاڑ کے دامن میں میرے دوست نے موٹر ٹھہرائی اور ہمیں دو بندوقیں دیں۔

"یہ کس لئے ہیں۔ ان سے ہم ایک دوسرے کو کیا کریں؟" میں نے پوچھا

"روز آلبا کو کبوتر کے شکار کا شوق ہے۔ جنگل میں جا کر شکار کھیلو۔ شام کو میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

میں نے بتیرا کہا کہ بھلا اطالوی کبوتروں نے میرا کیا بگاڑا ہے کہ میں انہیں کچھ کہوں لیکن وہ ہمیں چھوڑ گیا۔ وہ میرے وطن کے متعلق سوال پوچھنے لگی۔ میں نے پاسپورٹ نکال کر دے دیا کہ اس میں سب کچھ لکھا ہے۔ پڑھ لو تصویر دیکھتے ہی اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"تم جنگ میں لڑتے تھے؟"

"ہاں۔"

"تم نے کتنے اطالوی مارے؟"

"چھ سات تو گنے تھے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ نہیں۔"

غصے سے اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔

"تم لڑنا چاہتی ہو۔ یہ رہی بندوق۔ ورنہ تمہارا غصہ اس غریب منگیتر پر اترے گا۔"

منہ پھیر کر وہ دور جا بیٹھی۔

"اے وطن پرست حسینہ! پاسپورٹ کا دوسرا صفحہ بھی پڑھو۔ ڈاکٹر ہلاک نہیں کیا کرتے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ علم ہوتا کہ یہاں کی لڑکیاں ایسی خونخوار ہیں تو کبھی اطالویوں کو نہ چھوڑتا۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میرا منگیتر جنگ میں مارا گیا تھا۔"

"تمہارے کتنے منگیتر ہیں؟"

"اصلی منگیتر وہی تھا۔"

"تو گویا یہ اسسٹنٹ منگیتر ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔

"لیکن جنگ کو تم نے سنجیدگی سے ہرگز نہیں لیا۔"

"غالباً تم صحیح کہتے ہو۔ تم آرٹسٹ ہیں سپاہی نہیں۔ پچھلی جنگ میں ہمارے ہاں دو فریق تھے۔ رجائی کہتے تھے ہم یہ جنگ ضرور ہاریں گے۔ قنوطی کہتے۔ درست ہے مگر کب؟"

ہم سرو کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ خوشگوار دھوپ میں ساری وادی

نقرئی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ سامنے نیلا سمندر تھا۔

"بارش تو نہیں ہو رہی جو برساتی پہن رکھی ہے"۔

"شاید ہونے لگے۔ میں قنوطی فریق سے ہوں"۔

"تم اسے ہر وقت ساتھ رکھتے ہو"؟

"اسی کو سیر کرانے کے لئے تو میں خود مارا مارا پھرتا ہوں۔ تم نے گونج سُنی"؟ میں بظاہر چونکنا ہو گیا۔

"نہیں تو"۔ وہ ڈر گئی۔

"یہ وسووئیس کی گڑگڑاہٹ تھی۔ ابھی پہاڑ پھٹے گا اور لاوا بہنے لگے گا۔ وہ دیکھو ایک آدمی بھاگا جا رہا ہے"۔

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی

"تم تو کبوتروں کا شکار کرتی ہو۔ ایک معمولی سے پہاڑ کی کیا وقعت ہے۔ ہم یہاں سے نہیں ہلیں گے"۔

کافی دیر کے بعد اُسے یقین آیا کہ گونج وُونج کچھ نہ تھی۔

سورج ڈوبنے لگا تو آسمان سُرخ ہو گیا۔

اس نے برساتی پر اپنے نام کے پہلے حروف لکھے۔ "جب انہیں دیکھو گے تو روز آبا یاد آ جائے گی"۔

کموَلا بہت دیر میں آیا۔ مجھے چھیڑنے لگا۔ "اسے کیونکر رام کیا۔ یہ تو بے حد غصیل اور گستاخ لڑکی ہے۔

"بزرگوں کی دعا سے"۔ میں نے جواب دیا۔

رات کو میں نے خواب دیکھا کہ سامنے روزآلبا کھڑی ہے متناسب جسم شگفتہ حسین چہرہ اور دلآویز مسکراہٹ۔ پھر جیسے اُس کا جسم بڑھنے لگا۔ بازو پھولتے گئے۔ گردن غائب ہو گئی، ایک ٹھوڑی کی جگہ دو ہو گئیں۔ وہ پھیلتی گئی حتیٰ کہ میٹرن معلوم ہونے لگی۔

صبح کموَلا سے پوچھا۔ وہ بولا "یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ اطالوی سینوَرینا کے پاس سب کچھ ہے۔ حُسن، تمازت اور کشش۔ لیکن ان پر فربہی بہت جلد آتی ہے۔ شاید یہ زیتون کے تیل کا اثر ہے یا آرام پسند زندگی کا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ یہاں کھانا بہت لذیذ ہے۔ سات کورس کا ڈنر۔ اس کے بعد بیرہ چپکے سے پوچھتا ہے۔ کچھ اور لاؤں؟

"لیکن شہروں کے باہر بڑی غربت ہے۔ ہم لوگ مفلس ہیں۔ ہمارے ہاں اتنی بھوک ہے پھر بھی عورتوں کی فربہی جوں کی توں ہے"۔

"افلاس کے لئے حکومت کچھ نہیں کرتی"؟ میں نے پوچھا

"کون سی حکومت! ہر مہینے تو یہاں حکومت بدلتی ہے۔ فرانس کی طرح ہم بھی بار بار حکومت تبدیل کرتے ہیں تاکہ ہر شخص کو موقع مل سکے اور ری پبلک کے معنے ہر خاص و عام پر واضح ہو جائیں۔ ہماری کرنسی کی کوئی قدر نہیں۔ پاؤنڈ کے بیس پچیس لیرے ہوا کرتے تھے اب سترہ سو ہیں۔ بجائے بٹوے کے لوگ کلپ میں نوٹوں کو دبا کر رکھتے"۔

لیروں کے ذکر پر مجھے کچھ تحفے یاد آ گئے جنہیں میں خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے دوست کے سامنے خریدتے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ قیمت ادا کرنے پر اصرار کیا کرتا۔

بہانہ کر کے میں دکان میں گھس گیا۔ باہر نکلتے وقت شاید دوسری گلی میں چلا گیا اور راستہ بھول گیا۔ کچھ دیر سڑک پر چلا پھر کموَلا کی آواز سنائی دی۔

"تم نے اتنی دُور سے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا"؟

" اطالویوں کے ہجوم میں تمہارا چہرہ اور کندھے دُور سے نظر آجاتے ہیں۔ تم سوچتے تو ہو گے کہ یہ خوشس باش اور آرام طلب قوم عظیم رومنز کی اولاد کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ رومن جو کبھی دنیا کے مالک تھے۔ مسولینی کو وہم تھا یا خوشش فہمی وہ ہمیں پرُانے رومن سمجھتا تھا تاریخ گواہ ہے کہ ایک انسان چند لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لئے بیوقوف بنا سکتا ہے لیکن سب کو زیادہ دیر تک نہیں۔ اب ہمارا مقولہ ہے۔ ڈولچی فی آرے فی انتے۔ دیکھو نہ کرنا کس قدر خوشگوار ہے"۔

مجھے ایک مصرعہ یاد آگیا۔ ؎ جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔ شاید ہم بھی اسی سنہرے اصول پر کاربند ہیں۔

"یہ تم بیٹھے بٹھائے فلاسفر کیوں بن گئے"؟ میں نے کہا۔ "آؤ حُسنِ یار کی باتیں کریں"۔

پامپی آئی حضرت عیسٰی کی پیدائش سے پہلے سمندر کے کنارے آباد تھا۔ ایک رات وسووئیس پھٹا یہ شہر اور ہرکولینیم دونوں لاوے میں دب گئے۔ پیّہ اور سپرنگ جو دورِ جدید کے دو سب سے اہم آلے سمجھے گئے ہیں پامپی آئی میں استعمال ہوتے تھے۔ آج کل سردی گرمی کے بچاؤ کے لئے دوہری دیواروں کے مکان بنائے جاتے ہیں۔ پامپی آئی میں بھی دیواریں دوہری ہیں۔ ان میں پائپ لگے ہوئے ہیں اور سائفن بھی۔

پتھر کی سڑکوں پر رتھ کے پہیوں کے نشان ہیں۔ ریل کی لائنوں کا عرض ان نشانوں کے عرض سے لیا گیا ہے۔ چونکہ اس شہر کو لاوے نے تباہ کیا تھا انسان نے نہیں اس لئے کھدائی میں سب کچھ جوں کا توں ملا۔ دیواروں پر الیکشن کے اشتہار ہیں۔ فلاں کو ووٹ دیجئے۔

اس فقرے کو مخالف پارٹی نے کاٹ کر نیچے لکھ دیا ہے۔ نہیں فلاں صاحب کو ووٹ دیجیے۔ مکانوں پر خوش آمدید۔ کتے سے خبردار رہیے۔ یہاں پارک کرنا منع ہے۔ اور دیگر نوٹس ہیں۔ ہسپتال کے قریب کی سڑکیں رتھوں کے لیے بند ہیں۔

شیشے کے برتن، سونے کے زیورات، جراحی کے نازک آلے۔ ڈھائی ہزار سال میں حالات کچھ زیادہ نہیں بدلے۔

رات کی ضیافت نائٹ کلب میں ہوئی۔ کموَلا مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ یکایک ایک شعلہ سا لپکا اور نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ کموَلا اسے لینے گیا۔ لیکن وہ مڑی اور دوسرے گروہ میں شامل ہوگئی جہاں کسی اور کی پارٹی ہو رہی تھی۔

یہ گراسی آلدہ تھی۔ لیکن نہ خوش اور نہ مہربان۔

غیظ و غضب سے کموَلا کانپنے لگا۔ اطالوی بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔

"میری زبردست توہین ہوئی ہے۔ اسے میں نے بلایا تھا لیکن مخالف فریق نے ہتھیا لیا۔ ان میں میرا پرانا دشمن بیٹھا ہے جس نے دانستہ طور پر مجھے زک پہنچائی ہے۔"

"نہیں آتی تو نہ سہی۔ لعنت بھیجو ان سب پر۔"

"نہیں! وہ مردود اس لڑکی پر عاشق ہے۔ اٹلی کا ہر مالدار شخص اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میرے عزیز دوست، ایک کام کرو۔ کسی طرح اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔"

میں نے سوچا کہ ہماری تاریخ میں کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ بھرے سوئمبر سے کوئی سورما لڑکی کو بھگا کر لے گیا اور لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔ بعد میں تو لڑکیوں اور سورماؤں کو

عادت سی پڑ گئی تھی اگر کوئی سوئمبر خیریت سے تمام ہوتا تو لڑکی اسے اپنی ذاتی توہین سمجھتی۔

مکولا اصرار کرنے لگا۔ میں ہال عبور کر کے دوسرے گردہ میں پہنچا اور گراتسی آلدہ کو رقص کے لئے کہا۔ وہ مسکرا کر اٹھی۔ رقص کے اختتام پر میں اُسے چھوڑ آیا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہُوا۔ تیسری دفعہ بھی اُسی کے ساتھ ناچا۔ وہ لوگ بھی مجھے دیکھ دیکھ کر عادی سے ہو گئے۔ چوتھی مرتبہ جب رقص ختم ہُوا تو میں نے اس کا بازو تھام لیا۔

"چلئے، مکولا منتظر ہے"۔

"لیکن وہ۔۔؟" گراتسی آلدہ نے ایک پلے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ جائے جہنم میں۔ آپ ہماری مہمان ہیں"۔

اس کے آتشیں ہونٹ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تڑپتی مچلتی حسینہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ اتنے میں ایک چھوٹا سا مسافر بہ آدمی تیزی سے ہماری طرف آیا اور گراتسی آلدہ سے کچھ کہنے لگا۔

"آپ مجھ سے گفتگو کیجئے۔ خاتون میرے ساتھ ہیں"۔ میں نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

مکمل خاموشی چھا گئی۔ ہجوم کی نگاہیں ہم تینوں پر تھیں۔

وہ بڑی تیزی سے بولنے لگا۔ اس نے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے میں نے جھٹک دیا۔

"آپ مجھ سے بات کیجئے"۔ میں آگے بڑھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے سر اُوپر اُٹھا کر قہر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر سوچ کر واپس چلا گیا
"میرے دوست، تم نے آج میری آبرو رکھ لی"۔ کمولا مجھ سے لپٹ گیا۔ "سارے نیپلز کے سامنے میں نے اسے شکستِ فاش دی ہے"۔

محض اغیار کے سینوں پر مونگ دلنے کے لئے میں نے بار بار گراتسی آلدہ کے ساتھ رقص کیا۔

کھانے کے بعد کمولا میرے کان میں بولا۔ "یہ تمہارے ساتھ سورنتو کی سیر کرنا چاہتی ہے"۔

"کب؟"

"اسی وقت"

"دوست، تم مجھے مخمصوں میں پھنساتے ہو۔ ابھی اس آدمی سے لڑائی ہوتے ہوتے بچی ہے۔ کون تھا وہ؟"

"یہ F i AT کمپنی کا اہم کارکن ہے"۔

وطن میں تین برس تک میں نے فی آٹ کار چلائی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ ابھی اپنی کار کے صانع سے لڑنے لگا تھا۔

"مگر میں یہاں تم سے ملنے آیا ہوں نہ کہ لڑکیوں کی ایک پلٹن سے"۔

"ضد نہ کرو۔ یہ رہی کار کی چابی"۔

بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ نیلے سمندر میں زرد، سُرخ، سبز، گلابی روشنیوں کے عکس اتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے کہ کچھ دیر کے لئے میں ساتھ بیٹھی ہوئی گراتسی آلدہ کو بھول گیا۔ میرے ذہن میں وہ کہانیاں پھر رہی تھیں

جو سوئٹزرلینڈ، راؤبو، اُلّفی سے وابستہ ہیں۔ کار ٹھہرا کر ہم ایک اُونچی سی چٹان پر بیٹھ گئے۔

"تم خوب جانتی ہو کہ بے حد حسین ہو۔ پھر یہ عشوے اور غمزے کس لئے ہیں؟"

"مجھے مضبوط اور پُروقار مرد پسند ہیں۔ تمہاری جرأت پہلے تو بُری لگی پھر میں نے اسے سراہا۔ اپنے اُوپر تمہیں کس قدر بھروسہ ہے۔ لیکن تمہارے دوست کو اتنی ہمت کیوں نہ ہوئی؟"

"اپنے دوست کے خلاف میں ایک لفظ سُننا نہیں چاہتا۔"

اس نے بازو اُٹھا کر انگڑائی لی۔ سیاہ زلفوں کی ایک لٹ ماتھے پر آن گری دو ساحر آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے سُنا ہے کہ تمہارے حُسن میں ایسا جادُو ہے کہ لوگ دل تھام کر رہ جاتے ہیں لیکن تم کسی کو قریب نہیں آنے دیتیں۔ سب کو ترساتی ہو۔"

"نہ جانے کیوں مجھے اس میں لطف آتا ہے۔ جس مرد کو چاہو غلام بنا لو۔ یہ کیسا مخمور کن خیال ہے۔ ذرا سی مُسکراہٹ۔ پیار بھرا بول معمولی سی ادا سے مرد یوں شل ہو کر رہ جاتے ہیں جیسے ان پر بجلی آن گری ہو۔ کتنی خود اعتمادی محسوس ہوتی ہے کہ جیسے ان کی قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہو۔ بس اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔ شکار کو گھیر کر شکاری بھی تو یہی محسوس کرتا ہے"۔

"تو مجھے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیئے۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اُن مردوں میں سے نہیں ہو جن کے دل میں عورت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔"

"گرو قعت ہونی چاہیئے۔ عورت ایک بے بس ناسمجھ بچے پر اپنی زندگی ضائع کرکے اُسے مرد بناتی ہے۔ کنبے کی پرورش میں عورت کا کردار نہایت اہم ہے۔ تخلیق و تربیت میں اس کے فرائض بڑے کٹھن ہیں۔ مرد کی حیثیت ایک آنریری ممبر کی سی ہے۔ چنانچہ یہ مرد ہی ہے جو جنگیں فتح کرتا ہے۔ نئے افق تلاش کرتا ہے۔ اونچے پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ نئی نئی ایجادات، نت نئے کارنامے، ادب، شاعری سیاست یہ سب مرد کے ہیں اس لئے کہ وہ آزاد ہے اور اس کے پاس زیادہ وقت ہے"۔

"سنا ہے تمہارے ملک میں پردے کا رواج ہے"۔

"ہاں"۔

"مجھے پردہ بہت پسند ہے۔ اس کے لئے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا اپنے بندوں سے پردہ کرتا ہے۔ مغرب میں عورت اپنا وقار کھو چکی ہے۔ اُسے معاشی آزادی میسر ہے۔ وہ فیکٹریوں، دفتروں اور دکانوں میں کام کرتی ہے لیکن اب اس کا گھر نہیں ہے۔ اٹلی کو مذہب لے کر بیٹھ گیا۔ یہ مذہب طلاق کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جس کا جو جی چاہے کرتا ہے کوئی باز پرس کرے تو اُسے بھی ترغیب دیتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کرو۔ ان دنوں میرے پیچھے بے شمار شادی شدہ مرد لگے ہوئے ہیں۔ ایک دن تمہارا دوست"۔

"میرے دوست کو بیچ میں مت لاؤ اور یہ بتاؤ کہ یہ سحر طرازی کا یہ پروگرام کب تک جاری رہے گا"؟

"میں پچیس برس کی ہوں۔ شاید پندرہ برس اور حسین رہوں۔ پھر بڑی بوڑھیوں کی طرح رہا کروں گی"۔

"اچھا تو میں سولہ برس کے بعد تم سے ملوں گا۔ تب تک خطرہ دُور ہو چکا ہوگا"

"اگر اگلے سال میں تاجپوشی دیکھنے لندن آئی تو تم ملو گے؟"

"ملوں گا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ میں مزدور آدمی ہوں۔ اب چھٹی ہے تب کام ہوگا۔"

اس نے پھر انگڑائی لی اور اُف کہہ کر کلائی تھام لی۔

"کیا ہُوا؟"

"چُوڑی ٹوٹ گئی۔ خون نکل آیا۔"

برساتی پر خون کے دو قطرے گر گئے جنہیں رومال سے پونچھا مگر نشان نہ گیا۔ اس نے برساتی پہ وہ حروف نہ جانے کیسے پڑھ لئے۔ مچل گئی۔ "یہ اُس ڈائن روزالبا نے لکھا ہے۔"

وہ پتھر سے حروف کھرچنے لگی۔

شہنشاہ ٹائبیریس نے دنیا پر حکومت کرنے کے لئے کیپری کو صدر مقام چُنا تھا اس کا انتخاب غلط نہ تھا۔ کیپری دنیا کا سب سے خوشنما جزیرہ ہے۔ ایک نیلی سی دُھند یہاں ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ کوئی رنگ ایسا نہیں جو یہاں نہ ہو۔ سمندر کا رنگ، پہاڑیوں کا رنگ آسمان کا رنگ، باغ، عمارتیں، پھُول، لباس،۔ ہر چیز رنگین ہے۔

سب سے حسین چیز بلو گراتو (نیلا غار) ہے جس کا واحد راستہ سمندر سے ہے اور راستہ تنگ ہے کہ کشتی میں لیٹ کر داخل ہوتے ہیں۔ غار کے منہ سے روشنی اندر آتی ہے۔ جو نیلے پانی میں سے گزرتے ہوئے رنگی جاتی ہے۔ اندھیرے میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بہت بڑا نیلم جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ لوگ مبہوت رہ جاتے ہیں کشتیاں بار بار ٹکراتی ہیں باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ ملاح کھینچ کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔

ہم واپس جا رہے تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔ "ٹھہرو! اس نے بالکل اس طرح نعرہ لگایا جیسے ہماری فلموں میں ایک آدمی ہمیشہ پکارتا ہے۔ "ٹھہرو یہ شادی نہیں ہو سکتی"۔

اس کے ہاتھ میں کوئی سبز چیز تھی۔ میری برساتی۔

اچھی جگہوں پر یہ خود بخود رہ جاتی ہے یا تو شرارتی ہو گئی ہے یا اسے سکاٹ لینڈ کی آب و ہوا پسند نہیں۔

رات کی محفل میں گانا بجانا خوب زوروں پر تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص اپنے سیاہ لباس پہ امتیازی نشان لگائے آیا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"معاف کیجیے۔ سینورا آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں"۔

میں اب اس قسم کی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔

"چلیے"۔ میں اُٹھ کر ساتھ ساتھ ہو لیا۔

سامنے ایک نوعمر لڑکی ہیرے جواہرات پہنے مُسکرا رہی تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو خاوند غائب تھا۔

میں اور وہ اکیلے رہ گئے۔ وہ سسلی سے آئی تھی اور انگریزی نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ چھوٹے موٹے الفاظ کے علاوہ دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

وہ بے حد خوبصورت تھی۔ رخسار پر ننھا سا تل تھا اور چہرے پہ بلا کی معصومیت کانوں میں ہیرے کے آویزے۔ گلے میں بیش قیمت ہار۔ سر پہ جڑاؤ

بار بار وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی لیکن شدھ اطالوی زبان میں۔ ویسے جب اطالوی باتیں کرتے ہیں۔ تو ان کے چہرے کے اظہار اور ہاتھوں کی جنبش سے بہت کچھ اندازہ

ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ حسین لڑکی نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں صرف اتنا سمجھ سکا۔ آج رات گیارہ بجے۔ پامپی آئی کی سڑک۔

کمولا مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا رائے دے گا۔

اس کا خاوند کافی دیر کے بعد آیا۔ چلتے وقت اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ بھولنا مت۔ ضرور آنا۔

پونے گیارہ بجے میں نے برساتی اوڑھی۔ کمولا کی کار لے کر پامپی آئی کی طرف چل دیا۔ لیکن سوچ رہا تھا جاؤں یا نہ جاؤں۔ برساتی کی طرف دیکھا۔ اس کے کالر لٹک رہے تھے۔ سلوٹیں سی پڑی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے برساتی خوش نہیں ہے بلکہ کہہ رہی ہے۔ میاں تم سیاح ہو۔ ان الجھنوں میں مت پڑو۔ سب کچھ دور دور سے دیکھو اور اپنا راستہ لو۔

اچھا نہیں جاتا۔ میں واپس لوٹ آیا۔

نیپلز سے روانگی کے وقت کمولا کہنے لگا۔ " اگلی مرتبہ زیادہ چھٹی لے کر آنا۔ ہم دونوں سسلی چلیں گے:" گاڑی کی گھنٹی بجی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

" امی کو۔ پھر ضرور آنا"

سوئیٹزر لینڈ کو یورپ کی تفریح گاہ کہتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کون سی تفریح؟

یہاں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ رنگ برنگے پھول ہیں۔ وسیع سرسبز وادیاں نیلی جھیلیں، سب کچھ ہے مگر یہ نظارے اپنے آپ کو اس باقاعدگی سے دہراتے

ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کے تیس چالیس میل دیکھ لینا سارا ملک دیکھ لینے کے مترادف ہے۔

یہاں اصلی سوئس بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ملک کے تین حصے ہیں۔ جنوبی حصے میں یہ معلوم ہوتا ہے گویا ابھی تک اٹلی ہی میں قیام ہے۔ شمالی حصے میں جرمنی اور مغربی حصے میں فرانس یاد آتے ہیں (مشرقی حصے میں کچھ یاد نہیں آتا) یہاں ایک چیز سے جی بھر جاتا ہے ایک دکان میں بلی دیدے مٹکا رہی ہے۔ یہ گھڑی کا ہے۔ ایک جگہ چوہا ناچ رہا ہے یہ بھی گھڑی ہے۔ وہ چیز جو قلمدان معلوم ہوتی ہے۔ دراصل گھڑی ہے۔ ہر جگہ گھڑیاں ہی گھڑیاں ہیں۔ لمبوتری، مخروطی، مستطیل، مربع، گول، تکونی۔ اپنی گھڑی سے نفرت ہو جاتی ہے۔

اونچے ایلپس گھٹاؤں کو اندر نہیں آنے دیتے۔ وادیوں میں دھوپ رہتی ہے۔ لیکن گھٹا اندر آ جائے تو یہ پہاڑ باہر نہیں نکلنے دیتے۔ چنانچہ ہفتوں بارش ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں ان فلک بوس پہاڑوں کو ہینی بال نے ایک کثیر فوج اور سینتیس ہاتھیوں سمیت عبور کیا تھا۔ اٹلی پہنچ کر اس نے فوج گنی تو معلوم ہوا دشوار گزار راستوں میں ہزاروں سپاہی ہلاک ہو چکے تھے لیکن ہاتھی پورے سینتیس کے سینتیس موجود تھے جیسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ہینی بال بذاتِ خود ہاتھی پر سوار تھا۔ لہٰذا ہاتھیوں کے طفیل سے بچ گیا۔

ہمسنو سے جھیل عبور کر کے پہاڑی ریل کے ذریعے رگی کی چوٹی پر پہنچا۔ دیر تک تصویریں اتارتا رہا۔ چوٹی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ برساتی پھر غائب ہے۔ مجھے کچھ اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کچھ برساتی پر۔ اب اسے چھوڑ جاؤں گا۔

اگلی بوٹ والوں سے ملا۔ انہوں نے پہاڑی ریل کے چھوٹے سٹیشن کو فون کیا۔ کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو اونچا سا درخت ہے اس کے نیچے ایک برساتی پڑی ہے جواب آیا۔ برساتی بالکل وہیں رکھی ہے، تہہ کی ہوئی۔

ٹرین چلنے سے دس منٹ پہلے ایک آدمی برساتی لے کر سٹیشن پر پہنچا۔" جناب بہت اچھا ہُوا کہ یہ مِل گئی ورنہ آپ سمجھتے کہ سوئیٹزرلینڈ والوں نے چُرالی"۔

لندن پہنچا۔ اگلے روز ملکہ کی گارڈن پارٹی پر مدعو تھا۔ میرے پُرانے افسرِاعلیٰ نے ملکہ اور ڈیوک سے ملایا جنہوں نے وطن اور عزیزوں کے متعلق باتیں کیں۔

جب میں جوکیا کو روم کے گرجوں کی باتیں سنا رہا تھا تو وہ بار بار پوچھتی۔" مگر ملکہ نے اور کیا کیا سوال کئے؟ شہزادی مارگرٹ کا لباس کیسا تھا؟ ڈیوک کیسے معلوم ہو رہے تھے"؟

اڈنبرا میں لڑکے لڑکیوں نے اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا کہ وہ مختصر سی گفتگو جو شاہی خاندان کے افراد سے ہوئی تھی مجھے مہینوں دہرانی پڑی۔ لیکن جوکیا کو میں نے دام کی ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ اس کے عقیدے ڈگمگانے لگے اور آخر اس نے مذہب تبدیل کر لیا۔ وہ رومن کیتھولک سے پروٹسٹنٹ بن گئی۔

میں چونکا۔ گھڑی دیکھی۔ اُفوہ کتنی دیر ہو گئی ہے، ابھی بہت سفر باقی ہے۔ دن چھوٹے ہو گئے ہیں۔ چھ بجے ہی اندھیرا ہو جائے گا۔ اب اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی۔ جاگتے میں خواب دیکھنا بہت بُری عادت ہے۔ قصّہ سوتے جاگتے کا تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ کل نو بجے لندن میں آپ کا پہلا لیکچر ہے، پانچ بجے تک کلاسیں ہوا کریں گی۔ رات کو آموختہ یاد کیجئے گا اور پانچ چھ گھنٹے سو کر رات گذری نور کا تڑکا ہوا۔ ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا۔ میں برساتی لے کر اُٹھا اور کار میں بیٹھ گیا۔

دس پندرہ میل گیا ہوں گا کہ ایک شخص نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں رُک گیا۔

"کہاں چلو گے؟"

"جہاں لے چلو۔"

"لندن؟"

"ہاں۔"

میں نے اُسے بٹھالیا وہ میرا ہم عمر تھا۔ عقابی آنکھیں۔ ورزشی جسم۔ مُسکراتا چہرہ۔ اس کے پاس صرف ایک چمڑے کا صندوق تھا۔

"یہ صندوق سامان کے ساتھ رکھدیں؟" میں نے پوچھا

"نہیں۔ اسے میں اپنی گود میں رکھ لوں گا۔"

صندوق پر بے شمار لیبل لگے ہوئے تھے۔ وی آنا، روم، زیورچ، برلن، کوپن ہیگن فرینگ فرٹ۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام جیرلڈ ہے۔ کینیڈا کا رہنے والا ہے، پچھلی جنگ میں ہوا باز تھا۔ قریب ہی ایک کیمپ میں ایک ماہ کے لئے ہوا بازی کی ٹریننگ کے واسطے آیا تھا۔ اب ملازمت کی تلاش میں لندن جا رہا ہے۔

"کینیڈا میں آٹھ برس سے نہیں گیا۔ وہاں تھوڑی سی زمین ہے اس کی آمدنی پر گزارا ہے۔"

"تو زر زمین زن میں سے تمہارے پاس ایک چیز موجود ہے۔"

میں نے کہاوت کا ترجمہ کیا تو وہ ہنسنے لگا۔ یوں تو زن بھی تھوڑی سی ہے۔ ایک لڑکی مجھے پسند ہے اور تم؟"

"میں ان تینوں سے مبرا ہوں۔"

میں اس کے صندوق کے لیبلوں کو پھر دیکھنے لگا۔ پیرس، لوزان، وینس، ایتھنز،

میں نے بھی تو یہی سفر کیا تھا۔ پیرس، لوزان، وینس، ایتھنز۔

وہ سب جگہیں نگاہوں کے سامنے پھرنے لگیں میں بھول گیا کہ موٹر چلا رہا ہوں۔ میرے ساتھ کوئی بیٹھا ہے اور ہم لندن جا رہے ہیں۔ وہ سارے نظارے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ میں پھر دوبارہ انگلستان عبور کر رہا ہوں۔ سمندر خلافِ معمول پُرسکون ہے اور توقع کے خلاف دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ میں عرشے پر کھڑا نقشہ دیکھ رہا ہوں۔

پھر پیرس، لوزان، وینس ہوتا ہوا ٹریسٹ Trieste پہنچا ہوں۔ اس شہر کی فضا ایسی ہے جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے۔ یہاں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جاسوسی قصوں کے شائقین کے لئے یہ بہترین جگہ ہے۔

ابھی پہنچے دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پہلے تو یونہی خیال سا تھا لیکن پھر دیکھا کہ سمندر کے کنارے پرانے کھنڈرات میں، پہاڑیوں کی طرف جہاں کہیں میں جاتا۔ یہ شخص بھی پہنچ جاتا۔ میں نے اسے نظرانداز کیا، گھورا، قریب جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دن بھر آنکھ مچولی ہوئی آخر میں جھنجھلا اٹھا۔ کباڑی بازار تھا جب وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا میں نے اسے جا پکڑا۔

"میرے پاس صرف دو دن تھے۔ ایک تو تم نے ضائع کر دیا۔ اب اگر کل بھی تم نے میرا تعاقب کیا تو میں تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔"

اس کی گھگھی بندھ گئی۔ "میں آپ کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ میں تو خود سیاح ہوں اور دن بھر ڈرتا رہا ہوں کہ آپ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

اس سے معافی مانگ کر تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ ایک عورت آگے آگے چلنے لگی۔ جس طرف میں مڑتا وہ بھی پھرتی سے مڑ جاتی۔ یہ کیا تماشہ ہے؟ شاید یہ سوچتی ہوگی کہ

تعاقب کرانا تعاقب کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ میں نے رفتار تیز کر دی حتٰی کہ اس کا سانس پھولنے لگا۔ یہ دوڑ بیت کر میں برابر سے نکل گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھاتے وقت دیکھتا ہوں تو وہی عورت کونے میں بیٹھی ہے۔ منیجر سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی سیاحت کے سلسلے میں یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ لاحول پڑھی اور سو گیا۔

سٹیشن پر گیا۔ کسی نے بتایا کہ آج شام کو اورینٹ ایکسپریس بلگراڈ جا رہی ہے۔ مشہور ٹرین جو کبھی لندن سے وی آنا، بوڈاپسٹ، بخارسٹ، صوفیہ ہوتی ہوئی استنبول پہنچتی تھی اور وہاں سے سیدھی بغداد۔ ریاستہائے بلقان کے دنگے فساد تو ہمیشہ سے مشہور ہیں۔ عجیب عجیب لوگ اس ٹرین سے سفر کیا کرتے۔ بادشاہ، جاسوس، سیاست دان، چور، جواہرات پر ڈاکہ، اغوا، قیمتی کاغذات کی چوری، دنیا بھر کے جرائم اس سے منسوب ہیں۔

اب یہ ان ملکوں سے نہیں گزرتی۔ بلگراڈ سے نِش۔ وہاں سے ایک شاخ صوفیہ ہوتی ہوئی استنبول پہنچتی ہے۔ دوسری سلونیکا ہو کر ایتھنز۔

شام کو میں اس ٹرین میں تھا۔ ڈبے کے لمبے راستے میں کھڑا کھڑکی سے سبز پہاڑیاں دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی ساتھ آ کھڑی ہوئی اور اگاتھا کرسٹی کے ہیبت ناک قصوں سے متاثر ہو کر خاص طور پر اس ٹرین سے سفر کر رہی تھی۔

"میں لندن سے آ رہی ہوں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے، ابھی میں نے اس ٹرین کے متعلق ایک ناول ختم کیا تھا۔ اول تو یہ ایکسپریس کہاں ہے، اتنی آہستہ چل رہی ہے۔ پھر وہ ماحول ہی ندارد ہے سب لوگ آرام سے بیٹھے ہیں۔ اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔"

رات کے دس بجے نسوانی ہیچ سنائی دی میں جلدی سے باہر نکلا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔

اُسے کھڑکی میں کسی کا سر نظر آیا تھا۔ دراصل کھڑکی کے شیشے میں اس نے خود اپنے سر کا عکس دیکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد پھر چیخ سنائی دی۔ اس مرتبہ اُسے کھڑکی میں تلوار نظر آئی۔ جو درحقیقت شیشہ اوپر نیچے کرنے کا ہینڈل تھا۔

رات بھر اس نے تنگ کیا۔ اسے بندوق، پستول، خنجر، چھریاں، چاقو۔ سب باری باری دکھائی دیئے۔ سوائے توپ کے جو بہت بڑی ہوتی ہے۔

ناشتے پر وہ غائب تھی۔ معلوم ہوا کہ علی الصبح کسی سٹیشن پر اُتر گئی۔ ایک انگریز انجینئر کچھ مشینوں کی مرمت کرنے بلگراڈ جا رہا تھا۔ وہ بھی کچھ ڈرا سا ہوا تھا۔ پوچھا کہ دن میں کیوں ڈرتے ہو؟ کہنے لگا۔ "مشرق سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ یہ لوگ بے حد جوشیلے ہوتے ہیں جو جی میں آجائے کر گزرتے ہیں۔"

بلگراڈ پہنچ کر دیکھا تو واقعی مشرق شروع ہو چکا تھا۔ جھونپڑیاں اور فلک بوس عمارتیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ بڑی بڑی کاروں کے ساتھ بیل گاڑیاں چل رہی تھیں۔ تیز ہوا چلتی تو گرد اڑتی۔ مکھیاں تھیں بے شمار کتے تھے۔ میں نے ایک پاؤنڈ کے دینار (مقامی کرنسی) لئے اور فوراً حلوہ خریدا جو گڑ کی طرح تھا۔

یوگوسلاویہ کے لوگ سزیب ہیں۔ بیو تبرک ملا جو زاغرب سے مجھے ملنے آیا تھا۔ میں اس کے دوست سے لندن میں مل چکا تھا۔ لیو کو لندن میں تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ بلکہ جنون تھا۔ اس کے دوست کو برٹش کونسل والے وظیفہ دے کر ساتھ لے گئے اور یہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ دن بھر وہ لندن کی باتیں پوچھتا رہا۔

"لندن کی ایک اعزازی ڈگری تو تم آج ہی اپنے نام کے ساتھ لگا سکتے ہو۔"

"یہ سچ مچ خود ہی۔" مٹھیاں چمکنے لگیں۔

میں نے ایک نقلی ڈاکٹر کا قصّہ سُنایا۔ جو اپنا نام یوں لکھا کرتا۔

ڈاکٹر۔۔۔۔ اے۔ جے۔ کے (لندن)

ایک دن بھید کھُل گیا۔ عدالت میں باز پرس ہُوئی تو اس نے جواب دیا کہ ڈاکٹر تو مجھے گھر والے پیار سے کہا کرتے تھے۔ اس لئے بچپن سے یہ لفظ نام کے ساتھ شامل ہے۔

"اور یہ A.J.K. (London) کیا ہے؟"

" آرزو جانے کی لندن"۔ اس نے جواب دیا۔

لبّو پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور لندن کے گُن گاتا رہا چلتے وقت اس نے مجھے اپنے عزیزوں کا پتہ دیا جو مقدونیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

بلگراڈ سے روانہ ہُوا تو ایک دلچسپ ہم سفر ملا۔ حسام الدین۔ وہ شام کا رہنے والا تھا۔ سُرخ و سفید رنگ، بحث مباحثے کا شوقین۔ فرانس سے واپس دمشق جارہا تھا۔ عرب ممالک کا ذکر چھِڑتے ہی اس نے بکریوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

" بکری ایک ایسی لعنت ہے جو ہم سب کو لے کر بیٹھ گئی۔ رومن شمالی افریقہ میں زیتون اور نارنگیاں اُگاتے تھے۔ بحیرۂ روم کا ساحل ہرا بھرا تھا۔ جہاں عرب گئے بکری ساتھ گئی۔ بھیڑ صرف کو نپیں کھاتی ہے لیکن بکری جڑوں تک کو نہیں چھوڑتی۔ جب پودے اور درخت ختم ہوئے تو یہ علاقے اُجاڑ ہو کر صحرا بن گئے۔ بکری کے دودھ سے ملیا بخار بھی چڑھتا ہے۔ پھر ہم میں یہ عیب ہے کہ ہم فالتو بحث بہت کرتے ہیں۔ جب ہلاکو خاں بغداد کو تباہ کرنے آرہا تھا تو دارالخلافے میں باقاعدہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ لیکن بغداد کے علماء ایک اہم مباحثے میں مشغول تھے۔ بحث

کا موضوع تھا کہ اُلّو حلال ہے یا حرام "۔

"زوال کی اور بھی تو کئی وجوہات ہیں"۔ میں نے کہا

" مغرب ہمارے زوال کی وجہ ہمارا مذہب اور سُست کر دینے والی آب وہوا بتاتا ہے۔ لیکن جب ہم نے ملک پر ملک فتح کئے تب بھی یہی مذہب تھا اور یہی آب ہوا در اصل مغرب نے ہمیں صلیبی جنگیں جیتنے پر اب تک معاف نہیں کیا۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ ہم سے لڑنے وہ لوگ آئے جن کا مذہب سکھاتا ہے کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو جب رچرڈ لڑنے آیا تو آتے ہی فرمائشوں کی بارش کر دی۔ ذرا انگور تو بھجوایئے۔ گرمی ہے کچھ برف اور شربت ارسال فرمایئے۔ طبیعت ناساز ہے۔ کسی حکیم سے کہیئے کہ دیکھ جائے۔ آج طبیعت اچھی ہے، مرغ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کی موسیقی کی تعریف سُنی تھی، کبھی سنوایئے۔ صلاح الدین نے سب فرمائشیں پوری کیں ایک مرتبہ بھی نہ کہا کہ میاں لڑنے آئے ہو یا ناز برداریاں کرانے۔ ہم نے یورپ کو شولری سکھائی۔ عورتوں کی عزت، معاہدوں کا احترام "۔

" مگر صلاح الدین تو مغرب کے ہیرو ہیں"۔

" ہم کہاں کہاں پہنچ چکے تھے۔ پیرس سے تین منزل ادھر ہم نے جنگ لڑی۔ ویانا کا بار بار محاصرہ کیا۔ یونان اور بلقان کی ریاستوں پر چار سو سال حکومت کی۔ ہسپانیہ میں سات سو برس رہے۔ ہم نے اٹلی پر چھاپے مارے۔ روم کی دیواریں گرائیں۔ سوئٹزر لینڈ میں ہماری نشانیاں اب تک موجود ہیں۔ لیکن اب ہم سے سب کچھ چھن چکا ہے۔ شام اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ہمارے شہروں کے کھنڈر ہڈیوں کی طرح چمکتے ہیں"۔

میں نے اسے بتایا کہ دنیا کی تقریباً ہر قوم کو یہی شکایت ہے کہ وہ تنزل پر ہیں سب

اپنی پرانی تاریخ کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں ۔ پتہ نہیں یہ بین الاقوامی بیزاری کیوں ہے ۔

ہم مقدونیہ میں داخل ہوئے ۔ سکندرِ اعظم کا وطن سرسبز پہاڑیاں، چشمے اور خودرو پھول ۔

جب میں لیو کے کہنے سے ملنے چھوٹے سے سٹیشن پہ اترا تو وہاں آذان ہو رہی تھی ۔

یہ بے حد پر خلوص اور سیدھے سادے لوگ تھے ۔ انہوں نے بڑی خاطر کی مجھے ان کی زبان بالکل نہیں آتی تھی ۔ پھر بھی ہم دوست بن گئے ۔ دن بھر میں نے ان کے ساتھ کھیتوں میں کام کیا ۔ چھوٹے سے باغ میں پودوں کو تراشنے میں مدد دی ۔ شام کو تاروں بھرے آسمان تلے ان کی موسیقی سُنی ۔

خلوص کی کوئی خاص زبان نہیں ہوتی ۔ یہ دل میں محسوس ہوتا ہے اور آنکھوں سے چھلکتا ہے ۔

مقدونیہ کا ایک منظر ہمیشہ میری آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے ۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں اداس تھا اور اس یاد نے مجھے مسرور کر دیا ۔ کئی مرتبہ یوں محسوس ہوا جیسے یہ نظارہ میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ۔ نرا واہمہ ہے ۔

صبح صبح سورج کی شعاعیں پہاڑیوں سے پھوٹ رہی ہیں ۔ آسمان کے مشرقی حصے میں چند بدلیاں ہیں جو بالکل سرخ ہیں اور تا حدِّ نگاہ پھول کھلے ہوئے ہیں ۔ ہوا کے جھونکوں سے گلابی پھول جھوم رہے ہیں ۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں پھول ۔ اتنے پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے دنیا ابھی تخلیق ہوئی ہے اور

ہر جگہ پھول ہی پھول ہیں۔ دنیا میں ہر طرف سچائی ہے مسرت ہے شادمانی ہے۔

یونان کی سرحد عبور کی اور سلونیکا ٹھہرا۔ لیکن مجھے ماؤنٹ اولمپس دیکھنے کی جلدی تھی۔

جب یہ پہاڑ نظر آیا تو دیر تک دیوتاؤں کے اس مسکن کے سامنے میں خاموش کھڑا رہا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا لیکن پہاڑ کی چوٹیاں بادل اور دھند سے چھپی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں پر یا دھند رہتی ہے یا بادل۔ ممکن ہے کہ یہاں اب بھی دیوتا رہتے ہوں۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں ضیافتیں ہوتی ہوں۔

ایتھنز جاتے وقت جو علاقہ آتا ہے وہ بالکل جہلم اور راولپنڈی کے علاقے جیسا ہے۔ شاید اسی لئے یونانی ٹیکسلا میں آباد ہو گئے تھے۔ یونان سے خیبر تک جانی پہچانی پہاڑیاں نظر آتی رہیں وہ خوش رہے مگر جب ہندوستان کے میدان دیکھے تو گھر یاد آیا اور واپس لوٹ گئے۔

ایتھنز پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ابھی دوڑ کر ایکروپلس دیکھ لوں۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی بھاگا۔ شہر کے پرانے حصے سے گزرتا ہوا اس پہاڑی کے نیچے پہنچا جس پر ایکروپلیس ڈھائی ہزار سال پہلے بنایا گیا تھا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک آئی پھر چڑھائی۔ پھر چاندنی میں چمکتی ہوئی وہ عمارت جسے دیکھ کر سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے۔ بیتی ہوئی صدیاں، وقت کے تباہ کن حملے، حیات و ممات کا لامتناہی سلسلہ۔ کچھ بھی تو یاد نہیں رہتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس اداس دنیا میں ایسی شگفتہ چیزیں بھی موجود ہیں جن پر

خزاں نہیں آتی، جو غیر فانی ہیں جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ابھی سب کچھ تباہ نہیں ہوا۔ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ یہ منروا کا مندر ہے۔ یہ ہرکولیز کا معبد ہے۔ یہ قدیم دنیا کا عجوبہ پارتھینوں جیسے فن کار فڈیاس نے تعمیر کیا۔ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب ایتھنز ساری مہذب دنیا کا قلب تھا۔

آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا میں اس صنم کدے میں داخل ہوا جہاں کبھی نہایت عظیم انسانوں کی آوازیں گونجی ہوں گی۔ افلاطون، سقراط، اقلیدس، ڈیموستھنیز، فیثا غورث، ہیروڈوٹس پیری کلیز۔

علی الصبح میں نے ایکروپلس سے طلوعِ آفتاب دیکھا نیچے اولمپیا کے دیوتا زیوس کا مندر ہے۔ سامنے پہاڑی پر قید خانے کی کوٹھڑیاں ہیں جہاں سقراط کو زہر دیا گیا۔ ایک طرف ڈیونسس کا تھیٹر جہاں سکائلس، یوری پڈیز اور سفوکلیز کے ڈرامے کھیلے گئے۔ اس کے ساتھ موسیقی کا مندر۔ اوڈین اور دور نیلا سمندر۔

نیلا آسمان، نیلا سمندر، رنگین پھول، حسین ستون، متناسب، نفیس، نستعلیق جیسے کسی دل کش نظم کے اشعار۔

بتائے ہوئے پتے پر فون کیا۔ متوس بار آلا میز ملنے آیا۔ اکٹھے کھانا کھایا۔ پلاؤ، دہی کباب، کوفتے اور حلوہ، ریڈیو پر ریکارڈ بج رہے تھے۔ غالباً فوجی بھائیوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔ دھنیں مشرقی تھیں۔ اس نے بتایا کہ حکیم فیثا غورث کو موسیقی کا بھی شوق تھا اسی سلسلے میں وہ ہندوستان گیا تو یونانی موسیقی کو بلیس نئے ٹھاٹھ ملے جو صدیوں تک رائج رہے۔

بل ادا کر کے میں نے بیرے کو دو سو درہم کا نوٹ دیا۔ وہ اس قدر خفا ہوا۔ کہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ صرف دو سو درہم دے کر نہ صرف میں نے

اس کی توہین کی تھی بلکہ اس کا کیریر تباہ کر دیا تھا۔

یونان میں کرنسی کی قیمت ابھی ابھی گری تھی۔ پہلے پاؤنڈ کے عوض بیالیس ہزار درہم ملتے تھے۔ اب چوراسی ہزار درہم ہو گئے۔ جیسے پنسلین کے معمول سے ٹیکے میں کئی لاکھ یونٹ ہوتے ہیں۔

دس پاؤنڈ کا سفری چیک دیا تو آٹھ لاکھ چالیس ہزار درہم ملے جنہیں اُٹھانا مشکل ہو گیا۔ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ لکھ پتی بننے کا موقع نصیب ہوا۔

یونان میں موسم بہار تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ بے شمار خودرو پھول کھلے ہوئے تھے۔ سمندر، آسمان اور جزیرے، ان سب میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ یہ رنگ آپس میں مدغم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سنگِ مرمر کے حسین ستون، رنگین پھول، نیلے سمندر میں خوشنما جزیرے۔ یہ سب یونان ہی میں یکجا ملتے ہیں۔

"موسم بہار میں یونانی تنہا نکلنا گناہ سمجھتے ہیں۔" ملتوکس بارالا بلینز بولا

"بھئی تمہارا نام بہت لمبا ہے۔ یاد نہیں رہتا۔"

"مجھے لوٹی کہا کرو۔"

رات کو ہمارے ساتھ لوٹی کی منگیتر تھی اور اس کی دو سہیلیاں ایک تو بالکل سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیسے ایک ایک عضو پر خالق نے وقت صرف کیا ہو۔ آنکھوں کی ساخت ہونٹوں کی بناوٹ، پیشانی، گردن، ہر چیز تراشیدہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ مجسمہ کسی بت تراش کا خواب تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیفنی۔"

"نہیں۔ یہ دیوی ایتھینا ہے۔"

"تم لندن وندن چھوڑ و اور آج ہی سے بُت تراشی شروع کر دو۔ یونان کا موسمِ بہار بڑا اثر انگیز ہوتا ہے۔"

"تمہارے ہاں ہر چیز میں حُسن ہے۔ پانی، مٹی، پتھر، انسان سب حسین ہیں تبھی یونانیوں نے شعر کہے، نغمے گائے اور بُت تراشے۔"

"وہ قدیم یونانی تھے۔ اب ہم نکمے ہیں قلاش ہیں۔"

"لیکن تم بہت سے ملکوں سے اچھے ہو۔ جو مفلس بھی ہیں اور حُسن سے بھی محروم ہیں۔"

ڈیفنی ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"تم اسے گھر چھوڑ آنا۔"

"میں راستہ بھول جاؤں گا۔"

"یہ بتا دے گی۔ یہ انگریزی جانتی ہے اور اس نے ہماری باتیں سمجھ لی ہیں۔"

محفل ختم ہوئی۔ ٹونی کار چھوڑ گیا۔ ڈیفنی کو میں ایکروپلس لے گیا۔ ستونوں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہ حسین کھنڈر ایک شکستہ رباب معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں کبھی ایتھینا کا سونے اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا مجسمہ تھا۔

"مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

"فڈیاس نے اپنی ساری صناعی صرف کر کے ایتھینا کا بُت بنایا۔ صدیاں گزریں

یہ مجسمہ کھو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد آج ملا ہے۔ میں ایتھنز والوں کو بتانے جا رہا ہوں کہ تمہاری دیوی واپس لوٹ آئی ہے"۔

وہ مسکرانے لگی۔ "تمہیں ہمارے ملک کے ماضی کی ساری باتیں معلوم ہیں"۔

"لیکن ایتھینا! یونان تمہارا ہی نہیں میرا بھی ہے۔ مجھے بھی حسین چیزوں سے الفت ہے"۔

اگلا دن ہم دونوں نے کورنتھ میں گزارا۔ سمندر میں نہا رہے تھے۔ بہت سی نگاہیں ہم پر تھیں۔

"یہ شاید تمہیں دیکھ رہے ہیں"۔ وہ بولی

"نہیں۔ یونانیوں کو وہ نظارہ یاد آ رہا ہے جب سمندر کی لہروں سے ایک بہت بڑی سیپی کھلی اور وینس شرماتی لجاتی باہر نکل آئی۔

"میں پہلے ہی مغرور ہوں۔ تم مجھے اور بگاڑ دو گے"۔

"زیوس کے بیٹے اپولو اور ڈیفنی کی کہانی مجھے یاد ہے۔ دیویاں تو ہمیشہ مغرور ہوا کرتی ہیں"۔

"مگر میں تو آرٹ کی ایک معمولی سی طالب علم ہوں"۔

"آرٹ کے مجسموں کو آرٹ پڑھنا نہیں پڑھانا چاہیئے"۔

لیکن اگلے دن میں ٹونی سے کہہ رہا تھا۔ "دوست میرے پاس صرف چار دن اور میں اور ابھی سارا یونان دیکھنا ہے"۔

"ڈیفنی سارا یونان ہے"۔ وہ بولا

"نہیں۔ میں کچھ دیر کے لئے بھول گیا تھا کہ میں سیاح ہوں"۔

ہم مراتھون گئے۔ وہ میدان دیکھا جہاں ایک زبردست جنگ ہوئی تھی مشرق اور مغرب کا پہلا مقابلہ۔ اس شکست کے بعد مشرق ہمیشہ دبا دبا سا رہا۔ یونانیوں نے ایرانیوں کو شکستِ فاش دی۔ خوشخبری لے کر ایک سپاہی پورے بائیس میل بھاگا آیا۔ اہلِ ایتھنز کو یہ خبر سُناتے ہی مر گیا۔ اس کی یادگار میں مراتھون دوڑ ہوتی ہے۔

ٹونی کہنے لگا۔ "پتہ نہیں چار میل کا اضافہ کس سلسلے میں کیا گیا ہے۔ اب لوگ چھبیس میل دوڑتے ہیں۔ کوئی خوشخبری نہیں لاتے اور زندہ رہتے ہیں"۔

ٹونی یا تو بیحد ذہین تھا۔ اور یا بالکل نیم انٹلکچوئل۔ لیکن اس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔

"سکندر تمہارے ملک میں گیا تھا۔ کچھ عرصہ یونانی بھی وہاں رہے ہیں"۔ ٹونی بولا۔

"ہاں۔ اب بھی ہمارے ہاں سکندر خاں، سکندر علی اور سکندر بخت ہوتے ہیں۔ یونانی دواخانے اس ملک میں نہ ہوں لیکن ہمارے ہر قصبے میں موجود ہیں۔ حکیم جالینوس کو ہم نہیں جانتے لیکن نمک جالینوس اور جوارش جالینوس ہر روز کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ ہر شہر میں اوڈین تھیٹر ہوتا ہے جہاں ہر نوع قسم کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی"۔

ٹونی یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

"لیکن سکندر ہمارا ہم وطن نہ تھا۔ وہ مقدونیہ کا باشندہ تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی قسم کا دیوتا ہے۔ مصری دیوتا بننے کے لئے اس نے مصر کا طویل سفر طے کیا۔ مصریوں نے ڈر کر فوراً اسے دیوتا مان لیا۔

لوگ بڑے آدمیوں کی ہر بات کا یقین کر لیتے ہیں جنگ میں پہلی مرتبہ زخم لگا تو اسے تعجب ہوا کہ معمولی آدمیوں کی طرح خون کیوں بہہ رہا ہے "۔

"مگر وہ جینئیس تھا" میں نے سکندر اعظم کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جینئیس بھی خوب ہوتے ہیں۔ ہمارے دیوجانس کلبی کو فطرت کے ہر نپے تلے قانون سے نفرت تھی۔ اس نے بغاوت کی، یہ کیا ضروری ہے کہ زندہ رہنے کے لئے انسان سانس لے اس نے سانس لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دیوجانس اللہ کو پیارا ہوا آخری دنوں میں دیوجانس نے ٹب میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ جب سکندر اس سے ملنے گیا تو پوچھا۔ "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" دیوجانس نے جمائی لی اور کہا۔ "ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جایئے"۔ ایک جینئیس کی بات دوسرا جینئیس ہی سمجھ سکتا ہے۔ سکندر اس جواب سے اس قدر خوش ہوا کہ بولا۔ اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس بننا پسند کرتا۔

غسل کرتے کرتے ارشمیدس کو ایک مسئلے کا حل سوجھ گیا اسی حالت میں یوریکا یوریکا چلاتا باہر بازار میں نکل گیا۔ بھلا آدمی کم از کم تولیہ ہی باندھ جاتا۔ پھر لائی کرگس کو سپارٹا والوں نے اصلاحات رائج کرنے کے لئے بلایا تو اس نے آتے ہی یہ قانون نافذ کیا کہ کوئی شخص اپنے گھر میں کھانا نہ کھائے۔ اس طرح فضول خرچی ہوتی ہے۔ چنانچہ سپارٹا بھر میں لوگ سڑکوں پر بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ کچھ دیر تو ایسا ہوا پھر سب ایک دوسرے کو بار بار دیکھ کر تنگ آنے لگے۔ فسادات شروع ہو گئے اور لائی کرگس کو بھاگنا پڑا صرف پیری کلیز کے دنوں میں۔

یونانی اپنے جینئیس حضرات سے کچھ عرصہ خوش رہے۔ اس کے مرتے ہی انہوں نے سغریب انکساغورا کو سمندر پار بھجوا دیا۔ فڈیاس کو قید کر کے ہلاک کر دیا۔ سقراط کو

زہر دے دیا۔ افراتفری مچ گئی۔ کچھ اور لوگوں نے کچھ اور لوگوں کو مارا۔ چنانچہ یونانیوں نے دو تین مہینے کے اندر اندر اپنے سارے جینئیس ٹھکانے لگا دیئے۔"

"مگر تمہارا عہد زریں خوب تھا۔ بقراط اب تک بابائے طب تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی طبی قسم اب بھی ڈاکٹر اٹھاتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد افلاطون نے اُستاد کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو بھی کم نہ تھا۔ ارسطو کا شاگرد سکندر اعظم۔"

"کیا تو وہ دن تھے کہ کسی اچھے استاد کے سامنے بیٹھ کر سبق یاد کر لیا اور بیڑا پار ہے۔ اب بے چارے استاد ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں لیکن طالب علم کورے کے کورے رہتے ہیں۔"

"ہر جگہ یہی شکایت ہے۔"

اولمپیا گئے۔ پرانا سٹیڈیم دیکھا جہاں سب سے پہلے اولمپک کھیل ہوئے تھے پھر مائیسینیا، سپارٹا، پطرکس۔ وہی نیلے سبزہ زار، خودرو پھول، متناسب ستون اور حسین مجسمے۔

"نصف سے زیادہ یونان تو برٹش میوزیم میں بند ہے۔ لارڈ ایلگن بہت کچھ لے گئے تھے۔ اب تو جگہ جگہ یہ لکھا ہے۔ یہاں فلاں بت نصب تھا۔ یہاں فلاں چیز ہوا کرتی تھی۔ اس جگہ دیوی ہائی جیا کا بت تھا جس کے نام پر ہائیجین ہے۔ بقیہ یونان تم لندن پہنچ کر دیکھنا۔"

رات کو رقص پر ٹونی کی منگیتر اور ڈیفنی سے ملاقات ہوئی۔ مجھے کچھ سوچتا دیکھ کر ٹونی نے قہقہہ لگایا۔

"تم پر مفوگلیز کا اثر ہو گیا ہے۔ اس نے ہمیشہ دنیا کو رُخ دینے اور ہیچ نام بری کا رے۔ گانے کی تلقین کی"۔

قیام ختم ہوا۔ میں سمندری راستے سے استنبول جا رہا تھا۔ ٹوٹی بندرگاہ پر چھوڑنے آیا۔

"تم کچھ ڈھونڈ رہے ہو۔ اگر برساتی کی تلاش ہے تو وہ تمہارے کیبن میں رکھی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں ہر روز دھوپ نکلتی تھی لیکن برساتی ہر وقت تمہارے ساتھ رہتی تھی"۔

"اس سے کچھ دوستی سی ہو گئی ہے"۔

"جب برساتیاں رفیق بننے لگیں تو ایک خطرناک ذہنی دور شروع ہوتا ہے۔ اچھا اب اگلی مرتبہ آؤ تو ارستو فینیز کی طربیہ تحریریں پڑھ کر آنا"۔

آئیونین سمندر میں جزیرے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ یونانی مندروں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ یہیں کہیں حضرات ہیلن کو لے اُڑے تھے۔ سمندر کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ سیاسی مائل ہو گیا ہے۔ جہاز اطالوی کمپنی کا ہے اس لئے لذیذ غذا ملتی ہے، دن بھر موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے اور رات کو محفل رقص وسرود گرم ہوتی ہے۔ جس میں جرمن حصہ نہیں لیتے۔ جرمن ہمیشہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ نطشے کا فوق الانسان انہیں اب تک نہیں بھولا۔

کچھ امریکن لڑکیاں بھی ہیں جو زینتِ محفل بنتی ہیں۔ ایک سنہرے بالوں، چنچل آنکھوں والی لمبی لڑکی سب کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ اس کا نام مارگرٹ ہے لیکن اس کی سہیلیاں اسے سینڈی SANDY کہتی ہیں۔ جہاز کا کپتان CAPITANO پچاس برس

کا ہے۔ پستہ قد ہے، گنجا ہے، لیکن صبح سے سینڈی کے گرد طوائف کر رہا ہے۔ جہاز کو نی اور صاحب چلا رہے ہیں۔

ڈیک ٹینس میں کیپٹی تانو اور ایک لڑکی کو میں اور سینڈی بڑی آسانی سے ہرا دیتے ہیں کیونکہ وہ ٹکٹکی باندھے اس شوخ و شنگ حسینہ کو دیکھ رہا ہے۔

شام کو وہ کہتی ہے۔ "کیپٹی تانو ہم سے جہاز چلوائے گا۔ آج رات ہم چار لڑکیوں کو اُوپر بلایا ہے"۔

"مبارک ہو"۔

"مگر یہ آدمی مشتبہ سا ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تم ہمارے ساتھ چلو"۔

"اور بیچارہ کیپٹی تانو؟"

"نہیں، تم ہمارے ساتھ ضرور چلو گے"۔

رات کے دس بجے چار لڑکیاں اور میں۔ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر پہنچے۔ کیپٹی تانو کا چہرہ دمک رہا تھا مجھے دیکھ کر اداس سی پڑ گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے ملازم کو بتایا۔ "شراب کی بوتلیں اٹھالو اور چائے لاؤ"۔ دو لڑکیوں کو نقشے پر بٹھا دیا گیا۔ تیسری کو ان کی مدد کرنے کے لئے۔ مجھے وہ مشین دی گئی جس سے جہاز کا رخ بدلتے ہیں۔ "اُوپر چلو دوربین سے ستارے دیکھیں گے"۔ اس نے سینڈی سے کہا۔ چلتے ہوئے وہ ایک لڑکی کو ساتھ لے گئی۔ چنانچہ فوراً یہ تینوں واپس آ گئے۔

لڑکیوں کی ڈیوٹی بدلی گئی اور مختلف جگہوں پر انہیں بٹھا دیا گیا۔

"چلو لہریں دیکھتے ہیں"۔

سینڈی پھر ایک لڑکی کو ہمراہ لے گئی۔

آخر تینوں لڑکیوں کو اُوپر بھیج دیا گیا۔ سینڈی اور وہ کیبن میں تھے۔ میں جہاز کا رُخ دیکھ رہا تھا۔ یکایک سینڈی نے مجھے آواز دی اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر چلا گیا۔ کیپٹن تانو ہڑبڑا کر باہر نکلا اور وہ مشین تھام لی۔ آدھ گھنٹے تک یہ آنکھ مچولی ہوئی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

کیپٹن تانو لگاتار مجھے گھورتا رہا تھا۔ وہ بیحد خفا تھا۔

نیچے آئے تو تینوں لڑکیاں شب بخیر کہہ کر سونے چلی گئیں۔ سینڈی اور میں اکیلے رہ گئے۔

اس نے بتایا کہ وہ کالج میں پڑھتی ہے سہیلیوں کے ساتھ یورپ کی سیر کو آئی ہے اس کے والد کروڑپتی ہیں۔ ان کے ہاں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

"لیکن میں بےحد اداس ہوں۔ اپنی روح کی تنہائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"ہم سب اداس ہیں۔ اور تنہا ہیں"۔

"مگر کیوں؟"

"اس کا جواب تو بڑے بڑے مفکر نہ دے سکے"۔

"لیکن تم تو خوش رہتے ہو"۔

"میں خوش ہوں۔ اس لئے کہ میں غمگین ہوں"۔

"یہ کیسے؟"

"میں مفکر ہوتا تو شاید بتا سکتا"۔

"ہائے کتنی دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے"۔

"ہائے یہ لہریں کتنی پیاری ہیں۔ آؤ انہیں گنیں۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار"۔

صبح کیپٹن تانو نہایت بے چین تھا جیسے تپتی ہوئی اینٹوں پر بلّی۔ ملاحوں کو ڈانٹتا۔ ملازمین کو بُرا بھلا کہتا۔ سر پر جو اّدھ درجن بال تھے وہ بھی پریشان تھے۔ انہیں وہ بار بار نوچنے کی کوشش کرتا اس نے مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

"جہاز پر اطالوی جھنڈے کے ساتھ ترکی کا سُرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہلال اور تارہ۔ میں سینڈی کو بتا رہا تھا کہ چاند تارے کا نشان پہلے بازنطینیوں کا تھا۔ ایک جنگ جیت کر عربوں نے ہتھیا لیا۔ اب یہ ہمارا ہے۔"

"سب کچھ جیت کر لینا چاہئیے۔" اس نے جواب دیا۔

ہم درۂ دانیال سے گزر رہے تھے۔ سمندر یہاں چھوٹا سا دریا معلوم ہوتا ہے ایک طرف یورپ ہے دوسری طرف ایشیاء۔ یہ پرانا ہیلیز پونٹ۔ جہ یہیں قدیم ٹرائے آباد تھا۔ سکندر اسے عبور کر کے ایشیا گیا۔ ایرانی بادشاہ زرکسیز نے یورپ پر حملہ کرتے وقت یہاں کشتیوں کا پُل بنوایا پر پہلے جسے تعمیرداروں نے بنایا تھا تیز ہوا سے تباہ ہو گیا بادشاہ نے فوج کے سامنے ان حضرات کا انتقال کروایا اور دوسرا انجینئر ملے۔ اس مرتبہ ایسا مضبوط پُل بنا جسے غالباً بادشاہ نے یورپ سے جاتے وقت بھی استعمال کیا۔

یہاں سمندر کو بائرن نے بھی تیر کر عبور کیا تھا لیکن محض تفریحاً بائرن ایسی حرکتیں اکثر کیا کرتا تھا۔ آخر دور مسجدوں کے گنبد اور مینار دکھائی دیئے۔ یہ استنبول تھا۔

سینٹ صوفیہ۔ سینٹ صوفیہ۔

سب دوربینوں سے ڈیڑھ ہزار سال پرانے گرجے کو دیکھ رہے تھے جو اب مسجد ہے۔

جہاز آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یکایک ساتھ کھڑی ہوئی دو لڑکیوں نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کر دیا۔ سامنے ساحل پہ کچھ خواتین بھی گلاسٹائل میں رو رہی تھیں۔ مجھے

شبہ ہوا کہ شاید ان کی غیر حاضری میں کوئی عزیز چل بسا ہوگا۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔ کیا عمر تھی مرحوم کی؟"

انہوں نے بتایا کہ وہ فرطِ انبساط سے رو رہی ہیں۔ ان کے ہاں رواج ہے۔ اگر فرائڈ آج زندہ ہوتا تو اس کی وجہ بتاتا۔ یہ سب شاید اس لئے رو رہی ہیں کہ اب پھر اکٹھے رہنا پڑے گا۔ غالباً جدا ہوتے وقت یہ ہنستے ہوں گے۔ یہ لڑکیاں ہنگری کی تھیں۔ اچھا ہُوا میں ہنگری نہیں گیا۔

"اگر یہاں ملاقات نہ ہو سکی تو پھر میں لندن میں ملوں گی"۔ سینڈی نے چلتے وقت کہا۔

ترک خوبصورت ہیں۔ تندرست و توانا۔ ہنس مکھ۔ گورے چٹے۔ مغربی لباس۔ اسلام علیکم کی جگہ مرحبا کہتے ہیں اور وعلیکم السلام کی جگہ بھی مرحبا۔ کرنسی دیکھ کر گھر یاد آ گیا۔ روپے پر چاند تارا بنا ہُوا ہے اور پیسوں میں سُوراخ ہے۔ مگر انشاء اللہ، سبحان اللہ، زراعت تجارت، تقسیم، مرکز، جمہوریت کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

خطوط پر ٹکٹ لگانے ڈاک خانے گیا۔ کلرک نے ملک کا نام پڑھ کر وہیں سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور مجھے پوسٹ ماسٹر کے کمرے میں لے گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ انگریزی میں باتیں ہونے لگیں۔ "آپ کے ملک سے ہمیں بے حد دلچسپی ہے مگر وہاں سے بہت کم لوگ یہاں آتے ہیں"۔

"آپ بھی تو ہماری طرف نہیں آتے"۔ میں نے شکایت کی۔

ان کے گھر شام کو ایک نہایت نفیس بوڑھے سے ملاقات ہوئی۔ قاسم بے، طویل قامت، پانچ زبانوں کا ماہر۔ کمال اتاترک کے دوش بدوش لڑ چکا تھا۔

ہوں۔ اس تابوت کی ساخت، کوالٹی اور سائز سے میں مطمئن ہوں۔ اُمید ہے کہ اس کے استعمال کا موقعہ مجھے عنقریب ملے گا۔" یہ وہ منبر ہے جس سے حضرت صالح وعظ کیا کرتے تھے۔ یہ اپولو اور زیوس کے بُت ہیں۔ یہ کسی ممی کا صندوق ہے۔ اس پر لکھی ہوئی عبارت کا مطلب ہے۔" بھائیو میرے پاس کچھ نہیں ہے مجھے تنگ مت کرو۔" مصر میں ممی کے ساتھ زادِ راہ کے طور پر دولت بھی دفن کی جاتی تھی جسے لوٹنے کے لئے چور بڑی بے صبری سے انتظار کیا کرتے۔ اس شخص کو بھی یہی ڈر ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر لیا لیکن چور غالباً اَن پڑھ تھے۔ صرف خالی صندوق مل سکا۔ ممی نہیں ملی۔ نہ جانے کیوں مصری قبر کے اوپر اتنے بڑے بڑے اہرام کھڑے کر دیتے تھے کہ جنہیں بیس میل سے دیکھ کر کسی ریٹائرڈ چور کا جی للچا اُٹھے۔

یہ اُس رحمدل اور خدا ترس خاتون فلارنس نائٹنگیل کا ہسپتال ہے۔ یہ ہپوڈروم کا چوک ہے جہاں سے بازنطینی شہنشاہ کھیل کو ملاحظہ کیا کرتا۔ سمندر کا یہ حصہ باسفورس کہلاتا ہے۔ ہم یورپ میں کھڑے ہیں ایشیا دوسرے کنارے پر ہے۔ ایشیا اور یورپ میں صرف چند سو گز کا فاصلہ ہے۔ لیکن مشرق اور مغرب کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔

ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ لسی مفت ملتی ہے۔ کھانے میں کئی قسم کے کباب ہیں۔ کوفتے۔ نان۔ دہی اور سویاں۔

اتنے دنوں کے بعد سویاں چکھ کر میں بہت خوش ہوتا ہوں اور قاسم بے کو بتاتا ہوں کہ سویاں ہمارے ہاں بھی ہوتی ہیں۔

"لیکن ہمارے ہاں صرف خاص موقعوں پر استعمال ہوتی ہیں جیسے اب رمضان

"برخوردار میں تمہیں استنبول دکھاؤں گا"۔

ہم دونوں غلاطا پل پر کھڑے تھے۔ گولڈن ہارن کا دلکش نظارہ۔ دُور تک پانی میں روشنیاں چمک رہی تھیں۔ جیسے لاتعداد جگنو چمک رہے ہوں۔ مسجدوں کے گنبد اور مینار تیز روشنی سے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ اسے دنیا کے بہترین نظاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ بازنطینیوں کا قسطنطنیہ ہے جسے روم کی طرح سات پہاڑیوں پر بسایا گیا۔ عثمانیوں کا استنبول۔ آج سے پورے پانچ سو سال پہلے سلطان محمد فاتح نے اس پر حملہ کیا۔ بازنطینیوں نے سمندر میں لوہے کی زنجیریں ڈال دیں۔ سلطان نے پہاڑی کے ایک حصے کو ہموار کرایا۔ تختے بچھوائے، انہیں چکنا کیا اور راتوں رات اپنے بہتر جہاز خشکی سے گزار کر دوسری طرف پانی میں اُتار دیئے۔ تب سے اب تک یہ شہر ترکوں کے قبضے میں ہے سلطان کا یہ کارنامہ ہر عسکری تاریخ میں لکھا جاتا ہے۔

صبح صبح قاسم بے مجھے ساتھ لے گیا۔

یہ سراغلیو کے قدیم محلات ہیں۔ یہ مقام اس وسیع سلطنت کا مرکز تھا جو سلیمان کے وقت میں دی آنا تک پہنچ چکی تھی۔ بحیرۂ روم کے تقریباً سب ملک ترکوں کے قبضے میں تھے۔ اور یہ وسیع سمندر ترکوں کی جھیل بنا ہوا تھا۔ یہ حرم ہے جس میں جگہ جگہ وینگ روم سے بنے ہوئے ہیں۔ یہ میوزیم کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ سکندر کا تابوت جس میں سکندر نہیں ہے۔ سنگِ مرمر کا بنا ہوا آرٹ۔ کا نادر نمونہ جسے برٹش میوزیم والے بہت بڑی قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں رواج تھا کہ فنکار مشہور ہستیوں کے تابوت ان کی زندگی میں بنا دیتے تھے تاکہ بعد میں دقت نہ ہو۔ بڑے آدمی خوش ہو کر سند دیا کرتے کہ "میں اس عزت افزائی کے لئے بے حد مشکور

کا مہینہ ہے۔"

ہم نہایت خوشنما مسجدیں دیکھتے ہیں۔ سنگ سُرخ، سنگ خارا سنگِ مرمر کی بنی ہوئی باہر پھول کھلے ہوئے ہیں اندر بجلی کی روشنی ہے۔ بڑی رونق ہے۔ یہ مسجدیں سانس لیتی ہوئی لگتی ہیں۔ یہاں عبادت گاہیں مونده ہیں۔

"برخوردار ہمارے ملک میں سب سے اہم چیز کام ہے۔ ہمیں زیادہ فرصت نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہم نماز بہت جلد پڑھتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو صرف عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن جب تک باشندے ان فرائض سے کوتاہی نہیں کرتے جو ان پر ملک اور سوسائٹی نے عائد کیے ہیں وہ سب سماج کے مفید رکن ہیں۔ اور ان کے مذہبی عقیدوں اور ذاتی زندگی کے متعلق کوئی باز پُرس نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ بیکار رہنے لگیں یا قانون کی خلاف ورزی کرنے لگیں تو خواہ دن رات عبادت کیا کریں۔ سوسائٹی انہیں معاف نہیں کرتی۔ ملک کے لئے ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے خدا سے ڈرتا ہوں۔ کوئی قابل اعتراض حرکت نہیں کرتا۔ روزی کمانے کے لئے محنت کرتا ہوں۔ لیکن میرے حقوق بھی تو ہیں۔"

ہم ٹرکش کافی پیتے ہیں۔ چھوٹی سی پیالی میں میٹھی اور گاڑھی چیز۔ دو گھونٹ پی کر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔

"یہاں ترکی ٹوپی نظر نہیں آتی۔"

"سکاٹ لینڈ میں سکاچ وسکی کہاں ملتی ہے"؟ قاسم بے پوچھتا ہے۔

گرینڈ بازار بازنطینوں نے سطحِ زمین کے نیچے بنایا تھا۔ یہاں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔

جوہری کی دکان پر قاسم بے نے ہیٹ اُتار کر دو عورتوں کو سلام کیا۔ وہ مُسکرائیں ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ میرا تعارف ہوا۔

معمر خاتون قاسم بے کے دوست کی بیوی تھیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی لڑکی تھی شکیلہ جو سچ مچ شکیلہ تھی۔ مسکراتی تو گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے۔

سہ پہر تک ہم ساتھ رہے۔ قاسم بے کو دفتر پہنچنا تھا چنانچہ میں ان دونوں کو چھوڑنے گیا۔ انہوں نے مجھے رات کے کھانے کے لئے ٹھہرالیا۔

شکیلہ لگاتار سوال پوچھ رہی تھی "تمہارے ہاں لڑکیوں کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ معاشی حالت کیسی ہے؟ کتنی لڑکیاں شادی کرتی ہیں اور کتنی ذرا ٹھہر کے شادی کرتی ہیں؟ شادی کس طرح ہوتی ہے"؟

"آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں گی"؟

میرا اندازہ صحیح نکلا۔

"میں اس سلسلے میں آپ کو زیادہ نہیں بتا سکتا۔ لیکن محبت، شادی اور بچے۔ ان کی سماجی، معاشی، ذہنی اور سیاسی حالت وہی ہے۔ جو صدیوں سے چلی آئی ہے۔ لڑکے لڑکیاں پہلے شادی کو بُرا بھلا کہتے ہیں پھر شادی کر لیتے ہیں اور اپنے بچوں کو دنیا بھر کے بچوں سے حسین عقلمند اور انوکھا سمجھتے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر والدین کو بیوقوف تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن شادی کر لیتے ہیں۔ ان کے بچے بڑے ہو کر سب کو خبطی سمجھتے ہیں اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔"

وہ ہنسی اور گالوں میں پھر ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔

"ہاں، ایک بات میں بھول گیا۔ جب لڑکے لڑکیوں کو آپس میں محبت ہوتی ہے

تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ایسی محبت نہ کسی نے آج تک کی ہے نہ کوئی آئندہ کرسکتا ہے۔ یہ لیلےٰ مجنوں، رومیو جولیٹ، شیریں فرہاد محض اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ یہ دوہا پڑھنے لگتے ہیں۔

دھیاں جوانی لے گئے اور بہواں لے گئے پوت
کہو منوہر جانگلی تم رہے اوُت کے اوُت

(اس کا ترجمہ سلیس انگریزی میں کرکے سنایا)

"آپ نے فلسفہ پڑھا ہوگا۔"

"نہیں۔ میں فلسفیوں کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔"

"میں خبردار رہوں گی، میں نے فلسفہ لے رکھا ہے۔"

اگلے دن میں اور شکیلہ باسفورس عبور کرکے حیدرپاشا پہنچے۔ استنبول اور اس کے مضافات باغوں سے پٹے پڑے ہیں۔ سبزہ، سرو کے درخت، پھول اور نفیس و نازک مینار۔

ہم بنچ پر بیٹھے رہے۔ میں کارڈوں پر دوستوں کے پتے لکھ رہا تھا۔

"تم نے ابھی آہ بھری تھی؟ خیریت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ آہ نہ تھی۔ سانس لیا تھا۔ لمبے سانس بڑی صحت کے لئے مفید ہے۔ ویسے آہ بھرے تقریباً آٹھ برس گزر چکے ہیں۔"

"نہیں اپنے عزیز یاد آرہے ہوں گے۔"

"یہ میرا براعظم ہے۔ میں صبح یورپ میں تھا۔ اب اپنے وطن میں ہوں۔"

اگن بوٹ کی سیٹی سن کر ہم دونوں بھاگے۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر مجھے اپنا بیٹ

یاد آیا جو حیدر پاشا میں رہ گیا تھا۔

"چلو ابھی جا کر لے آتے ہیں۔" وہ بولی

"برساتی کھو جاتی تو ضرور کوشش کرتے۔ لیکن ایک ہیٹ کے لئے یورپ سے ایشیا کا سفر کرنا زیادتی ہے۔ غالباً یہ ہیٹ میری برساتی کو پسند نہ تھا اس لئے خود تو چلی آئی اسے وہیں چھوڑ آئی۔"

بوندا باندی ہونے لگی میں نے اُسے برساتی اڑھا دی۔ ہم ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے۔

"تھک گئی ہو گی۔ بنچ پر بیٹھ جاؤ۔"

"اس کا روغن گیلا ہے۔" وہ ایک دم اٹھی۔ برساتی پر رنگ کا نشان پڑ گیا۔ گھر جاتے وقت برساتی لوٹانا اُسے یاد نہ رہا۔

ہم نے مرمرہ کے جزیرے دیکھے۔ رومیلی حصار گئے۔ ایک جگہ چند لمحوں کے لئے سینڈی سے ملاقات ہوئی۔

"اس لڑکی کا اندازِ گفتگو مجھے پسند نہیں آیا۔ یہ تمہیں اس طرح کیوں دیکھ رہی تھی؟" شکیلہ کچھ خفا ہو گئی۔

"مغربی لڑکیاں اسی طرح دیکھا کرتی ہیں۔"

"بالکل نہیں۔ ہم لوگ تو۔"

"تم مشرقی ہو۔ مغربی آداب، لباس اور طرزِ معاشرت کے باوجود تمہاری ایک ایک بات مشرقی ہے۔ یہ بتاؤ تمہیں گھر کب پہنچنا ہے؟"

"مغرب سے پہلے۔"

جاتے وقت وہ پھر برساتی لے گئی۔

ہم کشتی میں بحیرۂ اسود کی طرف جا رہے تھے۔

"تم نے آندرے مورُوا کی وہ کہانی پڑھی ہے۔ برساتی؟"

"نہیں۔"

شکیلہ نے مجھے کتاب دی۔ "اس میں ہے لیکن جب میں گھر چلی جاؤں تب پڑھنا۔"

رات کو میں نے کہانی پڑھی۔ ایک آرٹسٹ اپنے دوست کو بتا رہا ہے کہ کس طرح ایک معمولی سی بھورے رنگ کی برساتی سے اس کی زندگی میں اتنی تبدیلیاں آ گئیں۔ مختلف موقعوں پر اس نے برساتی مختلف لوگوں کو دی لیکن ہر مرتبہ نتائج مختلف نکلے۔ ایک دوست خواہ مخواہ دشمن بن گیا۔ ایک روٹھے ہوئے سے صلح ہو گئی ایک دو کو غلط فہمیاں ہو گئیں۔ اگرچہ ان واقعات سے برساتی کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا لیکن ایک پُراسرار وابستگی ضرور تھی۔ ایک شام کو اس کی محبوبہ ملنے آئی جو بڑی سنگدل اور مغرور تھی اور شاید خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ چلتے وقت بارش ہونے لگی، اس کا جی چاہا کہ اُسے برساتی پہنا دے۔ ایسی حقیر چیز دیتے ہوئے آرٹسٹ کو جھجک محسوس ہوئی کیونکہ وہ غریب تھا۔ آخر اس نے برساتی پہنا دی۔

"پھر کیا ہوا؟" سننے والا پوچھتا ہے۔ اتنے میں ایک خوبصورت عورت کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

"ان سے ملئے۔ یہ میری بیوی ہیں۔" آرٹسٹ کہتا ہے۔

سننے والے نے دیکھا کہ عورت نے وہی بھورے رنگ کی برساتی پہن رکھی تھی۔

میں نے شکیلہ کو کتاب واپس دی تو وہ خاموش سی تھی۔ دن بھر اس نے بہت

کم باتیں کیں۔

اگلے روز مجھے ازمیر جانا تھا۔

"تم پھر آؤ گے؟"

"ہاں کسی دن ضرور آؤں گا۔"

"لیکن جب تم آؤ گے تو مدبر اور سنجیدہ بن چکے ہو گے۔ تب تم میں یہ بچپنا ہو گا نہ یہ شوخی۔ میری شادی ہو چکی ہو گی۔ تب دھوپ میں تمازت ہو گی نہ چاندنی میں راحت یہ آسمان اور سمندر بھی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔

ازمیر میں دو دن رہا۔ اب واپسی تھی جہاز کا کپتان مجھے بتا رہا تھا۔ یہ ہومر اور اپولو کا وطن ہے۔ ہرکولیز آس پاس ہی کہیں لڑا تھا۔ وہ جزیرہ دور نہیں جہاں بقراط طب پڑھاتا تھا۔ یہاں ڈائنا کا مندر تھا دنیا کے سات قدیم عجائب میں سے ایک — یہاں سکندر آیا۔ ہینی بال، بروٹس، انٹنی۔ سب باری باری آئے۔ اسی جگہ کمال اتاترک نے یونانیوں کو سمندر میں دھکیلا تھا۔ آئیونین سمندر۔ ایجیئن سمندر۔ ایڈریاٹک۔ اٹلی۔ فرانس۔ رودبار انگلستان۔ لیکچر۔ کتابیں اور۔ امتحان۔

کار سے عجیب سی آواز آنے لگی۔ رفتار مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اور جیرلڈ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور موٹر روک لی۔ باہر نکلے تو تیز بارش ہو رہی تھی۔

"یہ برساتی اوڑھ لو۔" میں نے اُسے کہا

"اور تم جو بھیگ رہے ہو۔"

"نہیں، میں اسے اوڑھنا نہیں چاہتا۔"

موٹر کو ایک درخت کے نیچے لے گئے۔ انجن کھولا۔ پہیے دیکھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

آخر کافی دیر کی جستجو کے بعد جیرلڈ نے موٹر کے نیچے سے ایک بڑی ساری ٹہنی کھینچی جو پھنسی ہوئی تھی۔ اب کار خوب تیز چل رہی تھی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اسے سیر و سیاحت کا خبط ہے۔

"اگر میں کینیڈا میں رہنے لگوں تو وہ چند کھیت گزارے کے لئے کافی ہیں لیکن میرے پاؤں میں چکر ہے۔ ایک دو سال ملازمت کرتا ہوں پھر اپنا صندوق پکڑ کر نکل جاتا ہوں۔ بعض اوقات تو بے حد معمولی کام کرنے پڑتے ہیں۔ پچھلے سال میں بیس بیس گھنٹے فائلوں پر مغز مارا کرتا تھا۔ اس سے پہلے ایک چھوٹی سی دکان میں خزانچی تھا۔ سیر سپاٹا میرے خون میں ہے۔ مجھے کوئی چار دیواری میں بند نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوق تمہیں بھی ہے۔"

میں نے اسے اپنی سیروں کے قصے سنائے۔ بچپن کی سیریں۔ لڑکپن کی سیاحتیں۔ جنگ کے دنوں کے سفر۔ ذرا سی دیر میں ہم دوست بن گئے۔

"جہاں بھی گیا ہر جگہ مہربان اور پُرشفقت لوگ ملے۔ میں کسی کے لئے کچھ نہ کر سکا لیکن دوسروں سے مجھے ہمیشہ ہمدردی ملی۔ خلوص ملا۔ ہر جگہ میں نے وہ عظیم انسانی برادری دیکھی جس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔"

میں اس کے صندوق کو بار بار دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمہیں اپنی برساتی سے نفرت کیوں ہو گئی؟"

"برسوں تک یہ اچھی بھلی تھی۔ پھر کسی نے بغیر پوچھے اسے دھلوا دیا۔ اب یہ بالکل نئی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میرے صندوق اکثر کھوئے جاتے ہیں۔ نیا خریدتے

ہوتے مجھے بھی بڑا افسوس ہوتا ہے لیکن صندوقوں اور بہ سائبنوں سے سیاحت کا کیا تعلق؟ یہ جذبہ یہاں ہوتا ہے"۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ دھند چھا گئی۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔

ایک موڑ پر بادل پھٹ گئے۔ سورج نکل آیا۔ تیز شعاعوں سے سب کچھ جگمگانے لگا۔ فضا نکھری ہوئی تھی۔ ایسے خوشنما نظارے آئے کہ موٹر چلانا مشکل ہو گیا۔

کچھ اور آگے جا کر دھند سی چھانے لگی۔ بادل سمٹ آئے اور اندھیرا چھا گیا۔ اتنی تیزی سے بارش ہونے لگی کہ معلوم ہوتا تھا لندن تک ہوتی رہے گی۔

جیرلڈ بولا۔ "سیاح اکثر تنہا رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ انہیں سمجھتے ہیں۔ لیکن سیاحوں کو ایسے ایسے تجربے ہوتے ہیں جو دوسروں کے ذہن میں نہیں آسکتے۔ ایسے لمحے آتے ہیں جب یہ ساری دنیا ان کی ہوتی ہے۔ یہ پراسرار رنگین دنیا جو اتنی دلفریب ہے جو سدا جوان رہتی ہے۔ پھر سفر ختم ہو جاتا ہے اور ایسا دقفہ آتا ہے جس میں تاریکیاں عود کر آتی ہیں سب کچھ ساکن ہو جاتا ہے۔ ایک دلدوز تنہائی روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدم بوجھل ہو چکے ہیں۔ اور تمام راستے بند ہیں۔ لیکن ایک سہانی صبح کو کرنیں پھوٹتی ہیں اور دل ایک جانی پہچانی مسرت سے آشنا ہوتا ہے۔ ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے اور وہ جمود دیا دیر تک نہیں رہتا۔ یہ جگمگاتی شعاعیں اور یہ تاریک گھٹا جہاں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہاں ایک دوسرے کو نمایاں بھی کر دیتی ہیں"۔

دفعۃً بادل چھنٹ گئے۔ سورج نکلا۔ بل کھاتی ہوئی سڑک یوں چمکنے لگی کہ نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ آسمان پہ ایک رنگین قوس قزح چھا گئی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "ہم جہاں گردوں کو کوئی چار دیواری میں بند نہیں کر سکتا۔
ناآشنا راہیں ہماری منتظر ہیں۔ موقعہ پاتے ہی ہم پھر چل کھڑے ہوں گے۔ میرے
دوست تمہاری برساتی پر نئے نئے نشان ہوں گے۔ جن سے نئی یادیں وابستہ
ہوں گی۔ دلآویز اور سہانی یادیں۔ یہ ایک تاریک اور جامد وقفہ ہے، لیکن یہ
عارضی ہے۔"

میری لائبریری کے سلسلۂ تاریخ و سوانح پر دیگر کتب

ابوبکر صدیق اکبرؓ	محمد حسین ہیکل	مترجم: محمد احمد پانی پتی
عمر فاروق اعظمؓ	〃	مترجم حبیب اشعر دہلوی
دس بڑے مسلمان	محمد اسماعیل پانی پتی	
الہارون	عمر ابو النصر	مترجم: محمد احمد پانی پتی
الحسینؓ	〃	〃 〃 〃
الزہراؓ	〃	〃 〃 〃
المامون	شبلی نعمانی	〃 〃 〃
ابوذر غفاریؓ	عبدالحمید جودہ السحار	مترجم: عبدالصمد صارم
امیر معاویہؓ	عبدالعزیز سید الاہل	〃 〃 〃
اٹھائیس بڑے آدمی	ڈیل کارنیگی	مترجم: جاوید شاہین
مانیں نہ مانیں	〃	
کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں	〃	مترجم ظفر عامر/جاوید شاہین
قلوپطرہ	آرتھر ویگل	مترجم ناظر حسین زیدی
رابعہ بصری	دواد السکاکینی	مترجم عبدالصمد صارم
عمر بن عبدالعزیزؒ	احمد زکی صفوت	〃 〃 〃
سلطانی محلوں کے راز	جمال پاشا الغزی، عبدالرزاق ملیح آبادی	
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	حکیم غلام حیدر سہیل	
الکمال (شاہ کمال کیتھلی)	خورشید بخاری ایم اے ایم او ایل	
عبداللہ بن عمرؓ	سلام اللہ صدیقی	
عبداللہ عباسؓ	〃	
دیدہ بینائے قوم محمد علی جناح	محمد سلیم ضیا	
ہوچی منہ	مجیب الرحمان شامی	
معلومات پاکستان	زاہد حسین انجم	
خسرو شیریں زباں	اقبال صلاح الدین	